چاند اور ستارے

یہ پُرمعنی کہانی ایک پروفیسر صاحب نے انگریزی زبان سے اخذ کرکے ہمیں عنایت کی ہے۔ وُہ تو کسرِ نفسی سے فرماتے ہیں کہ اِس پر صرف یہ لکھدیا جائے کہ ایک کالج کے پروفیسر کی ترجمہ نوستق۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اسے محض ترجمہ کہنا قابل مضمون نگار کی حق تلفی ہوگی۔ انگریزی مضمون نے پروفیسر صاحب کی سحر تاثیر طرزِ تحریر میں وُہ رُوپ نکالا ہے کہ فرنگی زادہ نظر آنے کی بجائے ہندی نژاد معلوم ہوتا ہے:۔

دُنیا کی پیدائش کا چوتھا دن جب ختم ہوا اور آفتاب عالمِ تنہائی میں اپنا پُورا جاہ وجلال دکھا کر غروب ہوگیا اور رُوئے زمین پر جس کو ابھی تک آبادی کا شرف نہیں حاصل ہوا تھا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ تو ایک اکیلا مگر خوبصورت ستارہ آسمان پر نمودار ہوا۔ اپنے نئے خلعتِ وجود میں حیرت اور خوشی کے ساتھ کانپتے ہوئے اُس نے اپنے چاروں طرف نظر جو دوڑائی تو دیکھا کہ نہ آسمان پر اُسکا کوئی ثانی ہے نہ زمین پر۔ لیکن بہت زیادہ زمانے تک وُہ اکیلا ۔ ابھی ایک پھر دُوسرا پھر تیسرا چمکیلا ہمچشم اُس سے آملا یہانتک کہ ایک گھنٹے میں سارا آسمان سیارات اور ثوابت سے جگمگا اُٹھا جن میں ایک عظیم الشان دُمدار ستارہ بھی تھا جو سمت الراس پر چمک رہا تھا۔

ان اجرام فلکی نے کچھ دیر تک اپنی حالت اور ایک دُوسرے کی حالت پر غور کی اور ان میں سے ہر ایک نے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا دِل میں خیال کیا کہ تمام عالم کا نُورانی مرکز میں ہی ہوں۔ اُنکو اپنی نسبت جو یہ مغالطہ واقع ہوا تھا وُہ رفع نہ ہوا اگرچہ سب کے سب اپنے

بیدار ہوئے اور آنکھیں کھول کر جب اُنہوں نے دیکھا کہ کل کی رات کی انجمن پھر جُوں تُوں موجود ہے تو دل میں بہت ہی خوش ہوئے - وُہ چھوٹی چمکیلی شاخ بھی پھر نظر آئی غربی پہاڑوں کے سلسلے پر نیچے کو جُھکی ہُوئی تھی - لیکن اگرچہ پہلی دفعہ سے اب کسی قدر زیادہ چمکیلی تھی وُہ پھر بھی جلد دامنِ افق میں غائب ہوگئی اور دُمدار ستارے کو سارے آسمان پر مغرورانہ ادا سے قابض چھوڑ گئی -

تیسری شام کو چاند قدر اور روشنی میں اس قدر بدیہی طور پر بڑھ گیا تھا اور پہلے دن کی نسبت آسمان میں اس قدر اَوج گرا تھا کہ اگرچہ وُہ اب بھی جلدی نظروں سے غائب ہوگیا مگر کہکشاں کی دونو جانب شروع سے اخیر تک مضمونِ گفتگو وہی تھا - یہاں تک کہ نو پیدا شدہ آدمی کو اُسکی پہلی میٹھی نیند سے جس میں وُہ پڑا بہشت میں سوتا تھا بس نسیم نے آکر جگایا اُس نے ستاروں کو آکر اطلاع دی کہ اب میدان خالی کرو آفتاب اپنے جاہ و جلال کے ساتھ آتا ہے اور دُنیا کی پیدائش کا پہلا سبت ایسے جاہ و جلال کے ساتھ لاتا ہے جسکے دیکھنے کو دُنیا کے انحطاط کے زمانے میں لوگوں کی آنکھیں ترسینگی - اگلی رات کو چاند نے اپنی کُرسی اَور بھی بُلند کر دی اور پہلے سے کہیں زیادہ چمکدار دکھائی دیا یہانتک کہ اُسکے آس پاس جتنے چھوٹے ستارے تھے اُنکو سب نے دیکھا کہ زرد پڑ گئے تھے اور بعض تو نظر بھی نہ آتے تھے - چُونکہ اُنکے رُفقا اُس کی توجیہ معقول نہ کر سکتے تھے اُنہوں نے قیاس کیا اور ایسا قیاس اُنہیں کرنا ہی چاہیے تھا کہ چاند کی روشنی جو بڑھ رہی ہے تو اُنہی کی روشنی سے - گویا چاند ایک ایک کرکے سب کو نگل رہا ہے اور یہ خوف تمام میں عام طور پر پھیل گیا کہ چاند جُوں جُوں بڑھتا جائیگا ہم سب کو نگلتا چلا جائیگا یہانتک کہ ہم میں کا ایک فرد بھی باقی نہ رہیگا -

اگرچہ چاند ہر شب اسی طرح بڑھتا اور روز بروز خوبصورت ہوتا جاتا تھا مگر پھر بھی وُہ اپنا انکسار و تواضع نہ چھوڑتا تھا یہانتک کہ اُسکا ہلال بڑھتے بڑھتے شکل بدر میں آگیا - تب کسی قدر

ہم چشموں کے قد و قامت میں اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (وجہ یہ کہ اپنی ذات کا علم چاہے آسمان پر ہو یا زمین پر سب سے اخیر میں حاصل ہوتا ہے) تاوقتیکہ انہوں نے جھانک کر سمندر کے آئینے میں اپنی اپنی صورتیں دیکھ نہ لیں جو ٹھیک ٹھیک اُنکا خط و خال اور محل و مقام دکھاتا تھا۔ توجہ کے ساتھ اس آئینے میں اپنا ذاتی خط و خال دیکھتے دیکھتے سب کو بتدریج عاجزی اور انکسار کا سبق یاد ہو گیا۔ نہ ہوا تو ایک دُمدار ستارے کو جو اپنی آفتاب تک پھیلی ہوئی چمکیلی دُم پر ایسا پھُولا ہوا تھا کہ اب بھی اپنے آپ کو آسمان کا بادشاہ ہی خیال کرتا تھا۔

جب وہ اس طرح اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھ رہے تھے اُن کی توجہ ایک بار ایک نورانی ناخن نما مقیش کے تار کی طرف منعطف ہوئی جو تھوڑی دیر تک اُفق سے کچھ اُوپر چمک کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ چاند تھا پہلی تاریخ کا ننھا چاند۔ خوف زدہ ازاسے اس نے اس چمکیلے گرزہ پر نظر کی اور جب اُس نے دل میں خیال کیا کہ میرا لاغر اور بے کینڈے جسم نکے کامل تناسب اعضا کے مقابل میں کیسا ذلیل اور بے حقیقت ہے تو سمندر کے دوستانہ دامن میں اُنکی نظروں سے اپنا مُنہ چھپا لینا اُسے ایک خوشی کی بات معلوم ہوئی۔ جب وُہ نظروں سے غائب ہو گیا تو ستارے ایکدوسرے کو متفحصانہ حیرت سے دیکھنے لگے گویا زبانِ حال سے یہ کہتے تھے کہ سبحان اللہ کیا صُورت تھی۔ صدقے اس صُورت کے! اور وُہ پھر جلد آزادی کے ساتھ اُس کے باب میں گفتگو کرنے لگے۔ لیکن جس حال میں کہ وُہ اسکی خمیدہ پُشت اور اُسکی نادیدہ اداکی ہنسی اڑا رہے تھے یکایک نہیں معلوم ہوا کہ خود اُن کی روشنی بھی مدّھم پڑتی جاتی ہے۔ پُورب طرف پو پھٹنے لگی اور بڑی حیرت کے ساتھ سب نے دیکھا کہ مدّھم پڑتے پڑتے آنکھوں سے غائب ہوئے جاتے ہیں بلکہ انہیں ڈر ہوا کہیں سرے سے بالکل غائب ہی نہ ہو جائیں۔

یہ خواب عدم میں پڑے ہُوئے اجرام فلکی دُوسری شام کو آنکھیں ملتے ہُوئے بتدریج

دیکھ لیا تو پھر تو یہ نامبارک نقش اُس کے دل پر آئینے کی طرح روشن ہو گیا۔ موسم شور انگیز تھا۔ ہوا میں یکایک تیزی پیدا ہوئی۔ اور موجیں اُٹھ کر مُنہ میں جھاگ بھر لائیں۔ شاید جوار پہلے ہی پہل چاند کی ہمدردی کو اُٹھا تھا اور جو بات پہلے کبھی نہ ہوئی تھی وُہ یہ تھی کہ ایک خوفناک طوفان نے بجلی سے آسمان کو دہلا دیا اور مینہ سے زمین کو نہلا دیا۔ چاند نہایت گھنگھور بجلیوں والی گھٹا کے جھرمٹ میں آگیا۔ حالت اضطراب میں جس سے چاند کی ذلت ڈھلکی رہی۔ اُسکے خوش ہونے والے حریف بھی نہیں معلوم کہاں جا چھُپے۔

دوسری شام ہوا اور اسی طرح بعد میں بھی کئی شاموں تک چاند دیر کو نکلتا رہا اور روز بروز دھندلا ہی ہوتا جاتا تھا۔ اور اُدھر حال یہ تھا کہ ہر موقع پر وُہ چھوٹے ستارے جو اسکے آگے پہلے غائب ہو گئے تھے زیادہ چمکتے آتے تھے وہ اُس کے زوال پذیر عزت و جلال اور نقصان پذیر حُسن و جمال کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے جامے میں پھُولے نہ سماتے تھے۔ کامیابی نے چاند کو خود بین اور مغرور بنا دیا تھا مصیبت نے اُس کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور عجز و انکسار کی نرم نرم دلفریبیوں سے پھر وُہ جگہ دوبارہ حاصل کی جو غرور کے ہاتھوں چھن گئی تھی۔ کیونکہ جبکہ اُس کی بدری شکل گھٹ کر مہینہ کے آخر میں خمیدہ ناخن کی شکل رہ گئی تو سارے آسمان والوں کی نظر میں سب سے زیادہ ڈھنگ کا نظر آیا۔

آخر کار ایک رات ایسی بھی آئی جبکہ چاند کا کہیں پتا نہ تھا۔ وُہ دار ستارہ بھی کسی غیر معلوم حصے میں چلا گیا تھا۔ اُس شب کو ساری رات آسمان پر سناٹا رہا۔ مہینے کے انقلاب پر اطمینان کے ساتھ غور کرتے ہوئے ستاروں نے غروب آفتاب سے طلوع فجر تک اپنا سفر طے کیا۔ اور تجربے سے عقل حاصل کر کے متواضع اور راضی برضا رہے اور ہر ایک اپنی تقدیر پر شاکر تھا۔ چمکی ہوئی تھی جب بھی اور نہ چمکی ہوئی تھی جب بھی۔

دوسری شام کو چاند نئے ہلال کی صورت مطلع مغرب سے پھر نمودار ہوا جس سے سب کو

وُہ اپنی فوقیت پر نازاں نظر آیا۔ اُس کی شعاعیں بھی ایسی تاباں و درخشاں ہو چلیں کہ بہت ہی کم ستارے اُس کے جلوے کی تاب لا سکتے تھے۔ مدار ستارہ بھی اُس کے آگے پھیکا پڑ گیا۔ اپنے کمال کی شب کو وُہ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ وسطِ آسمان میں کرسیِ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اور زمین کو دِن کا سا ایک خاص نازک جسمی خلعت عنایت کیا۔ آئینۂ بحر میں جو اُس نے اپنی صورت دیکھی تو اپنے عالمِ حسن پر گھنٹوں محوِ حیرت رہا۔ کچھ ستارے جو اب بھی یکجائی سے آسمان پر چمکے جاتے تھے اپنی زیادہ نیکیوں کی طرف ہیں یا سمجھے کہ ایک محفوظ فاصلے سے اُس کے سب پر غالب آ جانے والے حسنِ تاباں کا نظارہ کریں۔

چاند بھی خود اس خیال سے کچھ کم متحیر نہ تھا کہ دیکھو تو دیکھتے دیکھتے قد اور روشنی میں کس قدر بڑھ گیا اور نہیں معلوم ابھی اور کہاں تک بڑھ سکیگا۔ اُس کی خود بینی نے اُسے یہ سمجھایا کہ اگرچہ شکل تو میری پوری ہو چکی ہے لیکن قد ابھی اور بڑھیگا۔ کیا میں بڑھتے بڑھتے اِتنا بڑا نہیں ہو جا سکتا کہ آدم اور اُس کی ہم خوابہ حوا باغِ عدن کے کسی گوشے سے جھانک کر دیکھیں تو انہیں ابھی آسمان میں چاند ہی چاند نظر آئے؟ لیکن وُہ ابھی دل خوش کن خیال میں مست تھا کہ یکایک اُس پر ایک سیاہ چھائیں نمودار ہوئی جو ایک کنارے سے بڑھتے بڑھتے بیچ میں آ گئی اور پھر دوسرے کنارے تک چھا گئی جس سے اُسکا سارا چہرہ گہنا گیا اور لوحِ آسمان پر ایک بدنما داغ سے زیادہ اُسکا رتبہ نہ رہا۔ اِس مصیبت کو آتے دیکھ کر ستارے اپنے اپنے گوشے سے چاند کی ذلت کا تماشا دیکھنے کو نکل آئے۔ لیکن اُن کی خوشی اور چاند کی ذلت کچھ بہت دیر تک نہ رہی۔ چھائیں جس طرح بڑھی تھی اُسی طرح رفتہ رفتہ گھٹ بھی گئی اور اب چاند مقابلے سے زیادہ خوبصورت اور چمکدار نظر آنے لگا۔

دوسرا دن گذر گیا اور دوسری رات آئی اور اپنے معمول کے مطابق چاند پھر نکلا مگر کسی قدر دیر کو۔ جب کہ وُہ زمین کے اوپر چل رہا تھا اُس وقت بھی یہ خوف اُس کے دل میں گذرا تھا کہ میری چمک جتنی کل تھی اِتنی آج نہیں مگر جب اُس نے اپنا چہرہ دریا میں

کشمیر جنّت نظیر

ڈل

ایک مدت کے بعد ہمارے کرمفرما چودہری خوشی محمد صاحب بی۔ اے متخلّص بہ ناظر نزہت گاہ کشمیر سے مضمون بہ نظر عنایت کرتے ہیں۔ اور اپنے مضمون کی تمہید کے طور پر ذیل کے فقرات لکھتے ہیں:۔

ایک شریف زادی کو مضمون نگاری و انشا پردازی کا بہت شوق تھا۔ اور ایک لڑکیوں کے اخبار میں انکے مضامین شائع ہوتے تھے۔ جب شادی ہوئی تو میاں نے صاف کہدیا کہ بیوی! اب تم ہماری ہو چکیں اور پبلک کو تمہارے دماغ سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ہرچند کہ ہم نے بڑے میاں سے کوئی ایسا معاہدہ نہیں کیا اور نہ وُہ مزاج کے ایسے سخت گیر ہیں مگر پھر بھی خیال رہتا ہے کہ لٹریچر کی دلاویزیاں کام کی بادج نہوں۔ کشمیر کے مناظر دیکھ کر ممکن نہ تھا کہ ناظر کے دل میں گدگدی پیدا نہ ہو۔ صدہا قدرتی نظاروں کے آئینہ قلبپر نوٹ لیے۔ مگر انکو صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کا موقعہ نہ ملا۔ اگر عدیم الفرصتی مانع نہ ہوتی تو آپکے مخزن کو گلشن بنادیتا۔ اب آپ کے شکووں سے تنگ آ کر ایک سیر کی کیفیت لکھتا ہوں۔

سری نگر کے قریب ایک جھیل ہے جسکو ڈل کہتے ہیں۔ اس سبز پری کے واسطے ایسے ثقیل لفظ کا استعمال مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر مجبوری ہے۔ دُور دُور سے سیاح اسکے دیدار کے واسطے آتے ہیں۔ اور پروانوں کی طرح اس شمع کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ خُدا جانے کب سے یہ پری اس شیشہ میں اُتری ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ قدیم زمانہ میں تمام سرزمین کشمیر ایک جھیل تھی۔ رفتہ رفتہ اس پانی نے نکاس پیدا کرلیا اور قُدرت کے انجنیر نے دریائے جہلم کا راستہ صاف کر کے اس پانی کو سمندر سے جا ملایا۔ اور ڈل اور وُلر وغیرہ جو مقامات نشیب میں تھے اُن میں پانی کا ذخیرہ بدستور موجود رہا۔ ڈل پہاڑ کی آغوش میں جاگزین ہے۔ شاہان سلف نے اُسکے نظارے کے واسطے مختلف موقعوں پر دامن کوہ

حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی - فوراً آسمان کے ہر حصے سے اُسکو سبھوں نے اِس پھر بھی اُٹھنے پر دل سے مبارکباد دی - کہتے ہیں کہ ٹھیک اُسوقت جب کہ وُہ غروب ہو رہا تھا اور جب کہ اُس کی کمان دھندلے ہیگنی اُفق پر ابھی لٹک ہی رہی تھی - ایک فرشتہ نمودار ہوا جو اُس کے دونوں سروں کے بیچ میں خاص ادا سے کھڑا تھا - جب اُس نے مڑکر دیکھا تو اُس کی آنکھ جلدی سے اِس سرے سے اُس سرے تک تمام دُنیا پر پھر گئی - آفتاب تو نہیں معلوم کہاں کتنا پیچھے ڈوبا پڑا تھا - چاند اُس کے زیر قدم ہی تھا - نیچے زمین جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی فرش زمردین بچھا رہی تھی اُوپر آسمان برج برج میں چراغاں کر رہا تھا - وُہ آن کی آن ٹھہر گیا اور پھر اُس زبان میں جس میں صبح کے ستاروں نے مل کر گایا تھا اور بندگان خدا نے خوشی کے نعرے مارے تھے اِس طرح زمزمہ سنج حمد و ثنا ہُوا -

"اے صانع مطلق - اے حکیم برحق تیری صنعتیں بڑی اور حیرت میں ڈالنے والی ہیں جس چیز کو دیکھتا ہُوں تیری حکمت اُس سے آشکارا ہے" اتنا کہکر وُہ تو خاموش ہوگیا مگر وُہ زمزمہ آسمان کے گنبد میں اُس وقت سے آج تک برابر گونج رہا ہے +

شیکسپیر اپنے محبوب کی تعریف میں کسی قسم کی ایزاد کے ناممکن ہونے کو یُوں بیان کرتا ہے:- جیسا کہ کُندن پر ملمع چڑھانا - گُلِ موتیا پر سفیدی پھیرنا - چنبیلی پر عطر پاشی کرنا - برف کو اور شفاف بنانا - قوسِ قزح کے رنگوں میں کسی اور رنگ کی زیادتی کی کوشش - یا جلوہ گاہ قدرت کی آرائش کو معمولی شمع سے چمکانا - سب ایسے کام ہیں کہ انہیں فعلِ عبث کے سوا اور کوئی خطاب نہیں دیا جاسکتا - اسی طرح میرے محبوب کی خوبصورتی سجاوٹ کی ضرورت سے مستغنی ہے اور اس کے حُسن کو زیادہ کرنے کی سعی فعلِ عبث ہے +

ازی میں کہیں زیادہ ہیں۔

ناظر عشق پیچاں ہوا دھر اور گل خنداں ہو ادھر   یہ ہے منصور تو وہ دار و رسن پانی میں

شمیم۔ سبحان اللہ۔ کیا تشبیہ ہے۔

ماعز۔ یہ کیا تشبیہ ہے اس سے اچھی تشبیہ لیجئے۔

ہار پھولوں کا گلے میں ہے تو سر پر سہرا   بن کے بیٹھے ہیں یہ دلہا و دلہن پانی میں

فہیم۔ ماشاء اللہ خوب کہا مگر دلہا و دلہن میں حرفِ عطف غیر موزون ہے۔ ہاں ناظر صاحب اب آپ فرمایئے۔

ناظر آب دل حسن و لطافت میں ہے گر آب حیات   صورت خضر ہے ہر شاخ و سمن پانی میں

سبز شاخیں ہیں مگر مصحفِ قدرت کی سطور   حاشیہ انکا ہوا میں ہے۔ متن پانی میں

فہیم۔ کنول کی طرف بھی توجہ ہو۔ اللہ اکبر اس کنول کے کھیت میں پھولوں کی کیا بہار ہے

ناظر اک طرف پھول کنول کا ہے سجیلا بانکا   مسکراتا ہے کھڑا غنچہ دہن پانی میں

نیلگوں آب پہ دیکھو یہ کنول کی سرخی   حسن کی آگ ہے کیا شعلہ فگن پانی میں

اسکے پتوں پہ ہے کیا قطرۂ باراں کی بہار   طاسِ سیمیں میں ہیں یہ دُرِ عدن پانی میں

ماعز۔ یہ تشبیہ ناقص ہے۔

مصاعد۔ میں عرض کرتا ہوں۔ ع چن رکھے ہیں یہ بساطی نے بٹن پانی میں

فہیم۔ سبحان اللہ۔ کیا جودت ہے۔ آپ کی شاعری تو زمانہ کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔ ہاں میاں ناظر۔ آفتاب کی شعاعیں پانی میں کیا لطف دکھا رہی ہیں۔ انکی شان میں بھی کچھ ارشاد ہو۔

بجلی رہتی نہیں جس طرح کسی شوخ کی آنکھ   کھیلتی پھرتی ہے سورج کی کرن پانی میں

آتش شوق پہ دیتی ہے یہ ڈل تیل کا کام   بھڑک اٹھتے ہیں معاً اہل سخن پانی میں

میں مکانات تعمیر کئے ہیں۔ ایک طرف قلعۂ کوہ پر ایک نہایت پرانا مندر ہے جو تختِ سلیمان کے نام سے موسوم ہے۔ دوسری طرف قلعہ ہری پربت ہے جو اکبری عہد کی یادگار ہے۔ دامنِ کوہ میں نشاط باغ و شالامار وغیرہ عجیب دلفریب نزہت گاہیں ہیں۔ یہاں جہانگیر کے سامانِ عیش و نشاط جشنِ جمشیدی کو مات کرتے تھے۔ نورجہاں کی رنگین طبیعت اپنی بہار دکھاتی تھی۔ اور عجیب راز و نیاز کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔

اتوار کے دن ہم چند دوست ڈل کی سیر کو گئے۔ اس چار یاری میں ناظر۔ حاضر۔ فہیم۔ شمیم شریک تھے۔ ناظر اچھے خاصے شاعر ہیں اور حاضر بقول شخصے ماعر ہیں۔ فہیم ذکی الطبع اور سخن فہم ہیں۔ اور میاں شمیم موٹے تازے اور الفربہ خواہ مخواہ معتبر کے مصداق ہیں۔ فہم سخن سے انکا دماغ عاری ہے مگر یاروں کے یار ہیں اور موقعہ بے موقعہ نہایت مستعدی سے داد دیتے ہیں۔ ڈل میں داخل ہوتے ہی ناظر کی طبیعت اس عجیب نظر کے دیکھنے سے وجد میں آگئی اور یہ مطلع پڑھا۔

اللہ اللہ ہے کیا حسن چمن پانی میں
گل و گلزار ہے اور سرو و سمن پانی میں

فہیم۔ سبحان اللہ۔ واقعی ایسا نظارہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ شفاف پانی کے نیچے سبز پودے اور شاخیں ایسی پرا جمائے کھڑی ہیں کہ عالمِ آب ایک طلسم کا عالم نظر آتا ہے۔

حاضر۔ ایسا تماشا ہے کہ ع دل میں آتا ہے ابھی کود پڑن پانی میں۔

فہیم۔ سبحان اللہ۔ پڑن کی ایک ہی کہی۔ ہاں ناظر صاحب! دیکھو تو ادھر نشاط باغ کے سرو و سمن اور ادھر قلعہ کوہ کا عکس پانی میں کیا لطف دے رہا ہے۔

ناظر۔ کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے ہیں
کوہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں

تو دہ سیم ہے یہ ڈل کے خزانہ میں نہاں
برفِ کہسار ہے یا عکس فگن پانی میں

قلۂ کوہ پہ ہے تختِ سلیماں قائم
اس طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں

فہیم۔ ان بیلوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ زلفِ جاناں اور شبِ ہجراں سے بھی ماشاءاللہ

جو دل دکھا رہا ہے مزہ ہر گھڑی مجھے ‏ آنکھوں سے سو برس میں دکھایا نہ جائیگا

قوتِ بصارت ہی وہ قوت ہے جو تصوّر کو معہ اسکے مفہوم کے ہمارے پیشِ نظر کرتی ہے اور اس لئے "نشاطِ تصوّر" کے عنوان سے ہماری مراد وہ نشاط ہے جو ہم کو کسی چیز کے دیکھنے یا اُس کے مفہوم کو بذریعہ مرقع یا تصویر یا نقشے کے ذہن میں لانے سے حاصل ہو۔ ہم بلا شبہہ کوئی نظارہ بجز دیکھنے کے اپنے تصوّر میں نہیں لا سکتے لیکن تاہم اگر ایک دفعہ ہماری اُس سے روشناسی ہو جائے تو ہمیں اُس کا نقشہ دل میں قائم رکھنے یا اُسکے تغیّر و تبدّل میں چنداں دقّت اُٹھانی نہیں پڑتی۔ اور بآسانی ہم اپنے منظورِ نظر کو ان تمام دلفریبیوں اور خوبصورتیوں سے مزیّن کر سکتے ہیں جن سے کہ تصوّر میں لطف آ سکے۔ چنانچہ یہ اسی صلاحیت کا فرحت خیز اثر ہے کہ انسان ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ نظاروں اور دلفریب قدرتی منظروں کی دلچسپ صورتوں اور موہنی مورتوں کو اپنے تصوّر میں لا سکتا ہے +

اگر نشاطِ تصوّر" کے کامل مفہوم کو مدّنظر رکھیں تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ قوتِ تصوّر نہ تو دیگر حواس کی طرح مغالطہ میں ڈالنے والی ہے اور نہ ہی فہمید کی طرح سہو و سقم سے مبرّا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ تصوّرات میں وہ بلا کی دلچسپی ہے کہ اسکے ایک ایک کرشمے کی داد دینے میں انسان گھنٹوں محو رہتا ہے۔ ایک خوش آئند اُمید ہرگز حصولِ مدعا سے کم دل خوش کُن نہیں ہوتی۔ اسی قوت کے زور سے پند سودمند پڑھنے میں بے لطف اور خشک اور داستانِ امیر حمزہ دلفریب اور مرغوبِ طبع ہوتی ہے۔ اسی کی بدولت "ہومر" کے جذبات چاہے کسی رنگ میں ہوں ہمیشہ پڑھنے والے پر وہ مسرت انگیز اثر کرتے ہیں جو "افلاطون" کی دقیق تصانیف سے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ علمی مسائل خواہ کیسے ہی آسان کیوں نہ ہوں اُنکے کامل طور پر سمجھنے کے لئے پہروں سر دھننا پڑتا ہے لیکن "نشاطِ تصوّر" بغیر غور و خوض کے صرف خیال کرنے سے انسان کا دل بہلانے کے لئے حاضر ہے۔ آنکھ بند کی اور نظارہ موجود۔ بغیر ناظر کے خیال و توجہ کے خود بخود صفحۂ دل پر نقش و نگار ہو جاتے ہیں اور گو ہمیں اِس منظر کی اصلیت اور بناوٹ کا کما حقہ

نشاطِ تصوّر

انگریزی مضمون نویسی میں آیڈیسن نثر کے بے عدیل اُستادوں میں گذرا ہی۔ ہمارے دوست منشی محمد فضل الٰہی صاحب جو کیمبرج یونیورسٹی میں بغرض تعلیم گئے ہوئے ہیں وہاں سے مندرجۂ ذیل نمونہ آیڈیسن کے ایک مضمون کے کسی حصّہ کا ارسال فرماتے ہیں۔ منشی صاحب موصوف نے تصوّر یہاں غالباً تخیل کے معنوں میں استعمال کیا ہی جسے انگریزی میں "ایمجی نیشن" کہتے ہیں۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہماری قوّتِ بصارت ہمارے اور حواس سے زیادہ کامل اور فرحت انگیز ہے۔ یہی قوّت ہی جس سے رنگارنگ کے جلوے دماغ کے راستہ دل میں اُترتے ہیں اور انسان کا دل انواع واقسام کے خیالات اور معلومات سے معمور ہوجاتا ہے۔ جس چیز پر ہماری نظر جا پڑے خواہ وہ ابھی دُور ہی ہو پھر بھی جہاں آنکھ سے وُہ دوچار ہُوئی ہیں اُس پر گفت وشنید کا موقع حاصل ہوجاتا ہے۔ سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ اِسی قوّت کے ذریعہ سے انسان پہروں بغیر تھکاوٹ کے کسی چیز کی دلبستگی سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں قُوّتِ لامسہ بھی رنگ کے سوا باقی سب وضع قطع جو آنکھوں سے دکھائی دیتی ہی۔ بتاسکتی ہی لیکن ساتھ ہی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ قوت علاوہ محدود ہونے کے اُس صفائی سے تعداد۔ فاصلہ اور حجم پر حاوی نہیں جو باصرہ کا خاصہ ہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوّت باصرہ ایسے نقصوں کو رفع کرنیکے لئے وضع کی گئی ہی اور اس لئے اسے ایک نازک اور زیادہ وسیع قسم کی قوتِ لامسہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کی وسعت کے کیا کہنے ہیں۔ بڑے سے بڑے عالیشان منظر اس میں سماجاتے ہیں۔ اور جو کچھ آنکھیں دکھاتی ہیں۔ وہاں اور حواس کی رسائی نہیں۔ مگر انسان میں ایک اور خاصیّت اس سے بھی عجیب ہی۔ جسے تصور کہتے ہیں۔ اُس کے ذریعے سے اِنسان دنیا کے دُور دراز مقامات کو خیال میں لاسکتا ہی۔ سینکڑوں کوس پر بیٹھے ہُوئے احباب کی کیفیت کا اندازہ کرسکتا ہی۔ اور ذرا غور کرنے سے وہ کچھ دیکھتا ہی۔ کہ آنکھوں کے فلک نے بھی نہ دیکھا ہو۔ ۵

مشاغل کی طرح تگ و دو کا محتاج ہے - اس میں پڑنے سے دل محوِ غفلت و سستی نہیں ہوتا نہ فساد انگیز باتوں کی طرف راغب ہوتا ہے - بلکہ یہ قوائے ذہنی کے لئے ایک نہائیت پسندیدہ جولانگاہ ہے -

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "نشاطِ تصور" صحت کے لئے بہ نسبت تحقیق و تدقیق کے جس میں گہری خیالات میں ڈوبنے اور دماغ پر حد درجہ کا زور ڈالنے سے گریز نہیں - زیادہ مفید اور فرحت بخش ہے - نشاط انگیز منظر خواہ صفحہ قدرت پر ہوں یا صفحہ قرطاس پر - رنگ و روغن والی تصویروں میں ہوں - یا لفظی مرقعوں میں دل و دماغ پر عجب فرحت افزا اثر رکھتی ہیں - اور علاوہ غم و الم دور کرنے کے انسان کی طبیعت کو شگفتہ اور بحال کر دیتے ہیں - اسی بنا پر بیکن نے اپنے مضمون متعلقہ صحت میں خصوصیت سے یہ تحریک کی ہے کہ "دن بھر میں کوئی نہ کوئی وقت نظم یا تواریخ پڑھنے یا صحیفۂ قدرت کے مطالعہ کے لئے نکالنا چاہئے اور اسوقت طویل مباحثوں اور بال کی کھال نکالنے سے پرہیز کرنا چاہئے" +

ایک نابینا لڑکا - "او جانیوالو! کہو تو روشنی کیا چیز ہے - جسکو میں نے کبھی نہیں دیکھا - بصارت میں کیا خوبیاں ہیں؟ مجھ غریب نابینا کو کچھ تو بتاؤ - تم اپنے مشاہدات کے عجائبات کا تذکرہ کرتے ہو - تم سورج کی درخشندگی بیان کرتے ہو - میں اس کی گرمی تو محسوس کرتا ہوں - لیکن حیران ہوں کہ وہ کس طرح دن اور رات کی تغیرات پیدا کرتا ہے - بھائیو میں تو اپنے دن اور رات کو سونے اور کھیلنے سے وضع کرتا ہوں - اور میرے لئے جب کبھی میں بیدار ہوں - دن ہے"۔

"میں اکثر سرد آہوں میں تم کو اپنے لاعلاج درد پر ترانۂ غم گاتے ہوئے سنتا ہوں - لیکن یقیناً میں صبر سے ایسے نقصان کو برداشت کر سکتا ہوں - جسکی کیفیت میں نہیں جان سکتا"۔

"میری قلبی مسرت کو اس ارمان سے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا - برباد مت کرو - گو میں ایک نابینا لڑکا ہوں - لیکن جس وقت میں اپنے لطفِ موفور میں ترانہ سنج ہوتا ہوں - میں کسی بادشاہ سے کم نہیں"۔

علم نہ ہو لیکن بہیئت مجموعی اسے کسی نہ کسی نام سے نامزد کر کے اسکی خوبیوں اور دلبستگیوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

یہ قرین قیاس ہے کہ ایک شایستہ شخص بہ نسبت ایک جاہل آدمی کے تصویر سے زیادہ متاثر ہو اور بوجہ اپنی وسیع معلومات کے اسے زیادہ فرحت اور لطف اُٹھانے کا موقع ہو۔ مگر تصویر کی نشاط بقدر مراتب ہر ایک کے لئے موجود ہے۔ البتہ شایستہ آدمی کے لئے زیادہ خوشیاں ہیں۔ وہ تصویر سے تصور کی طفیل گفتگو کر سکتا ہے اور مرقع اسکے لئے ہرگز ایک بار نشاط سے کم نہیں۔ بیان یعنی لفظی تصاویر سے وہ ایک پُراسرار تازگی محسوس کرتا ہے اور بسا اوقات وادیوں۔ مرغزاروں اور آبشاروں کو دیکھتے ہوئے۔ وہ صانع حقیقی کے ہاتھ کی جھلک دیکھتا ہے۔ ہر چیز اُسکے لئے ایک دل خوش کُن مطالعہ ہے اور بنجر سے بنجر دشت وصحرا اس کے لئے جلوہ گاہِ فطرت ہیں۔ وہ اس وسیع دُنیا کو ایک اور ہی نظر سے دیکھتا ہے اور اُس کو اوروں سے کچھ جداگانہ ہی رنگ اس میں نظر آتا ہے۔ وہ صناع ازلی کی بے انتہا صفتوں پر غور کرتا ہے اور آخر کار اُن بے تعداد خوبیوں اور دلفریبیوں سے مطلع ہو جاتا ہے جو مخلوقات کے بہت سے حصہ سے پوشیدہ ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ اُن لوگوں کی تعداد بہت ہی کم رہی ہے جو باوجود وقت فرصت اور آسودگی کے بے آزار زندگی بسر کرنا جانتے ہوں یا جنہیں پاکیزہ حظوظ سے دلبستگی ہو۔ یا جو ایسی تفریح کی طرف میلان خاطر رکھتے ہوں جس میں کسی نیکی یا بھلائی کو تفریح کی خاطر قربان نہ کرنا پڑے۔ بالعموم دُنیاوی مشاغل سے فراغت حاصل کرتے ہی انسان مشتاق و متلاشی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی تفریح اختیار کرے جو کسل و تھکاوٹ رفع کر کے باعث آرام و مسرت ہو۔ اِس لئے ہر ایک فرد بشر کو لازم ہے کہ اپنے تفریح کے دائرہ کو جہانتک ہو سکے وسیع کرے تاکہ دُنیاوی دھندوں کے بعد وہ تفریح سے محظوظ بھی ہو سکے اور کسی کو حرف گیری کا بھی موقع نہ ملے۔ اگر ہم تصور کو اپنا دائرہ تفریح قرار دیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اُس کی سیر کے لئے نہ تو کوئی روک ہے اور نہ یہ ہمارے دیگر

تقریباً سب رشتہ دار تہ تیغ ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے دشمن اُنکو تلاش کر رہے تھے ۔ عبدالرحمٰن اپنی جان بچاتا دریائے فرات کے کنارے پہنچا۔ ایک دن اپنے خیمہ میں بیٹھا تھا اور اُسکا بچہ باہر کھیل رہا تھا۔ عبدالرحمٰن آئندہ زندگی بسر کرنے کی تدبیروں میں غرق تھا۔ کہ یکایک اُسکا بچہ خیمے میں سہما ہوا آیا ۔ اور اُس کے سارے خیالات درہم برہم ہو گئے ۔ قریب کے گاؤں سے شور و غل کی آوازیں کان میں پہنچیں اور عبدالرحمٰن کا ماتھا ٹھنکا۔ باہر نکلکر دیکھا تو سامنے عباسیوں کا سیاہ علم نظر آیا۔ سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ دشمنوں نے یہاں بھی نہ چھوڑا ۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ مگر سوچا کہ اب دیر نہ لگانی چاہیئے ورنہ جان کے لالے پڑ جائینگے۔ بچے کو بغل میں مار فوراً دریا کیطرف بھاگا۔ اُسکا ایک بھائی بھی ساتھ تھا ۔ وُہ اور اُسکا وفادار غلام بدر بھی اُسکے پیچھے ہو لئے۔ اِتنے میں دشمن بھی آن پہنچے ۔ چلّائے کہ ٹھہرو کیوں بھاگتے ہو ہم تمہارے ہی بھلے کو آئے ہیں ۔ عبدالرحمٰن کا بھائی جو کچھ بیمار ہونے کی وجہ سے اور کچھ ان شقیوں کے جھوٹے وعدہ پر یقین لاکر ذرا ٹھٹکا اور مُڑکر دیکھا ۔ مُڑکے دیکھنا تھا کہ سر تن سے جُدا۔ یہ دیکھ کر عبدالرحمٰن اور بدر جو اسوقت تک دریا میں کُود چکے تھے اپنی تمام طاقت سے تیرنے لگے اور جُوں توں کر کے پرلے پار پہنچے ۔ زمین پر قدم رکھتے ہی پھر بھاگنا شروع کیا۔ آخر سفر کی زحمتیں اُٹھاتے اور کوہ و صحرا طے کرتے افریقہ پہنچے ۔ وہاں پہنچکر عبدالرحمٰن کی جان میں جان آئی ۔ خاندان کے بعض اور لوگ اُس سے یہاں آن ملے۔ اور اُسے دم لینے اور اپنی آئندہ بہبودی کی فکر کرنے کی فرصت ملی۔

اُسوقت عبدالرحمٰن کی عمر بیس برس کی تھی ۔ جوانی کا زمانہ ۔ اُمیدوں بھرا دل۔ پھر عالی حوصلگی اور عالی ہمتی ۔ اسپر نجومیوں کی پیشینگوئیاں ۔ یہ سب باتیں کچھ ایسی ملی تھیں کہ باوجود اِس خستہ حالی کے اور آئندہ کی مشکلات کے عبدالرحمٰن مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیتا تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ جوڑ توڑ لڑاتا رہتا تھا۔ اب تک اس کا دھیان فتح کیطرف

عبد الرّحمٰن اوّل

کوہ جبرالٹر کی آسمان سے باتیں کرنیوالی چوٹیوں کے تلے سے ہزار ہا جہاز نکلجاتے ہیں اور ہزار ہا آدمی اِس کی عالیشان بلندیوں پر نگاہ حیرت ڈالتے ہیں مگر بہت کم ایسے ہونگے جنکو اس کی بلندیوں میں فتوحات اسلام کی شان دکھائی دیتی ہو۔ جبرالٹر عربوں کی حیرت خیز فتوحات کا ایسا اَن مٹ نشان ہے جو ابد الآباد تک قائم رہیگا۔ یہ وُہی جبل الطارق ہے جس کو آج سے بارہ سو برس پیشتر طارق نام ایک عرب سپہ سالار نے اپنا نام دیا تھا۔ تاریخ ہسپانیہ کے متعلّق طارق کے ساتھ اور جن جن مشاہیر اسلام کے نام صفحۂ ہستی پر یادگار رہینگے۔ اُن میں سے ایک عبدالرحمٰن بھی ہے۔ جس نے ہسپانیہ میں سلطنت اسلامی کی بنا مستحکم کی۔

روما میں جس زمانہ میں کہ بادشاہت تھی تو یہ دستور تھا کہ بادشاہ وقت کسی ہونہار صاحب فراست شخص کو اپنا جانشین کرجاتا تھا یہ کوئی ضروری امر نہ تھا کہ بادشاہ کا بیٹا ہی ولیعہد کیا جائے اور اُس کے بعد اُسکا جانشین ہو جیسا کہ بعد کی سلطنتوں میں ہوا۔ اور ایسے ہی ابتدائے اسلام میں خلافت کا حق وراثتاً نہیں پہنچتا تھا۔ مگر خلفائے راشدین کے بعد خلافت کے متعلّق اختلافات کچھ ایسے بڑھ گئے کہ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس کا سا حساب ہوگیا۔ اور اسی سلسلہ میں سلطنت بنی اُمیّہ کے ہاتھ آئی۔ اِس خاندان کے چودہ خلیفہ یکے بعد دیگرے ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک گدّی نشین ہُوئے۔ جب بنی اُمیّہ کی طاقت ضعیف ہوگئی اور عباسیوں نے زور پکڑا۔ تو اسلامی دنیا کی حکومت خلفائے بنی عباس کے قبضۂ اقتدار میں آئی۔ اور مغلوں کی ترکتاز سے پہلے پہلے ۱۲۵۸ء تک یہ خاندان حکمران رہا۔ اُنہوں نے بجائے دمشق کے اپنا دار السلطنت بغداد میں قائم کیا۔

معذول شدہ خاندان بنی اُمیّہ میں ایک ہونہار نوجوان عبدالرحمٰن نامی تھا۔ اِس کے

چڑھائی کی۔ یوسف اُس صوبہ کا حاکم مقابلہ میں آیا۔ وادی کبیر کا دریا خوب چڑھا ہُوا تھا۔ طرفین کی افواج بالمقابل کنارِ دریا پر پڑی تھیں۔ عبدالرحمٰن اس موقع پر ایک چال چلا کہ جو اُس جیسے دلیر سپہ سالار کے شایان نہ تھی۔ صلح کرنے کے بہانے سے دریا کو عبور کیا اور یوسف کی بیخبر فوج پر ایکدم سے حملہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ فتح ہو گئی اور عبدالرحمٰن نہایت تزک و شان سے شہر مفتوح میں داخل ہوا اور حکم دیا کہ یوسف کی حرم کو نہایت عزت و حرمت کے ساتھ رکھا جائے۔ اس سال کے اختتام سے پہلے پہلے عبدالرحمٰن تمام اُس حصہ کا مالک ہو گیا جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اور قرطبہ نے خاندان اُمیہ کا بانی ہوا۔ جس کی سلطنت تین سو برس تک اندلس میں رہی۔

عباسیوں نے اسکا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ابھی تخت پر بیٹھے ہُوئے بہت دن نہیں ہُوئے تھے کہ عباسیوں کی طرف سے ایک شخص ابن مغیث نامی اندلس پر حملہ آور ہوا۔ بغاوت کرنے والے سرکش جس طرح عبدالرحمٰن سے مل گئے تھے اسی طرح ابن مغیث کے ساتھ ہو لئے انکی سرکشی نیش کژدم کی طرح بہ تقاضائے طبیعت تھی۔ عبدالرحمٰن محصور ہو گیا۔ محاصرہ دو مہینے تک جاری رہا۔ محصورین کی حالت دن بدن ردی ہوتی جاتی تھی اور محاصرین کو کمک ملتی جاتی تھی۔ یکایک عبدالرحمٰن کو خبر لگی کہ دشمن اپنی زیادتی تعداد سے سست ہو کر کچھ غافل ہو گئے ہیں اُس نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیا فورًا اپنے سات سو بہادر و جری سپاہیوں کو جمع کیا اور بہت سی خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے اُن میں آگ لگا دی اور اپنی تلوار برہنہ کر کے میان اس آگ میں ڈالدی اور بہ آواز بلند پکارا کہ "اب فتح یا موت"۔ اس سے اشارہ یہ تھا کہ اب تلوار میان میں نہیں جا سکتی۔ فورًا سات سو کے سات سو سپاہیوں نے اپنے سردار کی پیروی کی اور شہر سے نکلکر یوں جان توڑ کر لڑے کہ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور عباسیوں کا محاصرہ اُٹھ گیا۔ فتح پھر عبدالرحمٰن کے نام ہی رہی۔ جب اس شکست کی خبر عباسیوں کے خلیفہ منصور کو پہنچی تو اُس نے عبدالرحمٰن کی بہادری پر بہت آفرین کہی اور حیرت ظاہر کی۔

لگا ہوا تھا۔ اوّل اُسنے اپنے خیال کی باگ افریقہ کیطرف موڑی اُس نے سوچا کہ دمشق وبغداد کی طرف تو عباسیوں کی ہوا بندھ گئی ہے۔ مگر یہاں ابھی انکی نہیں چلتی شائد اپنے پانوجم جائیں۔ مگر تقدیر کی گردش پانچ برس تک بے سُود شمالی افریقہ کے ہر شہر و دیار کی خاک چھانی۔ آخر اُسے اندلس کا خیال آیا۔ اور وہاں کی خانہ جنگیوں کا حال سُنکر اُن سے فائدہ اُٹھانے کا ارادہ ہوا۔ چنانچہ بدر کو اُن عمائدِ عرب کے پاس ہسپانیہ میں بھیجا جنکو کہ اسکے بزرگوں سے فیض پہنچا تھا۔ عرب کے قاعدہ کے موافق اسکا ان لوگوں پر بڑا حق تھا چنانچہ بدر کے ان سرداروں نے نہائت خاطر داری کی اور بے انتہا دلجوئی کر کے مدد کا وعدہ کیا اور عبدالرحمن کو بُلا بھیجا۔

بدر جب واپس مصر میں آیا تو عبدالرحمن نمازِ مغرب میں مشغول تھا۔ جو شخص بدر کے ساتھ اندلس سے بحیثیت سفیر آیا تھا اُسکا نام ابوغالب تمام تھا۔ جیسا کہ مشرقی لوگوں کی عادت ہے۔ عبدالرحمن نے اس سفیر کے نام سے نیک فال لی اور خوش ہو کر پکارا کہ "واللہ اب ہم سب پر بالکل غالب آجائینگے اور میری مراد دلی برآئیگی"۔ سفیر ہسپانیہ کا پیغام آتے ہی۔ عازمِ سفر ہوا۔ جب عبدالرحمن ہسپانیہ میں داخل ہوا۔ تو وہاں کی حالت آلس کی جنگ کی وجہ سے بہت ابتر تھی۔ جس طرح محمد شاہ کے زمانہ میں نادر کا آنا باوجود اُس کے ظلم کے اُمرا نے غنیمت سمجھا تھا اسی طرح اب عبدالرحمن کی بھی اندلس میں بہت کچھ آؤ بھگت ہوئی۔ خاندان اُمیہ کے پُرانے نمکخوار نذریں گذارنے آئے اور اسقدر لوگ عبدالرحمن کے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے کہ سردار اندلس کو نئی فوج تیار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ مگر ساتھ ہی موسم سرما آگیا اور بارش شروع ہوگئی جس سے تھوڑے عرصہ کے لئے جنگ ملتوی ہوگیا اور عبدالرحمن کو اپنی فوج درست کرنے کا موقعہ ملا۔

دوسرے سال کے شروع ہوتے ہی لڑائی شروع ہوگئی۔ عبدالرحمن نے قرطبہ پر

سید نظام شاہ نظام

مخزن کے جولائی کے نمبر کچکول میں یہ شعر نظر پڑا۔ شعر

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وُہ　　اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

حضرت نظام جن کا یہ شعر ہے تھوڑا سا حال اُنکا لکھتا ہوں۔ مصطفےٰ آباد عُرف رامپور کے رہنے والے تھے۔ نظام شاہ نام تھا۔ ذات کے سیّد تھے۔ رامپور میں پیدا ہُوئے اور یہیں نشوو نما پایا۔ ابتدا میں اپنے پیرو مرشد میاں احمد علی شاہ صاحب رامپوری و شیخ علی صاحب متخلص بہ بیمار سے مشورۂ سخن رہا۔ آخر میں جناب نواب محمد یوسف علیخاں صاحب بہادر فردوس مکان متخلص بہ ناظم سے افتخارِ تلمذ حاصل کیا اور آخر عمر تک ناظم ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ جب کبھی حضرت غالب رامپور تشریف لاتے تھے تو نظام بایار ناظم بغرضِ اصلاح غزل پیش کشِ حضرت غالب کرتے تھے۔ مذاقِ سخن میں چاشنی تصوّف بھی شریک تھی۔ قریب پچاس سال کے عُمر پائی۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں اِنتقال کیا۔ اپنے پیرو مرشد میاں احمد علی شاہ صاحب کے احاطہ مقبرہ واقع رامپور میں دفن ہُوئے۔ "نظام نام آور" مادۂ تاریخ ہی۔ افسوس کہ کلام اُنکا طبع نہیں ہوا۔ طبیعت پاکیزہ پائی تھی۔ بندش صاف اور پسندیدہ اور چُست ہوتی ہی۔ چند اشعار جو یاد آتے ہیں ہدیہ ناظرین کرتا ہُوں۔ اُمید کہ لُطف سے خالی نہ ہونگے۔ اُس غزل کا مطلع جسکا ایک شعر منتخب ہو چکا ہے ملاحظہ فرمایئے۔ کیا خوب مطلع کہا ہی۔

اسکا گلہ نہیں نہ ہو وعدہ وفا نہ ہو　　اتنا تو ہو کہ رشک مجھے غیر کا نہ ہو

حُسن مطلع میں وفا کا قافیہ پھر باندھا ہے اور کیا خوب باندھا ہی۔ شعر

ایک لطف روز کا ہی سوال و جواب میں　　میں خود یہ چاہتا ہُوں کہ وعدہ وفا نہ ہو

مقطع لکھا ہے :-

ساتھ ہی ڈرا بھی اور کہا کہ شکر ہے کہ میرے اور اس کے درمیان سمندر ہے"۔ اِس فتح سے عبدالرحمن سلطان عبدالرحمن ہوگیا۔ اور اسکا لوہا سب مان گئے۔ یورپ کے بادشاہوں میں سی اسکا مقابلہ سب سے زبردست بادشاہ شارلین اعظم سے ہوا اور رونسَوِیلز کے میدان پر شارلین اعظم کو اپنا سا منہہ لیکر واپس جانا پڑا اگرچہ ایک اور موقع پر عبدالرحمن کو بھی پاسَٹو کے مقام پر زک اُٹھانی پڑی جس سے کہ اُس کی یورپ کی فتوحات کے ارادوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ورنہ تمام یورپ میں ایک دفعہ مسلمانوں کا ڈنکا بج جاتا۔

ایک عرب مورخ عبدالرحمن کی بابت لکھتا ہی کہ یہ سلطان رحمدل اور نیک مزاج تھا۔ نہایت فصیح اللسان و خوش بیان تھا۔ اگرچہ وُہ کسی کام کا ارادہ بہت دیر میں کرتا تھا مگر جب ایک دفعہ کرلیتا تھا تو پھر اسکی تکمیل میں مستقل مزاجی کام میں لاتا تھا۔ وُہ صاحب فراست وذکا تھا اور کبھی عیش و آرام میں نہیں پڑتا تھا۔ اپنی سلطنت کے کاروبار کو دُوسروں پر کبھی نہ ڈالتا تھا سب خود کرتا تھا مگر مشکل کے موقعہ پر ذی عقل و صاحب تجربہ لوگوں سے راے لیتا تھا۔ میدانِ جنگ میں بہادر اور جری سپاہی تھا اور لڑائی میں ہمیشہ سب سے آگے رہتا تھا۔ غُصّہ کے وقت نہایت غضبناک ہوجاتا تھا اور مخالفت کی برداشت نہ تھی۔ چہرہ سے رُعب برستا تھا اور دوست دشمن ہر ایک اسکے سامنے جاتے ہوئے تھرّاتا تھا مگر ساتھ ہی اخلاق کی یہ حالت تھی کہ جنازوں کے ساتھ ساتھ جاتا اور اُنکی نماز میں شریک ہوتا تھا اور جمعہ کے روز بعض اوقات ممبر پر کھڑے ہوکر وعظ کہتا تھا۔ بیماروں یتیموں اور بیواؤں کی خبرگیری اِسے دل سے پسند تھی اور رعایا کی بہتری ہر دم پیشِ نظر رہتی تھی +

مُشتاق احمد۔ زاہدی (از دہلی)

حضرتِ غالبؔ یاد آ گئے ۔ گو قافیہ بدلا ہوا ہے :۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

حامد علیخاں ۔ (بیرسٹر ایٹ لا ۔ لکھنؤ)

ایک باپ اپنے فرزند دلبند کو بوقت مسافرت نصیحت کرتا ہے :۔ ”اپنے خیالات کو زبان تک مت لا اور نہ ہی اپنے کسی بیہودہ خیال کو عملی قالب دے ۔ بےتکلّف ہو ۔ لیکن بےتمیزی سے احتراز کر ۔ جو تیرے دوست ہوں ۔ اور جنہیں تو وفا کی کسوٹی پر کس چکا ہو ۔ اُنہیں اپنے رُوح سے محبّت کی زنجیر کے ساتھ جکڑ لے ۔ مگر ناتجربہ کار اور نوعمر ساتھیوں سے اختلاط نہ بڑھا ۔ لڑائی سے بچنے کی کوشش کر ۔ لیکن اگر اتّفاق سے کسی جھنجھٹ میں پھنس جائے تو دشمن کو اپنے بالادست ہو جانیکا عملی ثبوت دے“ ۔

”سب کی سُن ۔ اور چند کو سُنا ۔ ہر ایک کی بُرائی سُن لے ۔ لیکن اُس پر اپنی رائے ظاہر نہ کر ۔ اپنے لباس کو اِس حد تک امیرانہ بنا ۔ کہ تو اپنی جیبِ خاص سے مہیّا کر سکے ۔ لیکن زرق برق اور فوق البھڑک کپڑوں کا شوق نہ کر ۔ کیونکہ انسان کا ہمیشہ لباس سے موازنہ کیا جاتا ہے“ ۔

”نہ تو مقروض ہو ۔ اور نہ ہی قرض خواہ ۔ کیونکہ قرض اکثر اپنے آپ کو بھی ضائع کر دیتا ہے اور دوست کی دوستی سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے ۔ اور ساتھ ہی قرض دینا حصارِ کفایت شعاری کو شکستہ کر دیتا ہے“ ۔

”اگر ان صفات کے ساتھ تجھ میں وفا شعاری کی صفت بھی موجود ہے ۔ تو ویسے ہی یقینی طور پر تجھے ثابت ہو جائیگا ۔ کہ تو کسی ذی رُوح سے بھی نہ دبے گا ۔ اور کسی کے سامنے جھوٹا نہ ہوگا“ +

(شکسپیر)

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بُت ہمیں نظام — ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :-

وُہ کیا دن تھے وہ کیا راتیں تھیں کیا کیا لُطف ہوتے تھے — بھُلائیں لاکھ پر وُہ یاد صُورت آہی جاتی ہے

بتوں کے عشق سے توبہ تو کی ہو پر نظام اب بھی — جو صُورت اچھّی ہوتی ہو طبیعت آہی جاتی ہو

انگڑائی بھی وُہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مُسکرا کے ہاتھ

یہ شعر بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے :-

یہ بھی نیا ستم ہو حنا تو لگائے غیر — اور اُس کی داد چاہے وُہ مجھکو دکھا کے ہاتھ

مقطع بھی کیفیت سے خالی نہیں :-

دینا وُہ اُسکا ساغر مے یاد ہے نظام — مُنہہ پھیر کر اُدھر کو۔ اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس زمین میں کیا خُوب شعر کہا ہے :-

ایسا رونا نصیب ہو کس کو — اشک پونچھیں وُہ اپنے داماں سے

ان شعروں میں بھی ایک بات نکلتی ہے۔خصُوصًا دُوسرے شعر میں :-

ہر وقت ہم سے چھیڑ یہ عادت ہی کیا ہوئی — ہر بات پر بگاڑ یہ کیا اچھّی بات ہے

سب کے تو ہم بُرے ہُوئے ایک تیری واسطے — اور تو بھی پھر بُرا کہی کیا اچھّی بات ہے

پُرانے پامال شدہ مضمون کو بندش نے کیسا چمکایا ہے۔ فرماتے ہیں

دِل ہل گیا جو وصل میں کھٹکا ذرا ہُوا — یہ ڈر ہُوا کہ چونک نہ مُرغ سحر پڑے

یہ شعر بھی اپنے رنگ میں منتخب ہو :-

بزمِ بتاں میں پہنچ کے ای شیخ ہر کوئی — کعبہ نہیں جو چُومنے پتھّر چلے گئے

یہ دو شعر ہیں :-

کیسا وصال و ہجر اگر فہم ہے نظام — ہر حال میں جُدا بھی ہو وُہ اور ہم بھی ہو

لُطفِ انتظار وہ سامانِ وصل ہائے — دِل کو غمِ فراق میں بھی اِک سرور تھا

خوشیوں کا دلدادہ تھا یا یہاں کے فانی عیش وعشرت اور دولت کا فریفتہ - جیسے کہ اُن الفاظ سے بظاہر معنے لئے جاسکتے ہیں - بلکہ بذاتہٖ وُہ کسی اَور نعمت جاوید کا بُھوکا اور کسی اَور شراب ناب کا پیاسا تھا اور وُہ شراب عشق الٰہی اور محبّت سرمدی ہے -

ہر دل کہ درو مہر و محبت بسرشت گر ساکن مسجد است ور اہل کنشت
در دفتر عشق نام ہر کس کہ نوشت آزاد ز دوزخ است و فارغ ز بہشت

خیّام ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اعتقاد اور ایمان کو خلط ملط نہیں کیا بلکہ ان میں تمیز رکھی ہے - اسکے نزدیک بلحاظ اعتقاد سب مذاہب - برابر ہیں - مگر بلحاظ ایمان اپنے خدا پر کلّی بھروسہ اور توکّل اُسکے دین کی اصل بنیاد اور اُسکے اعتقاد کی اصلی رُوح ہے - اُسکا ایمان ہے کہ اس طرح گُنہ کی کدورت سے آلودہ اور ناپاک ہوکر عاجزی سے خُدا کی پیشی میں جانا اس کی رحمت کاملہ کو زیادہ محرّک کرنے والی بات ہے بہ نسبت اِسکے کہ عبادت اور ظاہرداری کی خُداپرستی سے انسان سنگدل ہوجائے اور اطاعت اور تابعداری کو دعویٰ یا حق نجات ٹھہرائے چنانچہ اسکے کلام کا خزانہ حقیقی نیکوکاری اور سچّی دینداری کے جواہرات سے بھرپُور ہے - مگر رنگ اسکا بھی جُدا ہے - اُسکی دُعا ہے کہ اے الٰہی مَیں نے تجھ کو بے سروپا دُعائیں مانگ کر کبھی دق نہیں کیا اور اب مَیں تیرے سامنے پہلی دفعہ حاضر ہوتا ہُوں - ضرور ہے کہ تو میری شرمناک حالت پر رحم فرمائیگا - پھر اپنی طرف خطاب ہوتا ہے :-

اے سوختہ سوختۂ سوختنی ای آتش دوزخ از تو افروختنی
تا کے گوئی کہ بر عمر رحمت کن حق را تو کجا برحمت آموختنی

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من ایں حرف معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

از خالق کردگار - و ز ربِّ رحیم نومید مشو بجرم و عصیان عظیم
گر مست و خراب بُودہ باشی امروز فردا بخشد بر استخوانہائے رمیم

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

اِس امر سے اِنکار نہیں ہوسکتا کہ جیسے بُت پرست بُت کو خُدا پرستی کا ذریعہ ٹھہرا کر اور ہوتے ہوتے اصل مقصد کو بھول کر اُسی غیر ذی رُوح چیز کو منبع و مخزنِ کرشمہ و کرامات ٹھہرا لیتے ہیں۔ بعض شعرا بھی شرابِ ظاہری کی دلفریبیوں پر فریفتہ ہوکر۔ اصل مطلب کو فوت کرکے خود اُسی کی نغمہ سرائی میں اپنی عمر کا گرانمایہ حصّہ وقف کر دیتے ہیں۔ اور اِس کُلیہ سے عمر خیام بھی مستثنےٰ نہیں۔

چُنانچہ جب وُہ اپنے خاص قلندرانہ لباس میں ایک رندانہ وضع سے ریائی کو بالائے طاق رکھ کر بادہ پیمائی شروع کرتا ہے تو اُسے دُنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی اور اکثر ایسے چھینٹے اُڑاتا ہے کہ بڑے بڑے جُبّہ و کُلہ پوش دامن بچا بچا کر گذرتے ہیں۔

اَے مُفتیِ شہر از تو پُرکار تریم　　با ایں ہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خُونِ کساں خوری و ما خُونِ رزاں　　اِنصاف بدہ کدام خونخوار تریم

فصلِ گُل و طرفِ جُوئبار و لبِ کشت　　بایک دو سہ تازہ لُعبتے حُور سرشت
پیش آر قدح کہ بادہ نوشانِ صبُوح　　آسُودہ زمسجد اند و فارغ زبہشت

دورانِ جہاں بے مے و ساقی ہیچ است　　بے زمزمۂ نائے عراقی ہیچ است
ہر چند در احوالِ جہاں مے نگرم　　حاصل ہمہ عشرت است و باقی ہیچ است

چُوں فوت شوم بہ بادہ شوئید مرا　　تلقین زشراب و جام گوئید مرا
خواہید بروزِ حشر یابید مرا　　ازخاکِ درِ میکدہ جوئید مرا

مگر اِن خیالات سے یہ فرض کرلینا محض غلطی ہوگی کہ عُمر خیام اِس جہانِ گذران کی ناپائدار

یا جدی اور موروثی کمی بیشی اعضاء و قوائے جسمانی یا دیگر اندرونی اور بیرونی حالات کے ساتھ ہوتا ہے جن پر انسان کا کسی طرح کا قابو نہیں ہوتا۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ اگر ایک پتھر جسکو ہم ہوا میں زور سے پھینکتے ہیں سوچ سکنے کے قابل ہوتا تو وہ اپنے دل میں کہتا کہ میں اس لئے اُڑ رہا ہوں کہ اسوقت میری مرضی یہی ہے۔ اسی طرح انسان پر اندرونی یا بیرونی اسباب کا ایسا غیر محسوس اثر ہوتا ہے کہ اکثر اقوال و افعال جو اس سے ظہور میں آتے ہیں اور جنکو وہ محض اپنی قوت ارادی کا نتیجہ سمجھتا ہے درحقیقت اس کے قوت ارادی کو ان میں کچھ بھی دخل نہیں ہوتا۔ یا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ جب انسان کی ہزارہا اُمنگیں اور خواہشیں غنچۂ پژمردہ کی طرح بے وقت مُرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ یا ان میں غیر مترقبہ ناکامی ہوتی ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ نظامِ عالم کی کل کا کوئی پُرزہ ضرور بگڑ گیا ہے جسکی وجہ سے یہ خرابیاں عائد ہوئی ہیں کہ کوئی تو اپنی فارغ البالی میں دن رات عیش دوری میں بسر کرتا ہے۔ اور کوئی نانِ شبینہ تک کو محتاج ہے۔ خیام اس اختلافِ حالات کو دیکھ کر بہت خفا ہوتا ہے اور اپنی آزادانہ شاعری کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ دکھاتا ہے۔

گر بر فلکم دست بُدے چوں یزداں   بر داشتمے من ایں فلک سا زمیاں
از نو فلکے دگر چناں ساختمے   کآزادہ بکامِ دل رسیدے آساں

خیام کے ہاں زندگی کے ہر ایک پہلو سے وعظ و نصیحت کا دفتر کُھلا پڑا ہے جسکی تشریح کی یہاں کوئی خاص ضرورت معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جہاں سے اُٹھا کر دیکھو رباعیات کا کوئی صفحہ نہیں جس میں ہر ایک متنفس کے کارآمد کوئی نہ کوئی بات نہ ملے ہاں اس میں شک نہیں کہ پھولوں کے ساتھ خار اُلجھے ہوئے ہیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ جب تک کانٹا نہ چُبھے پھول چُننے کا خاک لُطف نہیں۔ یہاں صرف دو پھول نذر کیے جاتے ہیں۔

ہنگامِ سپیدہ دمِ خروسِ سحری   دانی کہ چرا ہمے کند نوحہ گری
یعنی کہ نمودند در آئینۂ صبح   کز عُمرِ شبے گذشت و تو بیخبری

باوجود اسقدر اُمید اور بھروسے کے عُمر خیّام اپنی معمولی انسانی کمزوری کے ساتھ خدائے کریم کو ایک عظیم الشان مطلق العنان بادشاہ کی طرح تصوّر کرتا ہے جو روزِ محشر اپنی مرضی کے مطابق اپنے عاجز بندوں کی قسمتوں کا فیصلہ کریگا۔ یہ سوچ کر کہ اگر وُہ فیصلہ ہماری حسبِ دلخواہ نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ حواس باختہ ہوتا ہی اور ایک پُرانے ناز پروردہ کی طرح صاف صاف بھی سنانے لگتا ہی:

ساقی قدحے۔ کہ کارساز است خُدا | در نعمتِ خود بندہ نواز است خدا
مے خور بہ بہار و بارِ طاعت مفروش | کز طاعتِ خلق بے نیاز است خُدا
مارا گویند دوزخی باشد مست | قولے است خلافِ دل درو نتواں بست
گر عاشقِ مست دوزخی خواہد بُود | فردا بینی بہشت ہمچوں کفِ دست
من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است | تاریک دلم نُورِ صفائے تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی | ایں مُزد بود لطف و عطائے تو کجا است

پھر اس گستاخی سے گھبراتا ہے اور اپنی مستی اور اوباشی کے لئے عذر خواہی کرتا ہے:۔

مَے خوردنِ من نہ از برائے طرب است | نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے | مَے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

یہاں اگرچہ گنجائش بالکل کم ہی مگر مناسب معلوم ہوتا ہی کہ خیّام کے فلسفیانہ خیالات کو بطور نمونہ پیش کیا جاوے۔ جس میں اُسکے خیالات کی بلند پروازی کے ساتھ کلام کا زور اس پایہ کا ہے کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہی۔

یارب تو گِلم سرشتۂ من چہ کنم | پشم و قصبم تو رشتۂ من چہ کنم
ہر نیک و بدے کہ از من آید بوجود | تو بر سرِ من نوشتۂ من چہ کنم

آج کل کے محققوں نے یہ امر ثابت کر دیا ہی کہ ہرچند انسان خاص درجہ تک اور خاص خاص حالتوں میں فعل مختار ہی مگر تاہم اکثر اوقات جو کام اس سے ظہور میں آتے ہیں وُہ محض ایک نتیجہ ہوتے ہیں گذشتہ بواعث اور اسباب کا جنکا تعلّق جسم اور دماغ کی قدرتی بناوٹ

قالب خاکی کا تو یہ حال ہو مگر روح (اُسکی) منزلِ مقصود پر جا پہنچی -

خیام تنت بہ خیمہ سے ماند راست　　سُلطاں روح است و منزلش دارِ فنا ست
فراشِ اجل ز بہرِ دیگر منزل　　از پا فگند خیمہ کہ سُلطاں برخاست

یہاں خیام نے اپنے اصلی پیشہ خیمہ دوزی کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس سے جو خوبی کلام میں پیدا ہوگئی ہو اہلِ مذاق پر پوشیدہ نہیں - یہاں عُمر کی زندگی پر آخری پردہ گرتا ہے اور ہم اُسکو نیشاپور کی ایک فصیل کے نیچے جس پر گلاب کی خودرو بیلیں جال بچھائے ہُوئے ہیں اپنی آخری نیند میں سوتا پاتے ہیں جب بادِ شمال کے جھونکے اُٹھتے ہیں تو گلاب کی پنکھڑیاں پریشان ہوکر ہمارے شاعر کی آخری خوابگاہ پر پھولوں کا فرش بچھا دیتی ہیں - سُنتے ہیں کہ اُسنے یہ خواہش اپنے ایک مریدِ خاص سے بھی کی تھی کہ مجھے ایسی جگہ دفن کرنا کہ ہوا کے جھونکوں سے پھول میری قبر پر گرتے رہیں - مرید دُور تھا اور جب اُسکی وفات کی خبر سُنکر اس وصیت کو پُورا کرنے کے لیے پہنچا تو عُمر کی خواہش پہلے ہی پُوری ہو چکی تھی - عُمر خیام حسن صباح و ابو القاسم کا جو بعد میں نظام الملک کے عُہدہ تک پہنچا ہم مکتب تھا اور ۴۳۰ھ میں نیشاپور کے مشہور دار العلوم میں ماہرِ علوم و فنون ہُوا - اور پیچھے محمود غزنوی کے شاہی محقق علم ہیئت و نجوم کے عُہدہ پر سرفراز ہوا اور مرو میں تقویم درست کرنے کے لیے بُلایا گیا - آخر ایک عمر دراز بڑے امن و آسائش سے بسر کرکے اپنے مسکن نیشاپور میں راہیِ مُلکِ بقا ہُوا -

خیام کے کلام پر اب زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں اُس کی قابلیتِ خداداد اور اُسکے زندہ سخن کی وقعت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہو کہ آج قریب ایکہزار سال گذرنے کے بعد یورپ کا کوئی مُلک نہیں جہاں کے اہلِ مذاق اسکے لطفِ سخن سے متمتع نہیں ہوتے - ماہرانِ زبان و علمِ ادب تو درکنار بڑے بڑے ہنرمند و صنّاع اپنی بیجان تصویروں اور سنگی بُتوں میں اسکی زندگی بخش کلام سے روح ڈالتے ہیں اور اسکے سدابہار خیالات سے مُلہم ہوتے ہیں - پس جس شخص کے کلام کا سونا صدہا سال کے انقلابات کی آگ میں جھونک دیا جا چکا ہو اُسکے کھرا ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہو +

(صادق علی خاں)

اے آنکہ خلاصہ چہار ارکانی بشنو سخن از عالم روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی با تست ہر آنچہ مے نمائی آنی

خیام زمانہ کے تغیرات کو ایک کھیل سمجھتا ہے اور عالم کے انقلاب کو ایک تماشہ۔ یہانتک کہ خود موت بھی اسکے لیے کوئی ڈرانے والی چیز نہیں۔ بس ایک عالم بیخودی و مستی ہے کہ اُسی کے مسرت اور سرور میں چھکتا نظر آتا ہے۔

بشنو ز من اے زبدہ یاران کہن اندیشہ مکن زین فلک بے سروبن
برگوشہ عرصات قیامت بنشین بازیچہ چرخ را تماشائے کن

آخر ایک مدت کے بعد اسکا ناگزیر وقت آپہنچا ہے جس سے کسی بشر کو گزیر نہیں۔

خیام کہ خیمہائے حکمت میدوخت در کورہ غم فتاد و ناگاہ بسوخت
فراش اجل طناب عمرش چو برید دلال قضا برائیگانش بفروخت

مگر اُسکو ایسی باتوں کی پرواہ نہیں۔ اُسکو خوب معلوم ہے کہ اگرچہ ہم گذر جائینگے مگر ہمارے نقش قدم آیندہ نسلوں کے لئے ترقی اور عبرت کے راہ نما ہونگے اگرچہ ہم خاک ہوجائینگے مگر ہماری خاک ساغر و مینا کی صورت میں نازنینوں کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔ اور وہ اسکو ذوق وشوق سے اپنے مسیحائی ہونٹوں سے لگائینگے۔ ہمارے اُستخوان بوسیدہ ہوکر خاکستر کی صورت اختیار کرینگے مگر وہ راکھ سبزہ کی نشو ونما اور لالہ وگلاب کی پرورش کریگی اور ہمارے عزیز صدہا سال بعد آئینگے اور اس سبزہ پر بیٹھ کر بادہ پیمائی سے لطف زندگی اُٹھائینگے اور ان پھولونکو دیکھ کر جن میں ہمارا گوشت و پوست منتقل ہوچکا ہو خوش ہونگے۔

چوں ابر بنوروز رخ لالہ بشست برخیز و بجام بادہ کن عزم درست
این سبزہ کہ امروز تماشاگہ تست فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

اے دل چو زمانہ مے کند غمناکت ناگہ برود زتن روان پاکت
برسبزہ نشین وخوش بزی روزی چند زاں پیش کہ سبزہ بردمد از خاکت

کے لئے کافی ہیں۔ بچہ کا کچھ تھوڑا سا نقصان ہوجاتا ہے تو وہ بے چین ہونے لگتا ہے اور ایسا بے کل ہوجاتا ہے کہ کسی طرح کل نہیں پڑتی مگر اُس کے آس پاس کی چیزوں میں تغیر و تبدل پیدا کرنے سے وُہ روتا روتا دفعتاً چُپ ہوجاتا ہے اور اُس کو ایک گونہ تسکین اور خوشی حاصل ہوجاتی ہے + برعکس اِس کے ایک نوجوان لڑکے کو لو جو حساب کا ایک مشکل سوال حل کرنے میں دِل وجان سے محو ہے۔ وُہ ایک ایکانت جگہ ڈھونڈ لیتا ہے اور جن خیالات سے اِس کام میں کسی طرح کی مدد نہیں مل سکتی اُن سب کو یکلخت طبیعت سے ہٹا دیتا ہے۔ اِسوقت اگر کوئی اُسکے اِس کام میں مخل ہو تو اُسے بُرا سمجھتا ہے حالانکہ اَور کسی وقت اُس کی یہ حالت نہ ہوتی تھی بلکہ وُہ تغیر حالت کو پسند کرتا تھا۔ اِس طرح سے وُہ اپنا کام برابر توجہ سے کئے جاتا ہے اور جب تک کہ کام ختم نہیں ہوتا اُسے کوئی اَور بات اچھی نہیں لگتی۔ اِن دونو صُورتوں میں توجہ موجُود ہے لیکن اُس کی قسمیں جُدا ہیں۔ بچہ کی توجہ بلحاظ کسی خاص شے یا کام کے اُسکے قابو میں نہیں ہوتی گویا بچہ کی توجہ کا عمل بلاارادت ہوتا ہے مگر نوجوان لڑکے کی مثال میں ایک معین نتیجہ پُورا کرنے کی کوشش پائی جاتی ہے۔ اِس قسم کی توجہ کو توجہ ارادی کہتے ہیں۔

مدرسہ میں ہمارا منشا توجہ ارادی کا پیدا کرنا ہے۔ مگر یہ توجہ بلا ارادہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ وُہی غیر ارادی حرکات بعد میں توجہ بالارادہ کی صُورت میں ترقی پاکر نمایاں ہوتی ہیں۔ یہاں اُن چند باتوں کا بیان کرنا مفید معلوم ہوتا ہے جنکے ذریعہ توجہ عمل میں آتی ہے اور ابتدائی حالت سے ترقی کرکے اعلیٰ درجہ کی صُورت اختیار کرتی ہے:۔

(۱) جسمانی حالت:۔ بدن کا صحیح وسالم ہونا ضروری ہے تاکہ کسی قسم کی بے چینی بچے کی طبیعت میں راہ نہ پائے۔ اِس طرح سے اُس کی توجہ کسی قدر بٹ جائے گی۔ کوئی مشق اِسقدر دیر تک نہ ہو جس سے طبیعت پر تکان پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ اِس لئے نقشہ انضباطِ اوقات بنانے میں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ (۱) طُلبہ کی عمر کیا ہے۔

توجّہ

ہمارے ہندو کرمفرماؤں میں سے ایک بزرگ جنہوں نے تعلیم و تعلّم میں عمر گذاری ہے اور جو محکمۂ تعلیم کے متقدر عہدہ داروں میں ہیں - ایک مضمون بھیجتے ہیں - جو مدرسین سے خصوصیت رکھتا ہے - مگر چونکہ فن تعلیم کے ایک مشہور ماہر انگریزی کی رائے کا خلاصہ ہے - اِسلئے دیگر حضرات کیلئے بھی خالی از دلچسپی نہیں -

کسی بات کو ذہن کے ذریعہ کامیابی سے دریافت کرنے کی کوشش میں توجّہ کا ہونا لازمی ہے - کُل ذہنی عملوں کی ہر حالت میں توجہ لابدی ہے - ممکن ہے کہ مختلف آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں اور مختلف صورتیں اور نظارے ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذریں - مگر ان آوازوں اور نظاروں کا ہم پر کچھ اثر ہی نہ ہو - جب تک کہ ذہن اِنکو قبول نہ کرے - جبکہ ہم حس اور ادراک کے میدان کو چھوڑ کر قوتِ حافظہ کی شرائط پر غور کرتے ہیں تب بھی معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر زیادہ جم کر کسی شے پر توجّہ دی جاتی ہے اُسی قدر اُس کی تاثیرات دیر تک قائم رہتی ہیں - اور پھر اُنکے بار بار دُہرانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہوتی - اور مختلف تعلقات بھی جو توجہ کی حالت میں قائم کیے جاتے ہیں غالباً ایک ساتھ ذہن کے سامنے آجاتے ہیں - علم حاصل کرنے کی سیدھی سادی اور ابتدائی صورتوں کو بالائے طاق رکھ کر اگر ہم تصوّر، فیصلہ اور مباحثہ پر غور کریں تو ان میں بھی توجّہ کا ہونا ازبس ضروری ہے - پس چونکہ توجہ مدرسہ کے کام کا اسقدر ضروری جزو ہے اِس لیے مدرّس کا فرض ہے کہ ان امور کی بغور تحقیقات کرے کہ توجّہ کس طرح عمل کرتی ہے اور اُس کی ترقی کے ذرائع کیا ہیں -

دو مُتضاد مثالیں - توجہ بلا ارادت و توجّہ بہ ارادت -

اگر ہم بہت چھوٹے بچے کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ توجہ دینے کی طاقت اُس کے قابو میں نہیں ہے - اُسے ایک نیا کھلونا دکھاؤ - ایک عجیب شور مچاؤ - اُسکا ہاتھ کسی نئی سطح سے چھواؤ - یہ سب باتیں فرداً فرداً یا بہ ہیئت مجموعی بچے کی توجہ کو اُسوقت اپنی طرف کھینچے

اِن لفظوں کو ایک دوسرے کی بجائے اِستعمال کر لیتے ہیں۔ کسی چیز کی طرف شوق پیدا کرنے سے توجہ قائم ہو جاتی ہے۔ بعض سبقوں میں طبیعت خود بخود رجوع ہوتی ہے اور شوق پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً اشیا کے سبق اور علمِ طبیعات کے ابتدائی سبق۔ خاصکر جبکہ اُنکے ساتھ تجربے کیے جائیں اور چیزیں دکھائی جائیں۔ اور سبق بھی بذاتِ خود اسقدر دلچسپ نہ ہوں۔ مدرس کے طریقۂ تعلیم کی خوبی سے دلکش بن سکتے۔ بعض مدارس کے طلبہ صرف و نحو کے سبق میں شوق ظاہر کرتے ہیں اور اِس مضمون میں اور سکولوں کے طلبہ سے فوق لے جاتے ہیں۔ بعض مدارس کے طلبہ جغرافیہ کو صرف و نحو پر ترجیح دیتے ہیں اور جغرافیہ کے مضمون میں زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ ان ہر دو صورتوں میں اِس اختلاف کا باعث طرزِ تعلیم ہے۔ جہاں کہیں واقفیت پوری پوری ہوتی ہے اور تمثیل اور ترتیب کی طاقت کو ترقی دی جاتی ہے اور کسی مضمون یا شے کے پیش کرنے کا طرز دلکش ہوتا ہے۔ وہاں شوق کو تحریک ہوتی ہے اور توجہ قائم رہتی ہے۔

(۵) کام طالبعلم کی استعداد کے موافق ہونا چاہئے۔ بچوں کی توجہ زیادہ تر چیزوں کے دیکھنے بھالنے سے ترقی پکڑتی ہے۔ اِس لئے ابتدا میں بچوں کے حواس باصرہ لامسہ اور سامعہ کی تعلیم و تزئین ہونی چاہئے۔

بعد میں قوتِ حافظہ کا عمل شروع ہوتا ہے اور نو دس برس کی عمر تک بچے کی توجہ قوتِ مدرکہ اور متخیلہ کی ذہنی تصوریات کے ترتیب دینے اور اُن میں تعلقات پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اِس زمانہ میں ہم لفظ۔ زبان اور لفظوں کی صورت پر نہایت آسانی سے توجہ دیتے ہیں اور اُنکو ذہن میں قائم رکھتے ہیں۔ بعد ازاں طالب علم اپنے علم کے ذخیرہ کو ترتیب دیتا ہے اور مقابلہ اور مشابہت کے ذریعہ عام تصورات اور فیصلے قائم کرتا ہے اور پھر بحث کر کے ان سے اور نتائج نکالتا ہے۔ پس اگر ہم مدرسہ کی کل پڑھائی میں طلبہ کی توجہ قائم کرنا چاہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے تعلیم کے طریقہ کو طلبہ کی مختلف حالتوں اور اُن کی

(بڑے لڑکے چھوٹے بچوں کی نسبت زیادہ دیر تک توجہ دے سکتے ہیں) (ب) سبق کس قسم کا ہے۔ مثلاً نقشہ نویسی یا جغرافیہ کے سبق کی نسبت تقریری حساب میں طبیعت پر بہت زیادہ زور پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے تقریری حساب کے لئے تھوڑا وقت رکھنا چاہئے۔

(۲) مضمون کیا ہے۔ کسی نئے مضمون پر اوّل بار سبق دیا جائے بشرطیکہ بہت سی مشکلات یکلخت نہ داخل کیجائیں۔ اور جس مضمون میں کہ طلبہ پہلے ہی سے کچھ ترقی کر چکے ہیں اُس میں کوئی نئی بات شروع کی جائے۔ یہ سبق ایسے ہیں کہ انپر جماعت کی توجہ فوراً ہوجاتی ہے۔ آموختہ خوانی یا دُہرانے کے سبقوں میں طلبہ عموماً اُکتا جاتے ہیں۔ خاصکر جبکہ سال کے آخر میں وہی بات بار بار دُہرائی جاتی ہے اور طبیعت کو بُری لگتی ہے۔ ان آموختہ خوانی کے سبقوں میں مدرس کو چاہئے کہ کسی اور زائد تحریک اور نئے طریقہ کے ذریعہ طلبہ کی توجہ قائم رکھے۔

(۳) اُن تمام خارجی باتوں کا دُور کرنا جن سے طبیعت منتشر ہوجاتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جسوقت کوئی اور شے جماعت کی توجہ کو رجوع کرنے کے لئے ہو۔ اُسوقت اُس کے خیالات کو یکسو کرنا کیسا مشکل ہوجاتا ہے جبکہ کوئی شخص گاس کی روشنی کر رہا ہو تو اُس وقت سب کام بند ہوجاتا ہے۔ جب جماعت کے سامنے فرش پر چوہیا ادھر اُدھر کھیلتی ہوئی آجائے تو اُسوقت سبق کی طرف مطلق توجہ نہیں رہتی۔ دو پاس پاس کی جماعتوں کے کام سے بھی توجہ جاتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک جماعت جو صرف و نحو کے رُو سے کسی فقرے کی ترکیب کر رہی ہے وہ کچھ بھی نہ کر سکیگی جبکہ دُوسری جماعت اُس کے عین سامنے سائنس کے تجربے کر رہی ہے۔ ایک جماعت پکار کر پڑھ رہی ہے۔ اس سے پاس کی جماعت میں مُدرس جو کچھ طلبہ کو کہیگا ممکن ہے کہ وہ اُسے برابر نہ سن سکیں اور اس سے اُن کی توجہ کم ہوجائیگی۔ پس یہ ضرور ہے کہ جماعتوں کی ترتیب اور نشست و برخاست کا ایسا انتظام ہو کہ اُس سے کسی طرح کا حرج یا پراگندگی خاطر ظہور میں نہ آئے ورنہ توجہ کی ترقی میں بہت کچھ نقصان واقع ہوگا۔

(۴) کام میں شوق کا پیدا ہونا۔ شوق کا توجہ سے اسقدر قریبی تعلق ہے کہ بعض اوقات

ہماری شاعری اور انشا پردازی

لائق مضمون نگار نے اس ضروری بحث پر ایک محدود نظر ڈالی ہے۔ ایسے وسیع مطالب پر صرف ایک پہلو سے نظر ڈالنا کافی نہیں ہوتا۔ بہر حال اسلامی پہلو سے یہ مضمون دلچسپ ہے :۔

اگرچہ یہ مضمون معاشرت کی ایک شاخ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت بڑی شاخ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باغِ معاشرت کی سرسبزی اسی کی لہلہاہٹ پر منحصر ہے۔ اور اس شاخ کا اثر باغ کے ہر درخت کے ہر برگ و بار اور رگ و ریشہ پر عجیب طور سے پڑتا ہے۔ دُنیا میں جس قوم کا شوقِ تعلیم عمدہ ہُوا یا جسکی شاعری مفید رنگ میں اعلیٰ درجے کو پہنچ گئی۔ یا جس میں انشا پردازی کا بول بالا ہُوا اُسکے خیالات پاکیزہ ہوگئے۔ اور وُہ دُنیا کی اَور قوموں سے بڑھی چڑھی رہی۔ اور سب میں ممتاز و فائق بن گئی۔ کسی زمانے میں ہماری شیوا زبانی کی بھی دُھوم مچی ہوئی تھی اور ہماری جادو بیانی کا بھی لوگ لوہا مانتے تھے۔ ہماری شاعری دوسروں کی شاعری پر فوق رکھتی تھی۔ ہماری انشا پردازی دنیا کی انشا پردازیوں کی جان تھی۔ ہمارے خیالات تمام عالم کے خیالات سے پاک و شُستہ گنے جاتے جاتے تھے لیکن کچھ تو زمانے کے اُلٹ پھیر سے وُہ بات جاتی رہی اور کچھ اپنی کرتوں سے ہم نے وُہ باتیں کھو ڈالیں اور سارے اوصاف پر پانی پھیر دیا ہے۔ ہم نے اپنی شاعری کے وسیع میدان کو تنگ و تاریک۔ اور اپنی انشا پردازی کے صاف اور چھلکتے ہُوئے چشمے کو گندہ۔ اور اپنے پاک خیالات کو ناپاک کر دیا۔ ہماری شاعری مثنوی زہرِ عشق و بہارِ عشق کے بدبُودار کیچڑ میں پھنس گئی۔ ہماری انشا پردازی کا سارا دھڑ فسانۂ عجائب و طلسم ہوشربا جیسے کتابوں کی گہری دلدل میں پھنس گیا۔ اور ہمارے پاکیزہ خیالات فرضی عشق و عاشقی کے فسانوں میں مصروف ہوگئے یا تو ہمارے رجز و قصیدے میدانِ جنگ میں تیغ و تبر اور تیر و سنان کا کام دیتے تھے۔ یا

استعداد کے موافق بنائیں -

طلبہ میں توجہ کی عادت کا پیدا کرنا بہت ہی ضروری ہے - اسی پر تعلیم کا دارومدار ہے - بغیر توجہ کے کسی بات کا حاصل کرنا ممکن نہیں ؞

م - ل

اک دوست کی غیبت

مرے اک دوست نے اک دوست کی یوں غیبت کی
حیف! انساں کا یہ برتاؤ ہو انسان کے ساتھ

کوس کر دورِ زمانہ کو لگے کہنے وہ یوں
میں تو ملنے کو گیا دل کے اک ارمان کے ساتھ

حسنِ اخلاق کا کیا ذکر - تکلف سنئے
ایک بھی بار نے میری نہ سنی دھیان کے ساتھ

پوچھنا - پاس بٹھانا تو کجا - حیرت ہے
اک نظر ایسی نہ ڈالی جو ہو پہچان کے ساتھ

دوستی کیسی! جو آداب ملاقات کے ہیں
انکا تتمہ بھی نہ پایا کسی عنوان کے ساتھ

اس طرح مجھ سے ملے وہ کہ نہیں کہہ سکتا!
یوں تو کافر بھی نہ ملتا ہو مسلمان کے ساتھ

ایسا فرعون زمانے نے بنا ڈالا ہے
کہ قرابت نہیں باقی ہے اب اقران کے ساتھ

میں جو تھا دونوں کے احوال سے پورا واقف
سن کے خاموش رہا فکر کی اک شان کے ساتھ

کیا کہوں - کیا نہ کہوں بات بہت ہی باریک
اور کہنا بھی کچھ ایسا کہ ہو ایمان کے ساتھ

یوں ہوا انکی تشفی کے لئے گرمِ سخن
میں تو کہتا ہوں یہی سنئے جو امعان کے ساتھ

قوم میں جتنے ہیں افراد وہ سب ہوں فرعون
التجا حق سے بس اتنی ہے کہ سامان کے ساتھ

(آزاد عظیم آبادی)

لوگ تعجب سے اُنکا منھہ تکنے لگے۔ افسوس ہے تو اتنا کہ اخلاف اسلاف کے سے نہ پیدا ہوئے۔
اُسی ایک لکیر کے فقیر بنے رہے اور جو میدان اُنکے بزرگوں نے اپنی طبیعت کی جولانیوں
کے لیے اختیار کیا تھا۔ اُس کو وسعت دینے کی بجائے یہ لوگ اسے اور تنگ کر گئے۔
تمام دیوان اور تمام مثنویاں اُلٹ جائیے۔ ان میں چند باتوں کے متواتر ہیر پھیر کے سوا
اور مضمون کم ملیگا۔ شہبازِ فکر جسے قدرت نے ہمیشہ دوشِ ہوا پر سوار رہنے اور بڑے بڑے
بلند پرواز پرندوں کا شکار کرنے کے لیے بنایا تھا۔ ایک زغنِ زخم خوردہ کی طرح کسی کے
سایہ دیوار میں پناہ لیتا ہوا اور کسی کے گھر کا طواف کرتا ہوا زمین پر ہی چکر لگاتا نظر آئیگا۔
اور دوسروں کے مارے ہوئے شکار سے شکم پُری کرتا دکھائی دیگا۔ جُدائی کا ماتم۔ وصال
کی خوشی۔ زُلف وچوٹی کی تعریف۔ موہوم کمر کی لچک۔ اپنی سیہ بختی کی مذمت سراپائے محبوب
کی صفت۔ آسمان کی گردش اور انقلابِ روزگار کی شکایتیں۔ اشک کا دریا لہریں لیتا
ہوا۔ رقابت کے اونچے پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے بس یہی مضامین ہیں جنکے
تذکرہ میں ہمارے ذہین شاعروں اور طبیعت دار منشیوں نے اپنے بیش بہا وقتوں اور
عقل رسا کے انمول جوہروں کو صرف کر دیا۔ اور سبھوں نے انہیں مضامین کے بال کی
کھال نکالی۔ یہ لوگ اگر ہمت سے کام لیتے اور ہر شخص اپنے لئے نیا راستہ نکالتا ہوا قدرت
کے وسیع میدان اور غیر محدود صحرا میں جا نکلتا تو خدا جانے یہ لوگ کیا کیا گل کھلاتے۔ اور
لٹریچر کے کیسے کیسے عمدہ اور سرسبز باغ لگاتے۔ کیونکہ خُدا نے انکی طبیعتوں میں اعلیٰ درجے
کا زور اور انکے سروں میں پرلے سرے کا شور عطا کیا تھا۔

تواریخ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جیحون اور سیحون کے دوآبے سے ہی دُنیا کے
اکثر حصص میں آبادی پھیلی ہے۔ لامحالہ شاعری وانشا پردازی کی جڑ بھی یہی ملک
ہونگے۔ اور دستور کے موافق پہلے پہل یہاں کے باشندوں کے سروں میں ہی بہادری
ودلیری کے شور بھرے ہونگے۔ چنانچہ وہاں کیسے کیسے دلیر وبہادر ہو گذرے ہیں جنکے

ہماری تصنیفات اس بُری گت کو پہنچ گئیں کہ اُنکے پڑھنے سے اخلاق پر بُرا اثر ہونے لگا۔ خیالات کی وسیع سڑکیں تنگ ہوکر پگڈنڈیاں بن گئیں۔ اس بیان سے اگر کلیجہ مُنہہ کو نہ آئے تو کیا ہو۔ آنکھیں اگر خون کا دریا نہ بہائیں تو کیا کریں۔ دُنیا کی تواریخ میں کہیں ایسی خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ جس خرابی وتباہی سے ہماری قوم کا ستیاناس ہوا۔ ہماری کوئی بات بھی پہلے سی نہ رہی۔ نہ جوش ہاشمی رہا نہ ہمت محمدی رہی۔ نہ اُس خلوص کا پتہ ٹھکانا ہے نہ اُس سچی عدالت کا نام ونشان باقی ہے۔ نہ غیرت وحیا ڈھونڈھے ہاتھ لگتی ہے اور نہ ریاضت کا کہیں کھوج ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہماری قوم کی ترقی بے مثل تھی اُسی طرح اُس کی تباہی وبربادی بھی لاثانی ہوئی۔ الغرض جہاں ہم نے اور اور اوصاف نیک پر بھی پانی پھیر اتھا۔ شاعری۔ انشا پردازی اور عمدہ خیالات کا بھی صرف صفایا ہی نہیں کیا بلکہ انکی دلفریب اور دلاویز صورتوں کو ایسا بدنما کر ڈالا کہ دیکھنے والے انہیں دیکھ کر نفرت کرنے لگے۔ اور ہر ایک انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ ہمارے بڑے بڑے زبان آور شاعر جو زبان سے تیغ کا کام لیتے تھے بدنام ہوگئے اور ہمارے اعلیٰ درجے کے انشاپرداز اور منشی جو خطبوں کے ذریعہ سے دلوں میں تحریک پیدا کرتے تھے۔ تمام دُنیا کی نگاہوں میں حقیر ہوگئے۔ ہمارے علوم کی اصلی بنا تو عرب کا ذخیرۂ نظم ونثر ہے۔ مگر جو کچھ ہمارے ہندوستان میں تھا۔ اُس میں مُلک فارس کے مصنّفین کی کوششوں کا بہت سا حصّہ ہے۔ یہاں فارس کے بادشاہوں کے ساتھ انکی دولت واقبال کی طرح بڑے ناظم ونثار بھی آتے گئے اور اپنی وراثت آبائی کو ساتھ لائے کہئے کیا کہنے۔ ہندوستان جیسے زرخیز اور وسیع ملک کی بادشاہت جن مصنّفین کی مربّی ہو۔ حالات موافق سے وہ ذہن رسا اور وُہ نادر طبائع اپنا جوہر اصلی دکھائے بغیر نہ رہیں۔ اور اپنے گوہر لیاقت کو بے چمکائے نہ رُک سکیں۔ انکے سامنے بڑے بڑے مشّاق شاہسواران میدان سخن دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور انکے سمند طبع کی تیزیوں کو دیکھکر

چمن کی سیر

ہمارے کرمفرما مولوی محمد شاہ دین صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا وفیلو پنجاب یونیورسٹی نے ہمیں ایک نئے انداز کی نظم بھیجی ہے جسے ہم خوشی سے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ گو مولوی صاحب بلحاظ لیاقتِ قانونی۔ انگریزی زبان دانی۔ و در فنِ تقریر کے تو پنجاب کے نامور آدمیوں میں ہیں۔ اور محتاجِ تعریف نہیں۔ مگر یہ معلوم کرکے کہ وہ نظم پر بھی بخوبی قادر ہیں۔ ہمیں خود تعجب آمیز مسرت ہوئی۔ اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اکثر اصحاب جو انکے نام سے واقف ہیں پہلی دفعہ تعجب کے ساتھ انکی اردو شاعری کا نمونہ دیکھینگے۔ ابتدائے زمانہ طالب علمی میں مولوی محمد شاہ دین صاحب نے شعر کہنے کا کسی قدر شوق کیا تھا اور ہمایون تخلص کرتے تھے۔ مگر انگریزی تعلیم نے اس شوق کو دبا دیا۔ اور مدت تک انہوں نے بالکل شعر نہیں کہا۔ انکی طبیعت کی جودت کا یہ اچھا ثبوت ہے کہ اگر عرصہ تک شاعرانہ مذاق کو بھلانے کے بعد بھی نظم لکھنے کو قلم اٹھایا۔ تو صاف اشعار نکل آئے۔ اِس نظم میں انہوں نے ارادتاً ایک انگریزی نظم کا تتبع کیا ہے۔ جس کی نظم کے بند میں اکثر پہلے مصرعہ کا تیسرے سے اور دوسرے کا چوتھے سے قافیہ ملتا ہے۔ اور ہر بند کی ٹیپ فارسی لکھی ہے۔ جو ایک لطفِ خاص رکھتی ہے:۔

غنچوں نے چٹکیوں میں میرا دل لُبھا لیا   اے باغباں چمن میں ترے کیا بہار ہے
لالہ ہے یا کہ حُسن کا ہے جل رہا دیا   اُڑتی ہے بُو کہ جاتا ختن کا سوار ہے

ہنگامِ صبح سیرِ گلستاں بسا خوش است
بر شاخِ سبز بلبلِ شیریں نوا خوش است

سبزہ کا ہے زمیں پہ بچھا فرشِ مخملی   اور اس پہ ہیں چمک رہی پھولوں کی کیاریاں
جاپانیوں نے گویا بسحرِ ہنروری   فیروزہ پر عقیق سے کیں میناکاریاں

اے آسماں بگو بہ ملائک کہ دیدہ اند؟
منظر چنیں بہ خلدِ بریں۔ یا شنیدہ اند؟

کاہنوں سے پُرانی کتابیں بھری پڑی ہیں - ان کی ایک شاخ ایران میں گئی - ایک حصّہ ہندوستان آیا - اور ایک جماعت فرنگستان میں پہنچی - ایرانی بڑھے - پھلے - پھُولے - ہندوستان تک پھیلے - مگر اب رُو بانحطاط ہیں - ہندوستانی جنگجوئی کو تو جلدی کھو بیٹھے - مگر علم و فضل میں کچھ عرصہ تک باپ دادا کا نام خوب روشن کیا - چنانچہ انکے علوم کا چراغ اسوقت تک ٹمٹما رہا ہے - فرنگستانی ابتدا میں تو پیچھے رہے ہوُئے نظر آتے تھے - مگر چند صدیوں میں ترّقی کی راہوں کے ماہر ہوگئے ہیں - اور علوم و فنون کی روشن مشعلیں لیکر ہندوستان کے بھائیوں کو جو پُرانی ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کا معجون مرکب ہیں - فائدہ پہنچانے کے لئے یہاں بھی آپہنچے ہیں - اسوقت اس نئے اثر سے اس مرکّب تہذیب والی جماعت کے علمِ ادب پر روشنی کے مختلف سرچشموں سے مختلف رنگوں کی روشنی پڑ رہی ہے - مگر اب تک اُردو کی لالٹینیں ایرانی روشنی کی جھلک سب سے زیادہ رکھتی ہیں - اِس جھلک کو قائم رکھنا اور دیگر مفید رنگوں سے فائدہ اُٹھانا اب ہمارا مقصد ہے - تاکہ ایک ایسے علم ادب کی بنیاد رکھی جائے جس پر یہ شعر پُوری طرح صادق آجائے ؎ ہر زباں ایک اَوچار مزی - اسکی ہر بات میں ہزار مزی ؂ مصنّفین و شعرا کو اب جان لینا چاہیئے - کہ زمانے نے کروٹ بدلی ہے اور اُنکی کامیابی اسی میں ہے کہ وُہ بھی اُسکے ساتھ کروٹ بدلیں - ہر تصنیف کی زبان خواہ نظم میں ہو یا نثر میں شستہ اور پاکیزہ و صاف اور سلیس رکھنے کی کوشش کیجائے - جو قصّے بیان کیے جائیں اُن میں موجُودہ فسانہ نگاری کی جدّتیں سب داخل کیجائیں - اور اس بات کا بہت خیال رکھا جائے کہ اُنکا اثر اخلاق پر عمدہ اور نیک پڑے - کتاب کی تصنیف کے پہلے یہ بات اچھی طرح سوچ لیجائے کہ اُسکی علّت غائی کیا ہوگی - مغربی خیالات اُردو میں لائے جائیں - مگر محض ترجمہ ہمارے لئے زیادہ فائدہ مند نہ ہوگا - بہتر ہو کہ کچھ مغربی اور کچھ مشرقی رنگ ملاکر ایک نئی چیز پیدا کیجائے جو دونو کی خُوبیوں سے متّصف اور دونو کے نقصوں سے مبّرا ہو ✣

لیاقت حسین ہمسر بھاگلپوری

جلوہ اُسی کا ظاہر و پنہاں ہے ابر میں
صد برق ایک قطرہ ہے دریائے نور کا

اے آفتاب ذرہ مہرِ ضیائے تو
گستاخیِ تمام شد عزمِ ثنائے تو

بارش کی بوندیں گرنے لگیں آسمان سے
اے خضر! عطر دیکھ لے آبِ حیات کا

ہیرے نکل رہے ہیں یہ بادل کی کان سے
تاروں کی طرح چمکیں سماں ہو جوارت کا

اے ابر بر تو رحمتِ پروردگار باد
وز تو بکوہ و دشت ہمیشہ بہار باد

بادل ہو گل ہو باغ ہو بلبل ہو شاخ پر
ہو حسرز جان و راحتِ دل میری ایک شے

قدرت کی خوبیوں پہ ہمیشہ رہے نظر
بس زندگی کا لطف ہمایوں اسی میں ہے

خوش باش اے چمن کہ مرا شاد کردۂ
ویرانہ بود خاطرم - آباد کردۂ

اعجاز دیکھ تو سہی یہاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ

اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
تا نظر کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکش ایں چار یار ما
پنجاب خوش نواست ہمایوں دیار ما

راحتِ یاس

دم ناک میں کیا تھا طوفانِ غم نے میرا
ٹکڑے جگر کیا تھا حسرت کے سم نے میرا

خرمن جلا دیا تھا برقِ الم نے میرا
میں جان دے چکا تھا تو نے مجھے جلایا

کس ناز کس ادا سے اُٹھی ہے نسیم ہائے — آفت کی شوخی اور قیامت کی چال ہے
کہہ دو کہ بلبلوں کو نہ اب باغباں ستائے — شاخ شجر تک آج چمن میں نہال ہے

مانندِ گل ز فیضِ صبا تازہ شد دلم
بادہ خورم بیادِ گل و غم غلط کنم

نہروں میں کس صفائی سے بہتا ہے آبِ صاف — آئینے ہیں یہ سرو و صنوبر کے واسطے
ہر لہر کی زباں سے یہ کہتا ہے آبِ صاف — روح رواں ہوں میں ہی گلِ تر کے واسطے

چیزے کز و حیات شود بہرہ ورمنم
در ابر جلوہ من و در ہر شجر منم

خوشیوں کے گیت گاتے ہیں سطارانِ باغ — شاخوں پہ پھول مستوں کی صورت ہیں جھومتے
محوِ زیارت آج ہیں کیا زارانِ باغ — اور جھک کے پاؤں شاہدِ گل کے ہیں چومتے

گل گفت بس خوش آمدم اینک نوائے تو
بلبل جواب داد - کہ جانم فدائے تو

کالی گھٹا چمن میں ہر اک سمت چھا گئی — موجِ ہوا پہ جھونٹے لگی لینے بوئے گل
پھر آکے اُنکے کان میں کچھ جو سُنا گئی — اُڑ اُڑ کے بلبلیں چلی جاتی ہیں سوئے گل

از قاصدِ صبا چہ حکایت شنیدہ
از من چرا تو بلبلِ شیدا پریدہ

بجلی چمک کے چھپ گئی پھر کیوں سحاب میں — کیا کوئی دیدِ حُسن کے لائق نہ تھا یہاں
کب تک چھپے گا چہرہ یہ آخر نقاب میں — لو یک بہ یک پھر آپ کا جلوہ ہوا عیاں

حقا کہ برقِ حُسنِ حسیناں شنیدہ ایم
ایں نورِ شعلۂ رُخِ رخشاں نہ دیدہ ایم

بجلی نہیں تجلیِ یزداں ہے ابر میں — اور یہ بھی محض عکس ہے اُس کے ظہور کا

قیسِ عامری

وادیٔ عشق سیر کُن کہ دراں
میکند مورِ لنگ تیموری

ایک دن مجنونِ بیدل راہ میں — خاک پر بیٹھا تھا مٹّی چھانتا
ایک رہرو نے کہا یہ دیکھکر — خاک بیزی سے ترا مطلب ہے کیا
از رہِ مہر و محبت قیس نے — سر اُٹھا کر مردِ سائل کو کہا
خاک بیزی سے غرض میری یہ ہے — مجھ کو مِل جائے مری رنگیں ادا
یہ کلام اُسکا سُنا رہرو نے جب — اِک تعجب سا اُسے پیدا ہُوا
اُس کی محویّت کا نقشہ دیکھ کر — مثلِ بُت محوِ تحیر رہ گیا
کچھ تامّل کرکے بولا اور کہا — ہوش کر مٹّی میں وُہ گوہر کجا
اُس گلِ باغِ ملاحت کے لئے — گلزمینِ نُور ہوگی مُتّکا
نیّرِ اوجِ صباحت ہے وُہ مہ — مامن اُس کا آسماں پر ہوئیگا
اس پہ مجنونِ پریشاں حال نے — یُوں دیا اُس کو جوابِ دلکشا
جانتا ہُوں مَیں کہ وُہ گنجِ مراد — گرد و مٹّی میں نہیں ہرگز چھپا
وُہ کہیں محلوں میں ہوگی جلوہ گر — فرشِ مخمل زیرِ پا ہوگا بچھا
دلبری نازک تنی جاں پروری — یہ انیسیں ہونگی اُس کی غمزدا
غمزہ و ناز و ادا غنج و دلال — مثلِ غلماں بر درِ دولت بپا
در پہ اُسکے ہوگا درباں فضلِ حق — حفظِ باری حاجبِ دولت سرا
ہاں مگر اَے گوہرِ کانِ خرد — ہے جُدا اِک مذہبِ اہلِ وفا

اَے یاس تیرے صدقے تونے مجھے بچایا

کیا سبز باغ برسوں اُمید نے دکھائے　　تھے وعدے اُسکے جھوٹے سب مَیں نے آزمائے
دمبازیوں سے اُسکی دھوکے بہت سے کھائے　　پھندے سے اُسکے تُونے آخر مجھے چھڑایا

اَے یاس تیرے صدقے تونے مجھے بچایا

اُمید کے وُہ وعدے جھوٹی ہوائیاں تھیں　　سب جَو فروشیاں تھیں گندم نمائیاں تھیں
دن رات کوششیں تھیں اور نارسائیاں تھیں　　دھوکے کا تونے پردہ آخر کو آ اُٹھایا

اَے یاس تیرے صدقے تونے مجھے بچایا

کیا آرزو کی تپ تھی کیا شوق کا جنوں تھا　　تن من جلا رہا تھا کیا شعلۂ دروں تھا
حرماں کی نشتروں سے دل تھا کہ غرقِ خوں تھا　　زخموں پہ جاں کے تونے مرہم سا آ لگایا

اَے یاس تیرے صدقے تونے مجھے بچایا

کیا آہِ سرد تُونے ٹھنڈی ہَوا چلائی　　گہری سی نیند جس سے دردِ دروں کو آئی
کیا یاس تونے میٹھی لوری اُسے سُنائی　　کیا بھیرویں کی دُھن میں یہ تونے گنگنایا

اَے یاس تیرے صدقے تونے مجھے بچایا

کیا سُکھ کی زندگی ہے اب شوق ہے نہ حسرت　　نے آرزو نہ حرماں دونوں پہ بھیجو لعنت
اَے یاس تجھ کو شاباش اَے یاس تجھ پہ رحمت　　اُمید اُو دور ہو چل۔ تونے بہت ستایا

اَے یاس تیرے صدقے تُونے مجھے بچایا

گذرے گی خوب اپنی اب مَیں ہُوں اور تو ہے　　تجھ کو ہے مجھ سے اُلفت یاں تیری جستجو ہے
مَیں جسم ہُوں تو جاں ہے مَیں پھول ہوں تو بُو ہے　　صد شکر ہے خدا نے مجھ سے تجھے مِلایا

اَے یاس تیرے صدقے تُونے مجھے بچایا

(نیرنگ)

آہی صبر کی ڈھال ہیں کہوں اِسکو کہ رُعب وداب کا اوتار ہیں کہوں اِسکو
اسی میں شانِ فضیلت سدا جھلکتی ہے
بھری ہوئی کبھی گاگر نہیں چھلکتی ہے
یہ گل میں بس گئی خوشبوئے دلربا بنکر یہ چشمِ ناز میں رہتی ہے فتنہ زا بنکر
کسی کے ہونٹ پہ سُرخی ہُوئی ادا بنکر ہمارے سینہ میں آئی ہے یہ وفا بنکر
یہ وُہ ہے جس نے تماشا نیا دکھایا ہے
یہ وُہ ہے جس نے بتوں کو خدا بنایا ہے
خموشی شہر خموشاں میں ساتھ جائیگی خموشی کُنج لحد میں ہمیں سُلائے گی
کفن میں آئے گی اور سینہ سے لگائیگی ہماری خاک بگولوں سے یہ بچائیگی
ہماری قبر پہ مُشتِ غُبار یہ ہوگی
مٹا ہوا خطِ لوحِ مزار یہ ہوگی
خموشی لعل ہی دُرجِ دہن میں۔ مت کھونا جو بات چیت ہے چاندی۔خموشی ہے سونا
ہے اِس سے بڑھ کے بھلا کس نے صُلح کل ہونا ہنسو نہ حد سے زیادہ پڑے نہ پھر رونا
خُدا کو مان کے لوگو فضول مت بولو
جو بات کرنی ہو لازم ۔ تو پہلے تم تولو

منتخباتِ میر

دل کی کدورت اپنی یک شب بیاں ہوئی تھی رہتا ہے آسمان پر تب سی غبار ہر شب
مجلس میں مَیں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب

چاہیے طالب کو ہر دم چُست ہو
اِس پہ ہے اِک پاک مذہب کی بنا
جو قدم اُٹھے وُہ آگے ہی پڑے
اِس میں سرکٹ جائے یا دم ہو فنا
مَیں ہوں عاشق اور عاشق کے لئے
ہے تلاشِ یار لازم دائما
در خیالِ جلوہ دلدار مست
زیں سبب ہستیم گرم مدعا
ہمتِ مجنوں پہ ہو صد آفریں
عاشق مخلوق۔ اور یہ ولولا
ہے مگر افسوس اُس پر ای شریف
راہِ خالق میں جو سُستی سے چلا
پس ہر اِک طالب کو لازم ہے کہ وُہ
ہو طلب میں تازہ دم صبح و مسا

(سیّد فرزند علی شاہ) ہیرپوری

خاموشی

(از منشی احمد حسین خانصاحب بی۔ اے)

یہ کس چمن کی ہے یارب بہار خاموشی
یہ کس نشے کا ہے یارب خمار خاموشی
یہ کس دہن کا ہے یارب سنگار خاموشی
یہ کس کی شان ہے۔ پروردگار! خاموشی

دہن میں شاہدِ قدرت کے یہ زباں ہے ضرور
یہ دل ہی دل میں مری طرح مدح خواں ہے ضرور

مَیں مثلِ اشک سدا چشم نم سے بہتا ہوں
بنے جو جان پہ چُپ چاپ اسکو سہتا ہوں
مَیں بزمِ دہر میں پروانہ بنکے رہتا ہوں
چراغ گور ہوں پرچھائیوں سے کہتا ہوں

کروں تو کس لئے شور و فغاں جہاں کی طرح
خموشی کہتی ہے سب رازِ دل زباں کی طرح

الٰہی مخزنِ اسرار میں کہوں اس کو
الٰہی امن کی سرکار میں کہوں اسکو

شاخ شا نے ہزار نکلیں گے — جو گیا اُس کی زلف کا اک تار

آ زیارت کو قبرِ عاشق پر — اک طرح کا ہے یاں بھی جوشِ بہار

نکلی ہے میری خاک سے نرگس — یعنی اب تک ہے حسرتِ دیدار

درِ مسجد پہ حلقہ زن ہو تم — کہ رہو بیٹھ خانۂ خمار ق

جی میں آوے سو کیجیو پیارے — ایک ہونا نہ درپئے آزار

حاصلِ دو جہاں ہے ایک یہ حرف — ہو مری جان آگے تم مختار

غُصّے سے اُٹھ چلے ہو جو دامن کو جھاڑ کر — جاتے رہینگے ہم بھی گریبان پھاڑ کر

دِل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے۔ سنو ہو۔ یہ بستی اُجاڑ کر

یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے — تسکین دے۔ کہ بیٹھ رہوں پانو گاڑ کر

ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو — قاصد تو کہیو۔ ٹک۔ کہ "جفا کار! دیکھ کر"

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے — حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے — آتا ہے جی بھرا درو دیوار دیکھ کر

جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار۔ دیکھ کر

پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم — مشہور ہے نگیں جو بیٹھا ہے گھر میں گڑ کر

دُوری میں دلبروں کی کٹتی ہے کیسی سب کی — آوہا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر

دیکھو نہ چشمِ کم سے معمورۂ جہاں کو — بنتا ہے ایک گھر یاں سو صورتیں بگڑ کر

اپنے مزاج میں بھی ہے میر ضد نہایت — پھر مر کے ہی اُٹھینگے بیٹھینگے ہم جو اڑ کر

دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی ہوں تو ناکام پہ رہتے ہیں مجھے کام بہت
پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ غالباً زیر زمیں میرؔ ہے آرام بہت

آئے ہیں میرؔ منہ کو بنائے جفا سے آج شاید بگڑ گئی ہے کچھ اُس بے وفا سے آج
جینے میں اختیار نہیں ورنہ ہمنشیں ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی خدا سے آج

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر نہیں اس قافلے میں اہل دل ضبط نفس بہتر

لاکھوں جتن کئے نہ ہوا ضبط گریہ لیک سنتے ہی نام آنکھ سے آنسو گرے کروڑ
بلبل کی طرف چشم مروت سے دیکھ تو بیدرد یوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ
بے طاقتی سے میرؔ لگے چھوٹنے پران ظالم خیال دیکھنے کا اُسکے اب تو چھوڑ

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار
کس ڈھب سے راہ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار
وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میرؔ آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

نہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ امید طالع سے دل بیتاب کو کس منہ سے کہیے کچھ تحمل کر
یہ کیا جانوں کہ کیوں روز لگا رونے سے رہ کر میں مگر یہ جانتا ہوں ابر گھر آتا ہے پھر کھل کر

گئے دن عجز و زاری کے کہ اب ہے دماغ نالہ چرخ ہفتمیں پر
جگر میں اپنے باقی روتے روتے ق اگرچہ کچھ نہیں اے ہمنشیں پر
کبھی جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں پر کہاں پائے لب اظہار
بحث نالہ بھی کیجیو بلبل پہلے پیدا تو کر لب گفتار
شکر کر داغ دل کا اے غافل کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار

ہر سحر لگ چلے ہے تو نسیم اے سیہ مست ناز رہ ہشیار

بہارِ باغ

سبزہ تھا یا کہ فرشِ زمرد نگار تھا　　　شاخیں جھکی ہوئی تھیں یہ پھولوں کا بار تھا

نرگس کو جامِ وحدتِ حق کا خمار تھا　　　دل خود بخود بہار کا باغ و بہار تھا

کس شوق سے گلوں کے دہن چوم چوم کے

سبزے کو روندتی تھی صبا جھوم جھوم کے

کثرت گلوں کی تھی کہ ستاروں کی انجمن　　　آپس میں ہمکنار تھے نسرین و نسترن

سنبل نے کھولدی تھی ادھر زلف پر شکن　　　دکھلا رہی تھی کبک دری ناز کا چلن

طاعت میں ساکنانِ سرائے سپنج تھے

یادِ خدا میں مرغِ چمن نغمہ سنج تھے

(نجم الدین انصاری)　(نسیب)

گرم رفتاری سے ہر آبلہ اک اخگر ہے　　　پاؤں سے میرے تہی کرتے ہیں پہلو کانٹے

پاخراشی ہے میری کوہ کنی سے افزوں　　　پہلے پیدا تو کریں قوتِ بازو کانٹے

کیا سمجھ کر انہیں خوش چشموں سی نسبت دیجے　　　پھول یہ سونگھتے ہیں کھاتے ہیں آہو کانٹے

دیکھتے ہی اُنہیں تلوے میرے کھجلاتے ہیں　　　ای جنوں جانتے ہیں کیا کوئی جادو کانٹے

(حامد علیخاں)

(آتش)

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے　　　امتحاں ہیں ایک مشتِ خاک کے

آدمی دعوی انا الحق کا کرے　　　ولولے دیکھو تو مشتِ خاک کے

غازۂ روئے حسیناں ہو گئی　　　جم گئے نقشے ہماری خاک کے

(رر)

جب نام تیرا لیجے تب چشم بھر آئی　　　اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آئے -

(صبا)

دل کا دعویٰ ہے کہ رسمِ عاشقی ہم سے چلی　　　جب چلی جیسی چلی جتنی چلی ہم سے چلی

(میر)

(فضل ستار ۔ از دکن)

دل میں شرمائیں جو چھو لو نکہ ہو دل میں انصاف　　　دیکھ لیں گر وہ ترا آپ سے شرما جانا

(شہباز)　(رر)

دل کا لگنا بھی اک تماشا ہے　　　جس میں سب کچھ ہو دل لگی ہی نہیں -

(رر)

کچکول

ہستیٔ حق

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا — حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو۔ جانا ہی ضرور — بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا
(میر مہر حسین)

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لئے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لئے ہیں اور تو سب کے لئے
(حالی)

ثمر عیش

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے — ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس شخص کو عیش دوست پاتا ہوں میں — کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے
(میر نذیر حسین)

(حالی)

شرم گناہ

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے — خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
ملا جنہیں انہیں افتادگی سے اوج ملا — ان ہی نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
(〃)

(انیس)

سفر عدم

سفر میں ملک عدم کے کوئی شریک نہیں — کسے مسافر یاور رکاب لے کے چلے
پکارتی ہے لحد میں ہوں خانۂ بے فرش — جو اپنے گھر سے چلے فرش خواب لے کے چلے
(〃)

(مونس)

اشتہار

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے کے وسط میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر۔ بلا محصول ۳/

" دوم درجہ دیسی کاغذ پر " ۲/

محصولڈاک " دونوں صورتوں میں ۴/

(مقامی خریداروں کو محصولڈاک معاف)

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیوپی ایبل کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے ۴ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ ماہ اکتوبر سے دوسری ششماہی شروع ہوتی ہے۔ پہلی ششماہی کی مکمل جلدیں بہت تھوڑی باقی رہ گئی ہیں۔ جن صاحبان کو خریدنی منظور ہوں جلد طلب فرمالیں۔ ورنہ بعد میں اکتوبر سے رسالہ جاری ہونیکی درخواست کی تعمیل ہوسکیگی۔ اپریل سے لگاتار پرچے نہیں بھیجے جاسکینگے۔ **شیخ عبد القادر** مالک و ایڈیٹر

ابزرور (لاہور)

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانیکا یہی ایک ذریعہ ہے۔ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ یوروپین افسر اس کے خریدار ہیں اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں ترتیب مضامین یہ ہے:-

صفحہ اول:- تار کی خبریں۔ کوئی دلچسپ مختصر کہانی یا مضمون جو عموماً یوروپین مضمون نگاروں کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ اردو اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے معاصرین کی رائے کے خلاصے۔ صفحہ دوم۔ لیڈنگ آرٹیکل۔ صفحہ سوم ایڈیٹوریل نوٹ۔ صفحہ چہارم۔ ضروری ملکی خبریں اور خطوط وغیرہ۔ صفحہ پنجم۔ اسلامی دنیا کی خبریں۔ پنجاب کی خبریں۔ ممالک مغربی و شمالی کی خبریں وغیرہ۔ صفحہ ششم۔ منتخبات۔ قیمت سالانہ عہ۵ (غلام رسول بی اے منیجر)

کائستھ سماچار:- یہ ماہوار میگزین انگریزی میں الہ آباد سے زیر ایڈیٹری مسٹر ایس سنہا۔ بیرسٹر ایٹ لا بڑی آب و تاب اور قابلیت سے شائع ہوتا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس میں بیشتر حصہ ایسے مضامین کا ہوتا ہے جو عام پسند ہوں اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمونوں سے اس رسالہ کو رونق دیتے ہیں۔ اس پر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے۔ گر پیشگی (**منیجر کائستھ سماچار**۔ الہ آباد)

وعدے کے اپنے سچے تھے آئے وہ خواب میں — ناظم تمہیں کو نیند نہ آئی تمام رات
(فضل پستانہ) (ناظم)

ترے تیر نیم کش کو کوئی مرے دل سے پوچھے — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
(غالب)

آنکھیں پتھرا گئیں اور تپ پہ ٹپکتے آنسو — دل بے ہجران تیری طاقت نے نچوڑی پتھر
(سید محمد از ریاست پونچھ) (خواجہ وزیر)

سُن کے بین مری ہوتا ہے جنوں — نکتہ چیں تنکے چُنا کرتے ہیں

کسی دل سوختہ کو ٹھکرایا — کہتے ہو تلوے جلا کرتے ہیں

دیکھنے جنکو نہ پاتے تھے وزیر — اب وہ آنکھوں میں رہا کرتے ہیں
(ر ر)

حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا — لاش آرام سے سوئے گی سہاگن بنکر
(ر ر) (فرید الدین تمانی)

یاس بڑھ جائے تو ارمانوں کا ماتم نہ رہے — غم اگر حد سے گذر جائے تو پھر غم نہ رہے
(مضطر)

اے اجل آگ جدائی کا مزا دونا ہو — ارتباطِ تن و جان ہجر میں باہم نہ رہے
(ر ر)

نہ میرے بعد چلے کاش کسی پر ظالم — میں جو بیدم ہوں تری تیغ میں بھی دم نہ رہے
(ر ر)

رقصِ بسمل کی حقیقت نہیں دل کے آگے — آپ دیکھیں گے کسی دن تو پھڑک اُٹھینگے

ہوش میری تو اُڑے یار کے جلوہ سے کلیم — غیر کمبخت تو سایہ سے جھجک جائینگے
(ر ر) (کلیم)

مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا — کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا
(معلن) (ذوق)

شب ہم نے تہیہ جو کیا توبہ کا ساقی — مغرب سے سحر مہر درخشان نکل آیا
(ر ر)

تو نے گل کو سر پہ رکھا جب چمن میں توڑ کر — میں بھی حاضر ہوں کہا غنچہ نے یہ منہ پھوڑ کر
(ر ر) (ر ر)

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
(ر ر) (ر ر)

گر دکھا دوں عالم اپنے نالہ ہائے زار کا — کام لوں ہر تارِ مو سے تارِ موسیقار کا
(ر ر) (ر ر)

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
(ر ر) (غالب)

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر نہ تھا
(ر ر) (ر ر)

ہنس قبر پہ میری کھل کھلا کر — دو پھول چڑھا کبھی تو آکر
(دورہ)

جلد (۲) نومبر ۱۹۰۱ء نمبر (۳)

ایڈیٹر

شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

کشمیر
پشاور
لاہور
دہلی
لکھنؤ
کانپور
الہ آباد
بنارس
کلکتہ
بمبئی
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس

مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز کے اہتمام سے چھپا

کہتی ہی ہم کو خلق خدا غائبانہ لیا

مخبر دکن (مدراس) مخزن وہی ماہانہ رسالہ ہی کہ جس کا اردو خواں دنیا میں بڑی تمنا و اشتیاق کے ساتھ انتظار تھا - اور یہ وہی رسالہ ہی جو انڈین میگزینوں میں ایک گراں بہا اضافہ ہونیکے علاوہ اپنی رنگ کا پہلا علمی ذخیرہ ثابت ہوا ہی - اسکی ایڈیٹر جناب مولوی شیخ عبدالقادر صاحب بی - اے سرمایہ ناز پنجاب و ایڈیٹر ابزرور انہیں مغربی علوم میں جیسی مہارت تامہ حاصل ہی ویسے ہی علوم مشرقی میں ممتاز ہیں - نہ فقط تحریر میں انہیں شہرت حاصل ہی - بلکہ تقریر کا پلہ بھی اسی قدر گراں نکلا ...... یہ رسالہ نئے اور پرانے خیالات ایشیائی و مغربی طرز انشا پردازی کے نمونہ جات سی اپنے صفحوں کو مزین کئے ہوئے ہے - یہ اگر نثر پسند طبائع کے لئے تفریح ہی تو شیفتگان نظم کے حق میں روح پرور ہے *

اخبار پنجاب (امرتسر) مولوی عبدالقادر صاحب نے اسم بامسمی مخزن جاری کیا ہی جسکی قابل اور فاضل قلمی معاونین نے شیخصاحب کے ارادوں اور آرزوؤنکو امید سی بڑھ کر سرسبز کر دیا ہی - اور مخزن کو ایک ایسا جامع میگزین بنا دیا ہی - کہ ہر رنگ و ہر خیال کی طبیعت کے واسطے بیشمار دلچسپیاں اس میں جمع ہیں ...... ہم کو اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ مخزن اپنی خوبیوں اور بے نظیر دلچسپیوں کی وجہ سی ملک میں اپنی قدردانی کی بہت بڑی گنجائش پیدا کرے گا *

لاہور اخبار - مخزن بحالت مجموعی اس قابل ہی - کہ ہر ایک با مذاق جنٹلمین کی میز پر ہو - اسکے مضامین ہمیشہ عالی رطب و یابس کی بھرتی سے پاک اور دل میں فرحت پیدا کرنے والے ہوتے ہیں - ہمارے خیال میں یہ رسالہ اس قابل ہی کہ سر رشتہ تعلیم اس کی کاپیاں خرید کر ہر مدرسہ اور کالج کی لائبریری میں ایک ایک کاپی بھیجدیا کرے یا ہیڈ ماسٹروں کو بذریعہ سرکلر اس کی خریداری کی طرف متوجہ کرے *

جوہر فصاحت

بعض انگریزی مخزنوں میں کچھ عرصہ سے یہ دلچسپ بحث جاری ہو کہ فصاحت قدرت کا عطیہ ہے یا سیکھنے سے آتی ہے۔ اہل الرائے لوگوں میں اس باب میں بہت کچھ اختلاف ہو۔ کوئی تو کہتا ہے کہ تقریر کی عمدگی ایک جوہر خداداد ہے جو مشق سے جلا پا سکتا ہے۔ مگر پیدا نہیں ہو سکتا اور کوئی کہتا ہے۔ کہ مشق پر فصاحت تقریر کا مدار ہے۔ ایک منچلے مضمون نویس نے یہانتک کہ دیا ہے۔ کہ اس خیال نے کہ فصاحت وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ بہت گویا آدمیوں کو فصیح بننے سے روکا۔ کیونکہ وُہ تھوڑے سے عطیہ پر اسقدر پھولے۔ کہ کوشش ترک کر دی اور جو کچھ بننا تھا وُہ نہ بن سکے۔ اور کئی کم زبان اشخاص کو بے زبان بنا دیا۔ اور وُہ سمجھ بیٹھے کہ جب فی الحال انکی تقریر موثر نہیں۔ تو انکو مشق سے کیا فائدہ ہو گا۔ کیونکہ یہ فن اکتسابی نہیں۔ خواہ ان خیالات میں سے کسی کے ہم طرفدار ہوں۔ غالباً اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ کہ مشق تقریر ہر حال مفید ہے جن میں قوت گویائی اور زور طبع قدرت نے رکھا ہے۔ انکی قدرتی خوبیاں مشق سے دوبالا ہو جائینگی اور جنہیں قدرت نے اس نعمت سے تھوڑا حصہ دیا ہے۔ وُہ بھی اپنی موجودہ حالت سے بہت کچھ ترقی کر جائینگے۔ اور فن تقریر کو بہ حیثیت فن سیکھنے سے اس قابل ہو جائینگے۔ کہ بھرے مجمع میں دلیری سے گفتگو کر سکیں اور سُننے والوں پر تھوڑا بہت اثر ڈال سکیں۔ اس فن کی نسبت یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہو۔ کہ اگر کوئی دل سے اسکا شوق کرے اور طبیعت بھی

اِشتہارات

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے کے وسط میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر ۔ بلا محصول ـــ ۵؎

" دوم درجہ دیسی کاغذ پر " ۴؎

محصولڈاک دونوں صورتوں میں .. . ۶؍

(مقامی خریداروں کو محصولڈاک معاف)

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پی ایبل کی اجازت آنی چاہیئے ۔ مابعد کا حساب نہیں ۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے ۴؍ کے ٹکٹ آنے چاہئیں ۔ ماہ اکتوبر سے دوسری ششماہی شروع ہوتی ہے ۔ پہلی ششماہی کی مکمل جلدیں بہت تھوڑی باقی رہ گئی ہیں ۔ جن صاحبان کو خریدنی منظور ہوں جلد طلب فرمالیں ۔ ورنہ بعد میں اکتوبر سے رسالہ جاری ہونیکی درخواست کی تعمیل ہوسکیگی ۔ اپریل سے لگاتار پرچے نہیں بھیجے جاسکینگے

شیخ عبدالقادر

مالک و ایڈیٹر

آبزرور (لاہور)

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانیکا یہی ایک ذریعہ ہے ۔ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے ۔ بہت سے اعلیٰ یورپین افسر اسکے خریداروں میں ہیں اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں ۔ یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں ۔ ترتیب مضامین یہ ہے:۔ صفحہ اوّل (تار کی خبریں ۔ کوئی دلچسپ مختصر کہانی یا مضمون جو عموماً یورپین مضمون نگاروں کی قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے ۔ (۱) اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے ۔ معاصرین کی رائے کے خلاصے) صفحہ دوم (لیڈنگ آرٹیکل) صفحہ سوم (ایڈیٹوریل نوٹ) صفحہ چہارم ۔ (ضروری ملکی خبریں اور خطوط وغیرہ) صفحہ پنجم (اسلامی دُنیا کی خبریں ۔ پنجاب کی خبریں ۔ ممالک مغربی و شمالی کی خبریں وغیرہ ۔ صفحہ ششم (منتخبات) قیمت سالانہ ۵؎

غلام رسول بی ۔ اے

مینیجر

کالیستھ سماچار:۔ یہ ماہوار میگزین انگریزی میں الہ آباد سے بزیر ایڈیٹری مسٹر ایس سنہا ۔ بیرسٹر ایٹ لا ۔ بڑی آب و تاب و قابلیت سے شائع ہوتا ہے ۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس میں بیشتر حصہ ایسے مضامین کا ہوتا ہے جو عام پسند ہوں اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمونوں سے اس رسالہ کو رونق دیتے ہیں ۔ اسپر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے ۔ مگر پیشگی (مینیجر کالیستھ سماچار ۔ الہ آباد)

راہیوں کی ۔سے پُرتقریر یا ویل کے زور سے غالب بنا سکیں - اہلکاروں کو اگر اور
سے وہ سرو کار نہ بھی رکھیں - تو اپنے افسروں کے استقبال یا رخصتانہ کے اوقات
قریر سے کام پڑجاتا ہے - مجسٹریٹ اور جج علیٰ ہذا القیاس اور نہیں تو وفادارانہ جلسوں
خیرخواہی سرکار انگریزی کا اظہار پُرزور لفظوں میں کرنا چاہتے ہیں - الغرض بڑی چھوٹی
کو کم و بیش فنِ تقریر کی ضرورت ہے اور جُوں جُوں مُلک میں شائستگی بڑھتی جائیگی -
ادی ترقی کرتی جائیگی - یہ ضرورت زیادہ ہوتی رہیگی - اس لئے ہم زمانۂ حال کے چند
مصنفین انگلستان کی آرائے کا خلاصہ لکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ کس کس طرح
کی تیاری کرتے ہیں -

پہلے مسٹر چیمبرلین کی مثال لیجئے - کیونکہ کچھ عرصہ سے وہ بحیثیت وزیر صیغہ نوآبادی کے
ان ہونے کے بہت مشہور ہوگئے ہیں اور خصوصًا جنگ افریقہ جنوبی کے متعلق
تک ختم نہیں ہوا - اخبارات میں بہت زیر بحث ہیں - انکے مخالف کہتے ہیں کہ انکی
غلطیاں اس منحوس جنگ کا باعث ہیں جس نے لاکھوں بندگان خُدا کی جانیں
میں ڈالیں - اور ہزاروں کے خُون بہا دیئے - سینکڑوں گھر برباد اور بیسیوں شہر
و آتش کر دیئے - ان اعتراضات کا جواب مسٹر چیمبرلین اپنی زبردست تقریروں میں
ہیں - اور انکا باوجود ان سب واقعات کے ایسا اثر ہے کہ انگلستان میں ایک گروہ
کا طرفدار ہے - اور اُمید رکھتا ہے کہ انکی لیاقت انکو کسی دن سلطنت انگلستان کے
ین عہدہ پر ممتاز دیکھیگی - مسٹر چیمبرلین نے چند سال ہوئے مقام برمنگھم کی ایک مجلس مناظرہ
ابیٹنگ سوسائٹی) میں اسکے پنجاہ سالہ جلسے پر ایک تقریر کرتے ہوئے خود اُس مجلس کے
ن تقریر کی ابتدا کرنے کا ذکر کیا تھا - انہوں نے فرمایا کہ وہ ۱۸۵۴ء میں پہلے اس
کے رکن مقرر ہو کر ۱۸۶۳ء تک رہے - اور اس عرصہ میں برابر اسکے مناظروں میں شریک
یک طرف یا دوسری طرف تقریریں کرتے رہے - اس تجربہ سے جو رائے اُن کی قرار

معمولی درجہ کی بساپائی ہو۔ اور ایسا ہی بدقسمت اور کُند ذہن نہ ہو۔ تو یہ اُسے کچھ نہ کچھ بنا دیگا اور اُسکے کلام کو خوبیوں سے آراستہ کر دیگا۔ اِسکا خاصہ ہے کہ میدانِ سخن میں

بُزدلوں کو دلیر کرتا ہے

اور دلیروں کو شیر کرتا ہے

موجُودہ زمانہ میں فنِ تقریر شائستہ ممالک کے لئے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوگیا ہے۔ اور جس مُلک میں رعایا کو تھوڑی سی بھی آزادی حاصل ہے۔ وہاں ہر معزز باشندے کو کئی موقعے مجلسوں کے سامنے تقریر کرنے کے پیش آتے رہتے ہیں۔ واعظوں اور خطیبوں اور لکچراروں کی جماعت کو تو جانے دیجئے۔ وہ تو اِس فن کے لئے بنائے گئے ہیں۔ یہ انکی زندگی ہے اور وُہ اِس کے زندہ رکھنے والے۔

مزا نہیں ہے خموشی کا نغمہ پیماں کے لئے

زبان سخن کے لئے ہے سخن زباں کے لئے

صرف اُن لوگوں کی حالت پر غور کیجئے۔ جو لفظ پیشہ نہیں۔ راجہ ہیں۔ نواب ہیں۔ رئیس ہیں۔ ساہوکار ہیں۔ طبیب ہیں۔ ایڈیٹر ہیں۔ مجسٹریٹ ہیں۔ جج ہیں۔ انہی کو کبھی کبھی ایسے موقعے پیش آتے ہیں۔ کہ ابنائے جنس کے کسی مجمع سے خطاب کریں۔ راجاؤں اور نوابوں کو کسی ہمسر کے ہاں مہمان ہونے کے وقت کسی حاکم یا معزز مہمان کی میزبانی کے وقت۔ تقریریں کرنی پڑتی ہیں۔ رؤسا اور اُمرا کو بڑی بڑی مجالس کی صدارت کے وقت۔ ساہوکاروں طبیبوں۔ سوداگروں اور اور اس قسم کے حضرات کو جو پولیٹیکل معاملات سے خصوصیت نہیں رکھتے اور اپنی آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہرداری کے تعلقات میں یہ ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی برادری یا قوم کے مجمع میں۔ کسی اصلاح کے جلسے میں۔ اور اگر ان سب سے کنارہ کش ہیں۔ تو میونسپل کمیٹی کی ممبری میں ہی سہی۔ وُہ جب ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ کہ اپنے خیالات واضح اور مدلل طور پر سامعین کے سامنے پیش کر سکیں اور کبھی کبھی اپنی رائے کو

برمنگہم کی مجلس مناظرہ کے ایک دو اراکین نے جنہیں مسٹر چیمبرلین کی فصاحت کی ابتدائی حالت دیکھنے کا موقعہ ہوا تھا۔ بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف پہلے اپنی تقریریں لکھ کر حفظ کر لیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے طرز ادا میں بے ساختہ پن نہ ہوتا تھا۔ گو وضاحت میں کوئی کسر نہ ہوتی تھی۔ اسی مجلس کے سکرٹری صاحب نے لکھا ہے کہ چیمبرلین صاحب کی تقریریں دلچسپ۔ بامعنے اور پُرمطلب بھی ہوتی تھیں۔ اور اُن سے ذہانت ہوشیاری اور نکتہ رسی بھی ٹپکتی تھی۔ مگر ابتدا میں بالخصوص یہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ وُہ نہایت محنت اور کوشش سے پہلے ہی سے تیار کی ہُوئی ہیں۔ اور صرف پڑھی جاری ہیں۔ اس سبب سے ایک دفعہ کسی کا جام صحت تجویز کرتے ہُوئے مسٹر چیمبرلین اپنا سلسلہ تقریر بھُول گئے اور گھبرا کر بغیر ختم کئے بیٹھ گئے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر چیمبرلین کا اپنا تجربہ اُنکے اس خیال کا شاہد ہے کہ فصاحت صرف قدرتی جوہر ہی نہیں۔ بلکہ مستقل مزاجی اور محنت سے حاصل ہوسکتی ہے۔

سر چارلس ڈالک۔ پارلیمنٹ کے مقرروں کے اعلیٰ طبقہ میں ہیں اور فصحا میں شمار ہوتے ہیں۔ اب انکی مثال لیجئے۔ سر چارلس ڈالک سے کسی نے پُوچھا۔ کہ آپ نے فن تقریر کیسے سیکھا اُنھوں نے جواب دیا کہ مَیں نے سب سے پہلے کیمبرج یونین میں اس فن کی مشق کی۔ مَیں یُونین کے جلسوں میں اکثر بولتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ وہاں اُن دنوں آکسفورڈ کے دستور کے خلاف تقریر میں معاملہ فہمی کا رنگ غالب تھا اور محض خوش بیانی اور شیریں زبانی کی قدر کم تھی۔ اور مَیں جانتا ہُوں کہ میری تربیت میں اس مذاق کا خاص اثر ہوا۔ کوئی نیا آدمی جو خوش بیانی کی کوشش کرتا۔ اُس پر وہاں کے طلبہ ہنستے تھے۔ اور جس تقریر میں واقعات اور نکات بیان ہوں اُسکو غور سے سُنتے تھے۔ اُسکا ضروری نتیجہ یہ تھا۔ کہ میں اکثر مضمون تقریر کی تیاری تقریر سے زیادہ کرتا تھا۔ یعنے واقعات اور دلائل تلاش کرنے میں سعی بلیغ کرتا تھا اور زبان کی چنداں پروا نہیں کرتا تھا۔ مستفسر نے دریافت کیا کہ آپکا پھر ہمیشہ یہی طریق رہا یا بعد میں بدل گیا؟ سر چارلس نے کہا۔ ہاں۔ مَیں سیر و سیاحت کے بعد پارلیمنٹ میں داخل ہوگیا

پائی۔ وُہ یہ ہے :۔ بغیر سخت محنت کے کوئی عمدہ دلیل مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک فرانسیسی مصنف کا قول ہے اور میرے خیال میں بہت درست قول ہے۔ کہ فصاحت اصلی اسکا نام ہے۔ کہ آدمی سب باتیں جو مناسب ہوں کہدے اور اُنکے سوا اَور کچھ نہ کہے۔ یہ آخری شرط سب سے مشکل ہے۔ اور تقریر تیار کرتے ہُوئے زبان کے مانجھنے سے زیادہ وقت اِس بات میں صرف ہو جاتا ہے۔ کہ غیر ضروری باتیں کم کر دی جائیں۔ اور بے محل فقرے نکال دیئے جائیں۔ مَیں جانتا ہُوں ہر اچھے مقرّر کا تجربہ اِس امر کا شاہد ہوگا۔ کہ بڑے بڑے فصحا بھی اَور زیادہ فصیح ہوتے اگر وُہ اِختصار سے کام لیتے۔ مگر بہت سے مطلب کو تھوڑے الفاظ میں ظاہر کرنا خالی از تکلیف نہیں۔ اور بغیر محنت اور تردد کے ہو نہیں سکتا۔ جان برائٹ جو اپنے عہد میں منتخب فصحائے روزگار تھا۔ اپنی تقریروں پر بیحد محنت کرتا تھا۔ ہفتہ ہفتہ بھر بلکہ اِس سے بھی زیادہ وُہ ایک مضمون پر اپنے خیالات کو پختہ کرتا اور سُلجھاتا رہتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ مَیں سب سے پہلے تو خود اچھی طرح اپنے دلنشین کر لیتا ہوں کہ کونسا مدعا ہے جو مَیں سامعین کے دِل پر نقش کرنا چاہتا ہُوں۔ پھر اُسکو سادہ سے سادہ عبارت میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہُوں۔ اور اِس امر کا خاص لحاظ رکھتا ہُوں کہ ہر ایک زائد لفظ۔ ہر بے ضرورت دلیل تقریر سے خارج رہے اور ہر مناسب تشبیہہ و توجیہہ جو خیال میں آتی جائے اور جو نفس مضمون کی مؤید ہو۔ وُہ داخل ہوتی جائے۔ اِسکا نتیجہ یہ ہے کہ جب مَیں تقریر ختم کر کے بیٹھتا ہُوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ سامعین میرا مطلب پُوری طرح سمجھ گئے ہونگے اور میری تقریر کا مقصدِ اصلی بخُوبی اُنکے ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص جان برائیٹ نہیں ہو سکتا۔ اور اُسکے شہبازِ فصاحت کی بلند پروازیوں کی تقلید ہر مرغ بے بال و پر سے ممکن نہیں لیکن ہم میں سے ہر ایک اس قابل ہو کہ تقریر پر محنت کرنے اور وقت صرف کرنے میں اُس کی تقلید کرے اور کم از کم یہ کر سکے کہ سُننے والوں کو کسی امرِ حق کا وُہ پہلو وضاحت سے جتا دے۔ جو خود اُسکے نزدیک مُسلّمہ ہو۔

بلبل اور شعرا

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

آج ہم اپنے شعرا کے غائبانہ دوست بلبل کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں۔

بلبل کو شعرائے ہند کا غائبانہ دوست کہنا بیجا نہیں۔ شمع اور پروانے کے عشق کا درد انجام ناٹک* بارہا محفل ہوتے دیکھا۔ مگر بلبل اور گل کا معاملہ ہمارے لئے محض فسانہ ہے اور بلبل کی زمزمہ پیرائی اور نالہ و فریاد محض دلکش کہانیاں۔ بغیر دیکھے جس شئے کا اسقدر کثرت اور اتنے ذوق و شوق سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر اُسکو واقعی ہمارے شعرا دیکھ پاتے تو خدا جانے کیا کیا کچھ اُس کی نسبت لکھتے اور کہتے۔ وہ تو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہندوستان جنت نشان کی آب و ہوا بلبل کو سرے سے موافق ہی نہیں ورنہ شاید دنیا بھر کے شعرا ہند کے شعرائے بلبل اور گل کے مضامین میں پیچھے رہ جاتے۔ فی الواقع شعرائے ہند کی قوت تخیل کے زبردست ہونے کی ایک بڑی بھاری دلیل ہے کہ بغیر دیکھے بھالے اُنکو بلبل ایک واقعی وجود معلوم ہوتا ہے۔ باغ و گل اور بہار کے ساتھ بلبل گویا ہر جگہ موجود ہے۔ خزاں آتی ہے تو بلبل کے حال پر ہمارے شعرا قدرتی طور سے متاسف ہوتے ہیں۔ اُسکے نغمہ کو گویا برابر سنتے ہیں۔ اُس کے آشیاں و برق کے معاملے کو۔ صیاد کے جور و جفا کو۔ قفس کی مصیبتوں کو ایسا ہی واقعی اور حقیقی سمجھتے ہیں جیسا کہ آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہو رہا ہو۔

جن مختلف طریقوں سے بلبل کا ذکر ہمارے شعرا کرتے ہیں اُنپر ایک خاص ترتیب سے علیحدہ علیحدہ غور کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ بلبل اور شعرا کو باہم بہت سی باتوں میں مناسبت اور

* "درد انجام ناٹک" لفظ ٹریجڈی کا ترجمہ کیا گیا ہے ۱۲

وہاں میں پہلے پہلے بولنے سے ہچکچایا۔ گو یونین میں بے دھڑک بولتا رہا تھا۔ پارلیمنٹ میں جب موقعہ ہوتا ہیں گھبراہٹ کے بغیر بولنے کے لئے نہ اُٹھ سکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ میں طبیعت پر قابو پا گیا اور اپنا کیمبرج والا طریق استعمال کرنے لگا۔ جس سے ایک حوصلہ پیدا ہوا۔ میں بڑی احتیاط سے مضمون کو تیار کرتا۔ اور خاصے مکمل نوٹ پہلے سے لکھ لیتا۔ مگر وہ نوٹ نفس مضمون کے متعلق ہوتے تھے۔ طرز ادا سے انہیں کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا۔" سرچارلس تیاری اور مشق کے اصول کے پورے قائل ہیں۔ اور کم از کم اُن کی حالت میں یہ درست بھی ثابت ہوا ہے۔ مسٹر لوسی صاحب نے پارلیمنٹ کے کچھ حالات مرتب کئے ہیں۔ جن میں یہ بھی لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۶۹ء میں ڈلک صاحب کی تقریر ایسی بھدی ہوتی تھی۔ کہ متوسط درجے کے ممبروں سے بھی گری ہوئی شمار ہو۔ اور سنہ ۱۸۷۷ء میں وہ نہایت پُر تاثیر مقرروں کے زمرہ میں گنے جانے لگے ۔ (باقی آئندہ)

خیابان فارس۔ ہمارے دوست منشی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے مترجم دفتر ہوم سکرٹری سرکار نظام حیدرآباد جن کی نظم مخزن کے پہلے پرچہ میں درج ہو چکی ہے۔ آج کل ایک نہایت اہم علمی کام میں مصروف ہیں۔ باجازت جناب السر اے صاحب بہادر کشور ہند انہوں نے کتاب "پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن" کا۔ جو لارڈ کرزن بالقابہ کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ اردو میں ترجمہ شروع کیا ہے اور "خیابان فارس" اُس کا نام رکھا ہے۔ خوش قسمتی سے لائق مترجم کی یہ اور عزت افزائی ہوئی ہے۔ کہ ہز ہائی نس حضور پر نور والئے دکن دام اقبالہ نے اس کتاب کے اپنے نامی پر معنون کئے جانے کی اجازت دیدی ہے۔ اس کی پہلی جلد عنقریب شائع ہو گی۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ جیسے انگریزی کتاب علاوہ مطالب کی عمدگی کے زبان کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اسی طرح یہ کتاب ہر پہلو سے اچھی ہو گی اور ہمارے ادب میں ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہو گی۔ ہم اسکے بعض حصوں کے نمونے مخزن کے اوراق میں وقتاً فوقتاً ناظرین کرینگے۔ اور شائقین خریداری کی اطلاع کے لئے اسکا اشتہار بھی آئندہ پرچہ سے صفحہ اشتہارات میں درج کرنا شروع کرینگے ۔ (اڈیٹر)

یعنی اس اتحادِ جوہر نے مجاز کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے۔ بہرحال ایسے اشعار
بلبل کی نسبت شعرا کے پایۂ تخیل کا آئینہ ہیں۔

ویسے تو شعرا بلبل کے سوز و گداز کا ذکر ہمیشہ کرتے ہیں اور اُسکے شیون کی تصویر
کھینچتے ہیں۔ مگر اپنے سوز و گداز کا ذکر کرتے ہوئے ہیں بیچاری کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے
اس امر میں اس کو اپنے سے ہمیشہ کم ہی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

عالم ہوں علم عشق کا میں گرچہ مسری — اے عندلیب تو ہے ابھی بوستاں تک

ایک اور صاحب فرماتے ہیں :-

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر — اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

کہیں بلبل کو اپنا شاگرد و مقلد تک بھی سمجھ لیتے ہیں:-

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

لیکن خود سوز و گداز میں بلبل کو اپنا ہم پلہ نہ بھی سمجھیں۔ بلکہ اُسکو زمزمہ پیرائی میں اپنا شاگرد
اور مقلد بھی گردانیں تاہم کبھی ایسا موقع بھی آجاتا ہے کہ شاعر بتقاضائے ہم مشربی بلبل سے
ہم آہنگ ہونا چاہتا ہے اور جوش ہمدردی میں اُس کا غمخوار بننے اور اُس کو اپنا ہمداستان
بنانے کی درخواست کرتا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست — کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

بلبل کی معاملات ہمارے شعرا بلبل کے معاملات کی نسبت جو جو خیالات رکھتے ہیں اُنکی
کچھ مثالیں علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے درج کی جاتی ہیں۔

بلبل اور گل فصلِ گل کیا آئی بلبل کا دماغ عرشِ معلےٰ پر پہنچا۔

فصلِ گل آئی ہے کیا پھولی نہیں بیٹھی ہے — دیکھنا وہ ہے وجاہ و جلالِ بلبل

بلبل کو دھوکا ہو رہا ہے کہ گل وفادار ہے اور گل کا کھلنا گویا بلبل کی [illegible] سادہ لوحی پر ہنسنا ہے

مشابہت ہے۔ بلبل اور شعرا ہم پیشہ اور ہم مشرب ہیں۔ کیونکہ اتفاق سے دونو عاشق مزاج
واقع ہوئے ہیں۔ حسن کی پرستش اور عاشقی دونو کا ایمان ہے۔ اس بارے میں اصول
دونو کی طبیعتوں کا ایک ہی گو درجہ کا فرق ضرور ہے اور ہونا ہی تھا۔ بلبل پھر جانور ہے اسلئے
اُس کی آتش شوق صرف ہوائے گل کے آسرے پر ہی بھڑک رہی ہے۔ شاعر چونکہ انسان ہے
بلحاظ انسانیت عالمگیر عشق اور ہمہ گیر شوق رکھتا ہے۔ وہ حسن ازلی کے ہر ایک مظہر پر دل سے
نثار اور ہزار جان سے قربان ہے ؎

اک دل ہے اسکو دیکھئے کس کس کو اے ظفر — آتے نظر ہیں سیکڑوں طرح نئے نئے

گل ہو۔ ابر ہو۔ ہوا ہو۔ برق ہو۔ قوس قزح ہو۔ شفق ہو۔ کوئی اور ظہور قدرت ہو۔ وادی
کوہ ہو۔ سبزہ زار ہو۔ یا کوئی ذی روح ذی عقل گلعذار ہو۔ غرض کوئی ہو حسن شرط ہے۔ شاعر
کے وسیع عشق میں سب کے لئے گنجائش ہے۔

بلبل اور شعرا ہمساز ہیں کیونکہ علاوہ عاشق مزاجی کے کہ دونو کا ایک مشترک مشرب ہے۔
دونو فطرتی طور پر موزون طبع اور مائل نواسنجی واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ عاشق مزاجی کا
لازمی نتیجہ ہے۔ دل میں درد ہو تو ممکن نہیں کہ نالہ موزون کی شکل اختیار نہ کرے۔

اسی وجہ سے دنیا میں بلبل ہی کو یہ عزت حاصل ہے کہ شعرا بارہا اپنے آپ کو بلبل کہتے ہیں
یا اپنا ذکر بطور بلبل کرتے ہیں۔ گویا اپنے آپ کو بلبل سے متحد الوجود بنا لیتے ہیں۔ جو کچھ حالات
بلبل کے بیان کرتے ہیں وہ سب اپنی نسبت بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

یاد چمن بھی سیر چمن ہے بجائے خود — اپنے لئے تو باغ ہے کنج قفس نہیں

ہم تو قفس میں اُن کے خاموش ہو رہے — اے ہمصفیر فائدہ ناحق کے شور کا

گرتی ہے نشیمن پہ مرے کوند کے بجلی — صیاد کے گھر آگ لگائی نہیں جاتی

بلبل اور شعرا کا یہ اتحاد وجود اُن شعروں سے خاصکر ظاہر ہوگا جو اس مضمون کے مختلف عنوانوں
کی ذیل میں درج کئے جائینگے اور یہ بہت ممکن ہے کہ اُن اشعار میں متکلم بلبل کو سمجھا جائے یا شاعر کو

نہ گل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں روتے　　تمہیں کو بلبلو آتا نہیں انداز شیون کا (درد)

باغ کی پالیٹکس باغ کی پالیٹکس جنکی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ بجائے خود ایک دنیا ہیں۔ اور ہمارے شعرا کے کلام میں ان پالیٹکس کے عجیب عجیب نظارے ملتے ہیں۔ ان پالیٹکس میں جو بڑی بڑی طاقتیں ہیں وہ صیاد۔ باغبان۔ گلچین اور گل ہیں۔ بلبل غریب کا گذارہ ان طاقتوں کی عملداری میں محض بطور توکل ہے۔ ہر وقت اُس غریب کی حالت اُمید و بیم کے درمیان رہتی ہے۔ ان طاقتوں کے ہاتھوں جو کچھ بلبل پہ گذرتی ہے اُسکے بعض نمونے ملاحظہ کیجئے۔

بعض اوقات صیاد اور باغبان بلبل کے خلاف مشورہ اور سازش کرتے ہیں۔

میں کھینچوں دام میں بلبل تو آشیانہ جلا　　بہم یہ مشورہ کرتے ہیں باغباں صیاد (؟)

صیاد باغبان سے علیحدہ جو کچھ سلوک بلبل سے کرتا ہے وہ تو ناگفتہ بہ ہے۔

مانگ خالق سے دعا بعد بقائے گل کی　　پہلے صیاد سے خیر اپنی منالے بلبل (؟)

صیاد کو بلبل سے کچھ عجب لاگ ہے۔

جہاں گیا میں گیا دام لیکے واں صیاد　　پھرا تلاش میں میری کہاں کہاں صیاد (؟)

صیاد کے حق میں بلبل کی زبان سے بددعا بھی نکل پڑتی ہے۔

اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا　　الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد (؟)

صیاد نادم و پشیماں بلبل کو ہر وقت اُداس دیکھتا دیکھتا آخر کار اُس کو چمن دکھا کر خوش کرنا چاہتا ہے!۔

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے　　کئی برس میں ہوا ہے مزاجداں صیاد (؟)

صیاد بلبل کے پر نوچ ڈالنے پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ قفس میں قید کیا چاہتا ہے۔ بلبل کہتی ہے اسکی کیا ضرورت ہے؟

اسیر رہنے کی ضامن شکستہ بالی ہے　　مری طرف سے عبث ہے تو بدگماں صیاد (؟)

بعض بلبلوں کی خوش قسمتی سے کوئی گلعذار صیاد مل جاتا ہے تو بزعم شاعر وہ قفس میں آشیانے

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل　　بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل (غالب)

بلبل گل سے وفاداری کے عہد و پیمان لے رہی ہے مگر نہیں جانتی کہ بقائے گل دو روزہ ہے اور حُسنِ گل عارضی۔

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکیگی گلِ تر کی صورت (حالی)

بلبل ہزار اپنا رونا روتی ہے مگر بیفائدہ۔ گُل سُنے بھی ؟

فریاد کرے بُلبلِ ناشاد کہاں تک　　اے کاش کہیں ہو شنوا گوشِ گُل

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گل نالۂ بلبل کو گوش توجہ سے سُنتا ہے۔

کان کھولے ہوئے گل گوش برآواز ہے آج　　دردِ دل جو تجھے کہنا ہو سُنانے بلبل

گل کا کھلانا صبا کی کرتوت ہے۔ گل کھلا تو بلبل کے دل پر آفت آئی۔ صبا اس حرکت پر نادم ہے

نہ جانتی تھی صبا یہ کہ ہوگی غش بلبل*　　کھلا کے غنچہ اُٹھائی نقابِ خندۂ گل

تعجب نہیں کہ قیامت کے دن بلبل کی فریاد کا نزلہ صبا کی اس حرکت پر ہی گرے۔

کریگی بلبلِ نالاں جو حشر میں فریاد　　صبا سے ہوگا حساب و کتابِ خندۂ گل

شاعر کو بلبل اور گل کے معاملہ سے اسقدر دلچسپی ہے۔ بلکہ سمجھئے کہ بلبل کی قسمت میں جو انقلابات وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں اُن سے اسقدر ہمدردی ہے کہ صبا سے باغ کی پالٹیکس کی خبر پُوچھتا ہے۔

احوالِ چمن کچھ تو صبا مجھ سے بیاں کر　　سیدھی ہے کہ بلبل سے پھری ہے نظرِ گُل

گل کا اندازِ دلربائی سے کھلنا شاعر کے دل میں ایک دھڑکا پیدا کرتا ہے کہ دیکھئے بلبل کی جان پر کیا گذرتی ہے۔

امیر خیر ہو گلشن میں جانِ بلبل کی　　کھچی ہے صبح سے تیغ خوشابِ خندۂ گل

بلبل کو ہی رونے کا ڈھنگ نہیں آتا ورنہ گل کیا اُسکا نالہ سُنکر اسی طرح ہنستا رہتا ؟

* شاہدِ خندۂ گل کے رُخِ انور سے چونکہ یکایک صبا نے نقاب اُٹھا دی اسلئے بلبل فرطِ تجلّی کی تاب نہ لاکر غش کھا گئی۔

امیر اب مہرباں ہے مجھ پہ صیاد — خبر پہنچے نہ اُس کی باغباں تک (رجب)

باغبان کا تھوڑی دیر سو جانا تو گویا اقلیم چمن کی اندرونی آفات سے محفوظ رکھتا ہے اور دروازہ باغ کا بند ہونا صیاد کی غنیمانہ ترکتازی سے امن بخشتا ہے۔ ایسی حالت میں بلبل کی بن آتی ہے

بلبل کو وصلِ گل ہو مبارک کہ دیر سے — سوتا ہے باغبان درِ گلزار بند ہے (رجب)

باغبان بلبلوں کو باغ سے کیوں اڑاتا ہے؟ حسنِ تعلیل دیکھئے۔

گستاخ ہیں یہ بلبلوں کو اڑاتا ہے باغباں — صدقے اتر رہے ہیں عروسِ بہار کے (رجب)

ہر دردمند طبیعت اور درد بھری بلبل کی طرف جو عاشق مزاج ہے کھچ جاتی ہے اُس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ باغ میں بلبل کی نغمہ سرائی محض شوقِ فطری کا نتیجہ ہے نہ کہ باغبان سُنے اور درپے آزار ہو۔ ورنہ اگر باغبان موجود نہ ہو تو۔

گلشن میں شگفتہ زمزمہ سنجی سے کیوں ہو بند — یاروں بخیر آج یہاں باغباں نہیں (رجب)

آشیاں اور قفس باغبان اور صیاد کے ہاتھوں بلبل کو آشیاں میں ٹھکنا نصیب نہیں ہوتا اور جو یہ دونوں توجہ فرمائیں تو برق کا ڈر جان کھاتا ہے

بے سبب کوندتی نہیں بجلی — ہم نے ڈالی ہے آشیاں کی طرح (رجب)

آشیاں سے محبت بڑھ جانا بھی سو سو اندیشے بلبل کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

گرفتاری کے دن آئے ہیں شاید — محبت بڑھ چلی ہے آشیاں سے (رجب)

بلبل اسیر کی حالت پر ایک نہایت لطیف پاکیزہ اور شیریں نظم مرزا محمد ہادی صاحب مرزا بی۔ اے لکھنوی نے لکھی ہے۔ جو مدحِ غایت دلپذیر بلکہ اپنی طرز میں بے نظیر ہے۔ بلبل کہتی ہے۔

مجھ کو نہ دے اے صفیر مژدۂ فصلِ بہار — آہ کہ صیاد کے دل پہ نہیں اختیار
یاد ہیں وہ دن کہ جب باغ میں تھا آشیاں — آہ وہ طرفِ چمن اور وہ سرِ شاخسار
لالۂ حمرا کا رنگ اور وہ سبزے کا روپ — گوہرِ شبنم کی آب شاہدِ گل کا سنگار
رنگِ شفق کی نمود نورِ سحر کا ظہور — چرخ کی نیرنگیاں شام و سحر آشکار

کو بھول جاتی ہے۔ اور صیاد کے گھر حسن کی دید میں بہل جاتی ہے۔

صیادِ گلعذار دکھاتا ہے سیرِ باغ بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

بلبل کو قفس میں ڈالکر بعض صیاد کا جی نہیں بھرتا بلکہ چمن پاس ہو اور بلبل کو اس طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنے تک نہیں دیتا۔

چمن تو پاس ہے پر ہے یہ جھانک کر دیکھوں ہر ایک وقت تو رہتا ہے پاسباں دیتا ہے

صیاد چمن میں آتا ہے۔ وہ ساتھ بلبل بھی ہمراہ ہے پنجرہ رکھ کر جاتی ہے۔ وہ چلا جاتا ہے تو سمجھتی ہے کہ مرغ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت لیکن کمبخت بدقسمتی سے وہ جھٹ پٹ آتا ہے۔ تو شاعر از راہ دلسوزی کہتا ہے۔

کیا نصیبا ترا اے بلبل شیدا الٹا چل کے گھر سے صیاد جو آیا الٹا

معلوم ہوتا ہے کہ صیاد کو بلبل کا چہچہانا بھی ناگوار ہے۔

صیاد جور پیشہ کو شاید نہیں پسند مرغِ چمن کو زمزمہ پرداز دیکھنا

مگر بلبل بھی آخر عاشق ہے اور عاشق کی درد دوستی اور درد جوئی بھی قدرت کے عجائبات میں سے ہے۔ بلکہ بلبل بعض اوقات آشیانہ سے نکال جانا۔ گلشن سے علیحدہ رکھا جانا اور فراق گل کے صدمے جھیلنا سب پسند کر لیتی ہے اور صیاد اور صیاد کے گھر سے اسقدر اسکو الفت ہو جاتی ہے کہ اُسے دعائیں دیتی ہے۔

آشیانے سے نہ مطلب ہے نہ گلشن سے غرض گھر الٰہی میرے صیاد کا آباد رہے

بلبل اور باغبان بلبل کا باغ میں رہ کر گلچھرے اڑانا سب باغبان کی نظر عنایت پر موقوف ہے۔ باغبان کے تیور بدلے تو بلبل کا اللہ بیلی۔

کچھ ان بن ہو چلی ہے باغباں سے بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

صیاد اگر مہربان ہے تو ظاہرا ہر طرح خیر و عافیت ہے۔ مگر یہ اندیشہ برابر دل میں رہتا ہے کہ باغبان کو کہیں اس حالت کا پتہ نہ لگ جائے۔ کہیں وہ آفت نہ آئے۔

درازیِ قید کے سبب سے آخر کار بلبل قفس سے مانوس ہو جاتی ہے اور اسی کو بجائے آشیاں سمجھنے لگتی ہے۔

خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیسا قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

ایامِ آزادی میں جو رفیقانِ چمن بلبل کے صورت آشنا تھے اُن میں سے نسیم بہار بھی ہے۔ دورانِ قیدِ قفس میں بلبل کو اُس کی طرف سے یہ گلہ ہے۔

لاتی شمیمِ گل جو کسی دن قفس تلک کیا ٹوٹ جاتے پانوں نسیم بہار کے؟

مگر کبھی کبھی ہم صفیرانِ چمن حق صحبتِ قدیم ادا کرتے ہیں۔

گلوں کے تحفے زبس ہم صفیر لائے ہیں ہوا ہے کُنجِ قفس صحن بوستاں صیاد

کبھی خود صیاد کی مہربانی سے بھی بلبل کو دیدِ گل نصیب ہو جاتی ہے۔

قفس پہ رکھنے لگا اب تو ہار پھولوں کے ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

مصیبتوں اور آفتوں کی ضیافت کرنا عاشقوں کی سُنت ہے۔ بلبل کا آشیاں بنانا بھی ایک اسی قسم کی غرض پر مبنی ہے۔

خیال ہو کہ جو برق آئے منفعل نہ پھرے نہیں کچھ اور خس و خارِ آشیاں سے غرض

بلبل اور گلچین گلچین بھی بلبل کے قدرتی دشمنوں میں سے ہے بلکہ کہیے کہ رقیبوں میں سے۔ جو جو ستم غریب بلبل پر گلچین ڈھاتا ہے وہ کوئی بلبل سے پوچھے یا ہمارے شعرا سے۔ شاعر پوچھتا ہے۔

کوئی گل توڑا کہ گلچیں نے کیا بلبل کو ذبح اے صبا یہ شور کیسا ہے گلستاں کی طرف

گلچین پھول توڑتا ہے تو بلبل واویلا کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے اس سے کیا فائدہ؟

حصول کچھ نہیں بلبل دہائی دینے سے سُنیگا نالوں کی گلچیں نہ باغباں فریاد

قفس میں بند ہونے کی حالت میں بھی بلبل سے گلچین کی دست درازیاں نہیں دیکھی جاتیں۔

گلچیں نے کوئی گل جو کبھی توڑا باغ میں چاکِ قفس سے دیکھ کے بلبل پھڑک گیا

اسکے بعد اسی سلسلہ میں کوئی ساٹھ سے زیادہ اشعار ہیں باغ اور بہار کی کیفیات کی بلبل کی زبانی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سبحان اللہ! نہ کسی نے آج تک باغ کا ایسا نقشہ کھینچا ہوگا۔ نہ آیندہ کھینچیگا۔ زبان کی صفائی و سلاست تشبیہات کی واقفیت اور نزاکت مضامین کی شادابی اور لطافت۔ غرض کس کس چیز کی تعریف کی جائے ؟ خود مصنف کا یہ مصرعہ اُن کی اس نظم پر صادق آتا ہے ع

جس سے کہ عکسی شبیہہ باغ کی ہو شرمسار

حق یہ ہے کہ بلبل کے بارے میں جو کچھ بھی مشرقی لٹریچر میں لکھا گیا ہے اُسکا ذکر ہرگز مکمّل نہ ہوگا جب تک اس نظم کا ذکر نہ کیا جائے۔ واقعی اگر بلبل حالت اسیری میں چمن کو یاد کرکے ایسے نالہائے رنگیں کر سکتی ہے تو مرزا غالب کا یہ گمان غلط تھا کہ ع بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں جس بلبل کی باتیں حضرت مرزا سلمہٗ نے ہم کو سنائی ہیں وہ تو اس قابل ہے کہ شعرا اُسکا تلمذ کریں مگر یہ تو کرامات سب حضرت مرزا کی ہے بلبل غریب کیا مال ہے۔ جو مرزا صاحب نے اُسکو سکھایا ہے سو کہتی ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ہرچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

باغ کی کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد بلبلِ اسیر ہمصفیر سے کہتی ہے۔

"تجھ سے کہاں تک کہوں قصۂ دورِ دراز ہم اسی حیرت میں تھے آنے لگی اک دام دار
لے کے کوئی دامِ سخت آ گیا گلزار میں ہم جو ہیں اُڑنے لگے ہو گئے اُسکے شکار
آہ وہ آزادیاں راس نہ آئیں ہمیں عہدِ مسرّت مگر ہم سے نہ تھا اُستوار
اسکو ہوئیں مدتیں ہم ہیں اسیرِ قفس اب ہیں نہ وہ چہچہے اور نہ باغ و بہار
سامنے ہے یہ قفس اور یہی تیلیاں ہے یہی آب و ہوا اور یہی لیل و نہار
قید میں گذری ہے عمر چھوٹنے سے یاس ہے مرگ کی ہے آرزو موت کا ہے انتظار
آہ کہ طبعِ چمن ہم سے موافق نہ تھی آہ مزاجِ بہار ہم سے نہ تھا ساز دار"

پابندیٔ وقت اور وضعداری

ایک صاحب جو پُرانی وضعداری کے شیدائی تھے۔ یہ سمجھ کر کہ اسے انگریزی تعلیم کا زہر
مُ چڑھا ہے مجھ کو الگ لیجا کر نہایت خلوص نیّت سے نصیحت کرنے لگے۔ گو اُنہوں نے
اثنائے تقریر میں مجھے بولنے نہیں دیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہر فقرہ میں اُنہوں نے اپنی
ساری عمر کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور مجھ سے اپنے معاملہ فہمی کی داد چاہتے ہیں۔
پہلے دو چار کلمات شفقت آمیز اس خاکسار کی نسبت خاص تھے۔ اور باقی عام نصیحت تھی۔
جو میں نقل کرتا ہوں :-

بزرگ:- ..... خدا نہ کرے کہ ہماری حالت بدلے۔ ورنہ دیسی بھائی تو یکے بعد دیگرے
انگریزوں کی ہی رسموں کے شیدائی بنتے جاتے ہیں۔ اور تو اور اب جہاں دیکھو پابندیٔ
وقت کا گیت گایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وقت عزیز چیز ہے۔ مگر موقعہ بے موقعہ
وقت ہی وقت پکارنا بالکل خلافِ وضعداری ہے۔ یہ تو محض بزرگوں کی دُعا ہی کہ نرالی باتیں
رواج نہیں پاتیں۔ ورنہ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بے انتہا پابندی وقت
سے ہمارے مُلک کا ستیاناس ہو جاتا۔ اچھا انگریز جو دیسیوں کی قدر نہیں کرتے اسکی
وجہ بھی معلوم ہی؟ اسکا سبب یہ ہے کہ اوّل تو ہر کس و ناکس ولایت چلا جاتا ہے۔ دوسرے
جو وہاں جاتے ہیں سب وہاں کی رسمیں اختیار کر لیتے ہیں۔ انگریز اس بات کو ہرگز پسند
نہیں کرتے۔ اگر انکو یہ منظور ہوتا تو وُہ یہاں آکر ہماری رسمیں کیوں نہ اختیار کر لیتے؟
بھلا کسی لاٹ صاحب کو بھی سُنا ہے کہ اُسنے شعر کہے ہوں یا کبوتر بازی کی ہو یا اور کوئی
امیرانہ سامان رکھا ہو؟ ہرگز نہیں۔ انکے ہاں دربار کا دستور ہی نہیں اور گو یہ شاہی شان و
شوکت پر جان و دل سے فدا ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے بزرگوں کی وقعت اِنکے دل میں بہت

بُلبُل کی صفات

بلبل کی عادات اور طرزِ زندگی کی نسبت جو کچھ ہمارے شعرا لکھتے ہیں اور اُسکے تعلقات کی بابت جو کچھ خیال کرتے ہیں اُسکے کافی نمونے مذکور ہو چکے - زیادہ طُول دینا ضروری نہیں -

آخر میں یہ بھی ایک دلچسپ بات ہی کہ ہمارے شعرا بلبل کا ذکر کرتے ہُوئے اُس کے نام کے ساتھ کیا کیا صفات لگاتے ہیں - ان صفت کے بعض نمونے یہ ہیں -

بُلبُلِ شیدا - ع کیا نصیبا تُرا اَے بلبلِ شیدا اُلٹا -

بُلبُلِ نالاں - ع کرگئی بلبلِ نالاں جو حشر میں فریاد - (رسید)

عندلیبِ نالاں - ؎ تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کسکو + اِی عندلیبِ نالاں تو نے یہ گل کھلایا - (حالی)

بُلبُلِ بے برگ و نوا - ؎ آپہنچی خزاں فصلِ گل آ کے ہوئی - تو بھی + منقار کرا ای بلبلِ بے برگ و نوا بند - (نسیم)

عندلیبِ زار - ؎ فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل + یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پُوچھ - (حالی)

بُلبُلِ زار - ؎ جو چمن سے گذرے تو اِی صبا یہ کہنا بلبلِ زار سے + کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگانا دل تو بہار سے

اِن صفات پر نظر کرکے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بلبل شاد ہی یا غمگین ؟ اسکا جواب ہمارے شعرا کے خیالات کے موافق تو آسان ہی ہی - یعنی چونکہ ہمارے شعرا ادھر تو عشق کے تمام مرحلوں اور اُس کی سب حالتوں کو غم و رنج دقت و مصیبت سے پُر تصوّر کرتے ہیں - اور خوشی کو عاشق کے لیئے ناشاد بلکہ معدوم خیال کرتے ہیں - اور اُدھر بلبل کو عاشق مزاج ظاہر کرتے ہیں اسلیئے فتوی بلبل کے بالطبع غمگین ہونے پر ہونا چاہیئے - اور واقع میں بھی اگر بلبل ورحا عاشق ہی تو اُسکا خوش رہنا معلوم - ؎

چین وصلت میں نہ فرقت میں - عجب جنجال ہی!
کاوِ کاوِ عشق سے ہُوں سخت اُکتایا ہوا !

(نیرنگ)

کے ساتھ آتے تو ہرگز اُنکے اعزاز میں فرق نہ آتا۔

مگر اسی وقت بائیں طرف سے ایسی آواز کان میں آئی کہ معًا میرا دل غصّہ اور افسوس سے بھر گیا۔ مُڑ کر دیکھا تو شاہ صاحب اور خانصاحب کی آپس میں کچھ چشمک تھی) آئے تھے اور انکو چھوٹتے ہی کسی نے یہ کہا" واہ حضرت۔ آپ نے وقت کا کچھ تو خیال رکھا ہوتا۔ معلوم نہیں شاہ صاحب نے کیا جواب دیا مگر کم ازکم میری طبیعت اُسوقت سے بہت ہی پژمردہ رہی۔ اوّل تو اگلے وقتوں میں اتنا پاسِ ادب تھا کہ بفرضِ محال کوئی دیر میں بھی آئے اور پھر اُسکا ذکر کرنا بھی منظور ہو۔ تو گفتگو اس طرح ہوتی تھی" آئیے آئیے مزاج شریف۔ حضرت آپکا تو بہت ہی انتظار تھا۔ خیر باشد۔ بڑے شاہ صاحب نہیں آئے؟ جی ہاں شاہ صاحب شائد آجائیں۔ جو کچھ کہ اُنھوں نے دیکھا ہے۔ آجکل صحبتوں میں وُہ رنگ کہاں"۔ بات طے ہوئی۔ نہ یہ کہ یا وقت پر آؤ یا وقت پر اطلاع بھیجو۔

دوسری بات یہ ہے کہ شاہ صاحب یا خانصاحب جیسے آدمی کو کہنا کہ آپ دیر سے آئے ازالہ حیثیتِ عُرفی سے کم نہیں۔ وُہ کسی کے نوکر نہیں۔ انکی بلا وقت پر تشریف لائے امیر آدمی ٹھہرے۔ دس بیس مصاحب ساتھ چلتے ہیں۔ راہ میں علیک سلیک ملنا جُلنا دیر ہوئی تو ہونے دو۔ دوست کے گھر جانا ہے۔ دفتر میں تو نہیں جانا۔ ایک انگریزی خواں ہیں کہ سرکاری ہرکارے کی طرح بگٹٹ جارہے ہیں۔ ماشاء اللہ کیا تیز ہے!

بعض جگہ صاحبِ خانہ کو پابندیِ وقت کا جنون ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اگر عمائدِ شہر کا انتظار کریں تو کھانا ٹھنڈا اور بدمزہ ہوجاتا ہے اور اگر نہ کریں تو مفت کی بدنامی۔ سو بھئی ہماری یہی نصیحت ہے کہ ہر ملکے وہر رسمے۔ پابندیِ وقت کچھ سردملک والوں کو ہی موافق آتی ہے۔ آخر ہمارے بزرگ بھی بیوقوف تو نہ تھے .....

مَیں۔ سچ ہے۔ مگر اولاد ضرور بیوقوف چھوڑ گئے ہیں +

(عبدالعزیز)

موجود ہے اسواسطے یہ اُنکی چیزوں کو نہیں چھیڑتے۔ اگر ہمارے ہاں سے کبھی صرف
رئیس لوگ ولائت جائیں اور وہاں نوابی ٹھاٹھ سے رہیں اور بادشاہ سلامت کی خدمت
میں کبھی نہ کبھی سلام کو حاضر ہوں تو قسم ہے کہ کوئی نہ کوئی صوبہ دے ہی دے۔ مگر جو لوگ
انگلستان جاتے ہیں سب وہاں کی تعلیم کو وہاں کا بادشاہ تصوّر کرکے اس سے ربط بڑھاتے
ہیں اور پابندیِ وقت اور محنت وغیرہ کے خیالات سے آبا کی وضعداری پر دھبا لگاتے
ہیں۔ اب بھی ہندوستان میں سیکڑوں مثالیں ایسی ہر روز دیکھنے میں آتی ہیں جن سے
پابندیِ وقت کے نقصان صریح ظاہر ہوتے ہیں۔ میری رائے میں اب بھی کچھ نہیں گیا
اگر ہم لوگ سنبھل جائیں + چند روز ہوئے کہ میں ایک دعوت میں گیا۔ میں مقرّرہ وقت
سے کوئی آدھ گھنٹہ بعد پہنچا۔ مگر یہ بھی اِس خیال سے کہ صاحبِ خانہ میرے خاص رفیق
تھے۔ کچھ انتظام میں مدد دُوں میں نے جاکر دیکھا کہ صاحبِ خانہ تو الگ کھانا پکوا رہے ہیں معزز
مہمان تو ابھی آئے نہ تھے۔ البتّہ چند معمولی اہلِ محلہ بیٹھے تھے۔ ایک طرف کو ایک سفید پوش
علیحدہ بیٹھے نظر آئے۔ پوچھا کون صاحب ہیں۔ میرے دوست نے مُسکرا کر جواب دیا ایک
نئے زمانے کے پڑھے ہوئے بی۔ اے پاس کردہ ہیں۔ اور بیچارے پابندیٔ وقت کے گرفتار
پُورے آدھ گھنٹہ سے آئے ہوئے ہیں۔ مجھ کو یہ دیکھ کر بہت ہی رنج ہوا کہ گو یہ نوجوان
نہائت اعلیٰ خاندان سے تھے اور تعظیم کے مستحق تھے۔ مگر وہاں اس کس مپرسی میں صرف
اپنے ہاں کی مجالس کے دستور نہ جاننے کے سبب بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ پرلی طرف
تو یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کیوں میاں یہ تعلیم پاکر بھوکے بھی ہو گئے ہیں کہ ایسی سویرے
گھر سے نکل پڑے۔ اِس دعوت میں صاحبِ خانہ نہائت تمیز والا آدمی تھا اور اُس نے
ایک ایک کا انتظار کیا۔ اتنے عرصہ میں محفل کا وُہ رنگ جما کہ سبحان اللہ۔ آخر میں خانصاحب
اور میرزا صاحب جو کہ معززینِ شہر میں تھے تشریف لائے۔ سب نے اُٹھ کر تعظیم کی۔ مزاج
پرسی کی۔ اور جگہ جو رُک چکی تھی وُہ خالی کی گئی۔ وُہ حضرت بی۔ اے بھی اگر برابر والوں

اب محفل کے بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے - جو ندامت اسوقت اس بزرگ کو ہوئی ہوگی وُہ ظاہر ہے -

مگر پیشتر اس کے کہ گالیوں کے اخلاقی پہلو کو لیں ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ان کا ماخذ کیا ہو - انسان کے تمام افعال کسی نہ کسی علت سے خالی نہیں ہوتے اور ہر ایک رسم و عادت کی کوئی ابتدا ہوتی ہو اور کوئی خاص ضرورت اُسکا مُوجب ہوتی ہو - قیاس یہ کہتا ہے کہ جوں جوں انسان کے باہمی تعلقات بڑھے اور تمدن نے ترقی کی - اسی قدر زبان ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اسلئے کہ انسانی تعلقات کا سب سے بڑا آلہ زبان ہی ہے - پھر تعلقات کے بڑھنے سے محبت اور نفرت بھی بڑھنے لگی - اب یہ بات لازمی تھی کہ محبت اور نفرت کا اثر زبان پر پڑے - پس محبت نے وُہ تمام الفاظ پیدا کئے جو دُعاؤں میں - تہنیتوں میں - تعریف میں کہے جاتے ہیں اور نفرت نے تمام گالیاں - بد دُعائیں اور تذلیل و مذمت کے کلمات کو ایجاد کیا اور پھر مختلف حالات - زبانوں - مختلف طبیعتوں اور موقعوں نے اُن میں اس قدر گوناگونی اور کثرت پیدا کر دی کہ آج اگر کُل دُنیا کی صرف گالیوں کی ایک لُغت بنائی جائے تو اُمید ہے کہ ایک نہایت ضخیم کتاب بنجائے -

گالیوں کا امتحان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہو کہ بہت قسم کی ہوتی ہیں بعض دھمکیاں ہوتی ہیں جو ایک انسان کے دوسرے پر غالب ہونیکا اظہار کرتی ہیں - بعض بد دُعائیں جو بولنے والے کی اپنی عاجزی ظاہر کرتی ہیں - مگر اُسکے دِل کی خواہش کو بتاتی ہیں کہ اگر اسکے اختیار میں ہو یا خُدائی طاقت اُسکے پاس ہو تو وُہ اس طرح مخالف کو نقصان پہنچائے - انسان پر بعض اوقات انکا بڑا اثر ہوتا ہے اور دُکھے ہُوئے دِل کی بد دُعا نہایت خوفناک سمجھی جاتی ہو - شُعرا نے اس خیال کو کئی طرح سے ظاہر کیا -

منجنیق آہ مظلوماں بہ صبح　　　　سخت گیرد ظالماں را در حصار

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دُعا کردن　　　　اجابت از در حق بہر استقبال مے آید

گالیاں

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ گالیاں بھی انسان کے کلام میں ایک جزو ہیں بہت کم لوگ ہیں جو اُن سے بالکل پرہیز کرتے ہیں - کوئی نہ کوئی گالی ہر شخص کی زبان پر غصہ کے وقت آجاتی ہے - بعض نہایت شریف اور متقی لوگ جو عام طور پر گالی کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کسی وقت غصہ کے مارے بیتاب ہو کر کسی کی شان میں تبرا بازی کرتے ہیں مگر صرف اُسی حالت میں کہ انہیں اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا - وجہ یہ ہے کہ گالی دینے کی عادت اُسوقت پڑجاتی ہے جب انسان نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا اور نہ اپنی عزت و وقار کا چنداں خیال ہوتا ہے -

سب لوگ ایک قسم کی گالیاں نہیں دیتے - رذیل بازاری لوگ جو فحش اور غلیظ گالیاں بکتے ہیں شریف وہ الفاظ کبھی نہیں مُنہہ سے نکال سکتے - ہاں ہر سوسائٹی میں بعض لوگ ایسے ضرور ملینگے جو مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور خود بھی معزز ہوتے ہیں مگر جب وہ گھر میں آتے یا ایسے لوگوں میں جاتے ہیں جن سے انکی نہایت بے تکلفی ہو یا جو اُن سے ادنےٰ ہوں تو وُہ ایسے ایسے کلمات کہہ ڈالتے ہیں کہ انکی نسبت اُنکے مہذب دوست کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتے - مگر عادت ایک ایسی چیز ہے کہ انسان پر کبھی نہ کبھی غلبہ پا ہی لیتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شائستہ سوسائٹی میں کسی وقت اُنکے منہہ سے ایسا لفظ نکل جاتا ہے کہ اُنکو شرمندہ ہونا پڑتا ہے - مَیں نے ایک دفعہ دیکھا کہ ایک بہت بڑے تعلیمی جلسہ میں جہاں مُلک کے برگزیدہ لوگ جمع تھے اور ایک صاحب کسی خاص مضمون پر نہایت جوش کے ساتھ تقریر کر رہے تھے کہ اُنکے منہہ سے بے تکلف ایک نہایت غیر مہذب لفظ نکل گیا - جو معلوم ہوتا ہے کہ معمولی بول چال میں اُنکا تکیہ کلام تھا - چنانچہ تمام لوگ باوجود

تصدیق کرتا ہے تو وُہ دیکھے گا کہ وُہ ایک محض عبث فعل کر رہا ہے اور ہوا کو ناحق صدمات پہنچا رہا ہے۔ بارہا جسے صلواتیں سُنائی جاتی ہیں وُہ موجُود نہیں ہوتا بلکہ کوئی فردِ بشر بھی پاس نہیں ہوتا مگر دِل کا غصّہ ہے کہ آواز کی سینکڑوں شکلیں اختیار کر کے نکل رہا ہے اور کہنے والے کے اپنے کانوں کو ہی اُسکا مزہ آرہا ہے۔

کون شخص ہے جسنے سڑک پر چلتے گاڑیبانوں اور چھکڑے والوں کو اپنے گھوڑوں یا بیلوں کو ہزار ہزار گالیاں دیتے نہیں سُنا۔ کبھی اُس حیوان کی ماں اور کبھی اُس کی بہن معرضِ عتاب میں آرہی ہے اور کبھی اُسکے پہلے مالک اور بیچنے والوں کی تواضع کی جارہی ہے۔ بعض لوگ جب کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں اور اُس میں کوئی مشکل پیش آجاتی ہے مثلاً کیل گاڑنے یا دھاگے کی گانٹھیں کھولنے یا برسات کے باعث سخت ہوئے ہُوئے قفل یا کواڑ کھولنے میں دقّت ہوتی ہے تو جب تک وُہ کام نہ ہو جائے متواتر گالیاں دیئے جاتے ہیں۔

بعض دیوانے یا مخمور لوگ یُوں ہی مغلظات بکتے ہیں جو اُنکے دیوانہ پن یا حالتِ نشہ کے کرشمے ہوتے ہیں اور نفس کی ناپاکی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہمارے مُلک میں جُہلا جب خوشی میں آتے ہیں تو تفریحًا ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہولیوں کا تہوار جو یہاں ایک مشہور تہوار ہے اور موسمِ بہار میں آتا ہے اور اہلِ ہنُود اُس میں بہت خوشیاں مناتے ہیں اس میں ادنےٰ بازاری لوگ صرف دِل لگی کے لئے ایک دُوسرے کو گالیاں نکالتے ہیں۔ بچّوں کو نئی سے نئی گالی سکھائی جاتی ہے جو دوکانوں پر بیٹھ کر ہمسائہ دوکان والوں کو جن سے بے تکلفی ہوتی ہے گالیاں دیتے ہیں اور اس ذریعہ سے قلب کا خُوب دِل کھول کر لین دین ہوتا ہے۔ انہی دنوں میں بازاروں میں نوجوانوں کے بڑے بڑے گروہ ایک جگہ جمع ہو کر کسی خاص شخص پر آوازے کستے ہیں جو اپنے کوٹھے پر بیٹھا اُنکا جواب دیتا ہے ایک ایک گالی کو نہایت بلند آواز سے سو سو دفعہ دُہرایا

بعض صرف دوسرے کی مذمت ظاہر کرتی ہیں اور بولنے والا دوسرے شخص کی نسبت بری رائے کا اظہار کرتا ہے۔

گالیوں کی نسبت یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر مختلف قسم کی گالیوں کے الفاظ کے موضوع کی بابت سوچا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ وہ انسان کی مختلف حالتوں پر اثر ڈالتی ہیں اور جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اس کی گالی سب سے زیادہ صدمہ پہنچانیوالی ہوتی ہے۔ اور دل کو کڑوی لگتی ہے۔ مثلاً مستورات کے حیا کا پاس ہر شخص کو بدرجۂ غائت ہوتا ہے اور انسانی غیرت کا یہی تقاضا ہے۔ اسلئے سب سے غلیظ گالیاں وہ ہیں جو اس غیرت پر حملہ کرتی ہیں اور ایک شریف آدمی کے لئے کوئی بات اس سے زیادہ دل دکھانے والی نہیں ہوسکتی جس قدر کوئی ایسی گالی جو اسکے گھر کے پردۂ عصمت کو ہدف بنائے۔ بعض گالیاں ایسی ہیں جن میں خراب پیشوں۔ بیحیائی اور بیعزتی کی عادتوں سے نسبت دیجاتی ہے۔

ان سے اتر کر وہ گالیاں ہیں جنمیں انسان کو ناپاک اور ادنے حیوانوں سے تشبیہہ دیجاتی ہے۔ اور نسبتاً بھلے مانس لوگ عموماً ایسی ہی گالیاں طیش کے وقت بچوں یا نوکروں چاکروں کی تنبیہہ کے لئے بولتے ہیں۔ بد دعاؤں میں یا تو مخاطب کی اپنی یا اسکے عزیزوں کی مسرت چاہتے ہیں یا انکے لئے کوئی سخت بیماری یا مصیبت تجویز کی جاتی ہے۔

مگر سب قسم کی گالیوں میں ایک بات ظاہر ہے کہ شاذ انسان کا کوئی فعل اسقدر بے سوچے سمجھے اور بے معنے نہیں ہوتا جسقدر کہ گالیاں۔ ایک شخص دوسرے کو ہزار گالیاں دے ڈالتا ہے جنمیں دھمکیاں بھی ہوتی ہیں۔ بد دعائیں بھی اور مذمتیں بھی مگر سب سے نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ بولنے والا اس سے خفا ہے اور اسوقت اسکا غصہ مشتعل ہے۔ بسا اوقات گالیاں دینے والا اس شخص کا جسے گالیاں ملتی ہیں دنیا میں سب سے بڑا خیر خواہ ہوتا ہے اور اگر وہ

[illegible]

...ر رکھتے ہیں اور جس وقت یہ الفاظ کہے جاتے ہیں ۔ باقی تمام حرکات نہایت ہی مہربانی
...ر نابرداری کی ہوتے ہیں ۔ مگر یہ نتیجہ ہے ۔ اہل ہندوستان کے اُس غلط اور
...د غرضی کے خیال کا جس سے انہوں نے اپنے آپ کو اناث سے اس قدر بلند پایہ
...ور انکا حاکم مطلق سمجھ رکھا ہے اور اُن پر طرح طرح کی غلامی کی قیدیں لگا رکھی ہیں
جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں ۔ اور جو اصلاحِ نفس اور اصلاح
...نا ئے جنس کے خواہاں ہیں ۔ انہیں گالیوں سے قطعی پرہیز کرنا چاہئے ۔ زبان ہی
...نسان کی تہذیب کا پہلا معیار ہے اور گفتار کا اثر انسان کے افعال اور اخلاق پر ہوتا ہے
...بھی کوئی شخص مہذب نہیں بن سکتا جب تک اُس کی زبان مہذب نہ ہو ۔ گالیاں
بے تہذیبی کا نشان ہیں اور بے تہذیبی کی یادگار ہیں اور ہر ایک شخص کو کوشش کرنا
چاہئے کہ وُہ ان سے احتراز کرے اور اپنی اولاد کو ایسے لوگوں کی ہمنشینی سے
بچائے جو دُشنام دہی کے عادی ہیں ۔ گالیوں کی عادت نہ صرف انسان کو اخلاقی
اور رُوحانی اصلاح سے باز رکھتی ہے بلکہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے ناقابل کر دیتی
ہے اور خود داری اور غیرت کا مادہ دُور کر دیتی ہے ۔ اس لئے کہ جو دُوسروں کو بُرا
کہتا ہے وُہ سُنتا بھی ضرور ہے ۔ (بقولِ شاعر)

دہنِ خویش بہ دشنام میالائے صائب
کیں زرِ قلب بہر کس کہ دہی باز دہد

عبدالرشید چشتی

دیوانِ نظام ۔ ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرتِ نظام کا دیوان جسکا مختصر حال گذشتہ پرچہ میں مسٹر
حامد علی خانصاحب بہادر نے تحریر فرمایا ہے ۔ چھپا ہوا ہے ۔ اور مطبع نیر اعظم مراد آباد سے مل سکتا ہے +

جاتا ہے اِسی مشغلہ میں بعض اوقات ساری ساری رات گذر جاتی ہے جسے گالیاں دی جاتی ہیں
وُہ خاموش رہنا اپنی ہتک سمجھتا ہی اور ہرچند اُسکا گلا بیٹھ جاتا ہے اور اسکی آواز خستہ ہوجاتی
ہے اور بے خوابی کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے مگر وُہ یہ بے غیرتی ہرگز گوارا نہیں کرسکتا
کہ اُس سے گالیوں کا جواب بن نہیں پڑا۔ یہی حال بعض عورتوں کا ہی جنہوں نے زبانی لڑائی
کو بیکاری کا ایک مشغلہ قرار دے رکھا ہے۔ بعض بد زبان عورتوں نے خوشمزاجی میں اس
بات کا اقرار کیا ہے کہ لڑائی میں انہیں ایک قسم کا مزہ آتا ہے اور جب کئی دن تک وُہ کسی
سے دوبدو نہیں ہوتیں تو خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر لیتی ہیں بلکہ ایک خاص فرقہ کی عورتوں
کی نسبت مشہور ہے کہ جب اُنپر یہ جذبہ غالب آتا ہے تو وُہ اپنی ہمسائی کو بُلا کر لڑائی کی دعوت
کرتی ہیں اور اِس طرح ایک عظیم زبانی جنگ کی طرح ڈالدیتی ہیں۔ جو کئی کئی دن تک جاری
رہتی ہے۔ نئی نئی اور فی البدیہ گالیاں جو اُنکا حاضر جواب دماغ ایجاد کرتا ہے اُنکا دُور
دُور کے گھروں میں چرچا ہوتا ہے اور ہمچشموں میں بہت تعریف ہوتی ہے۔

ہمارے مُلک کی بعض اقوام میں بیاہ کے موقعہ پر جب دولہا والے برات لیکر آتے
ہیں تو دُلہن والے گھر کی عورتیں اپنے سمدھیوں کو اور برات والوں کو مقفّی گالیاں
دیتی ہیں جنہیں سِٹھنیاں کہتی ہیں۔ اکثر فُحش باتیں بے تکلفی سے کہی جاتی ہیں اور وُہ
عورتیں بھی جو عام طور پر بہت کم گو اور باحیا سمجھی جاتی ہیں اس رسم میں شامل ہوتی ہیں گویا
وہ خاص موقعہ اُن کو اِس قبیح رسم کی اجازت دے دیتا ہے اور اُنکے مرد بھی اِس سے
اغماض کرتے ہیں۔ بلکہ بعض خوش ہوتے ہیں۔

بے معنی گالیوں کے ذکر میں اُس مذموم عادت کا بیان کرنا شاید بیجا نہ ہوگا
جو بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگوں میں موجود ہے اور وُہ یہ ہے کہ چھوٹی لڑکیوں کو
پیار کے موقعہ پر ایسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے جو دراصل نہایت دِل دُکھانے والے
ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک عادت ہے اور اُنکے کہنے والے اُن لڑکیوں کو دِل سے

یہاں کی سرزمین کو سیراب اور مادہ قبول سے بہرہ ور پایا۔ اور انکی دعائے سحری کے اثر سے دنوں میں پنجاب بھی ایک ہرا بھرا گلزار ہوگیا۔ جس میں وہ آزادی سے نغمہ سنجی کرنے لگے۔ انہی خوش نواؤں میں آزاد بھی تھا۔ کئی اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے۔ مگر آزاد کو یہ باغ ایسا بھایا۔ کہ اسی کو اپنا نشیمن بنالیا۔ اور غربت کو جس میں امن نصیب ہو۔ آفت زدہ وطن پر جہاں کسی نہ کسی وبال کا سامنا رہتا تھا ترجیح دیکر یہیں کا ہو رہا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تمکو بے مہری یاران وطن یاد نہیں۔

گو دلی کو آزاد ... کے ... زاد و بوم ہونے کا فخر ہے۔ اور دلی کے اساتذہ کے زیر سایہ ہی آزاد نے تعلیم و تربیت پائی۔ مگر پنجاب سے بھی اُسے اب وہ گہرا تعلق ہے۔ کہ پنجاب کو بھی اُسکے وجود پر ناز کرنا چاہیے طوفان حوادث نے ہمارے طباع مصنف کے لئے اُستاد شفیق کا کام دیا۔ اور تجربہ کے مدرسہ میں اُس نے وہ وہ سبق سیکھے۔ جو طبع رسا کے سمند ناز کے لئے تازیانہ بن گئے۔ ذوقؔ جیسے اُستاد کی صحبت سنگ پارس کا حکم رکھتی تھی۔ اُس نے سونا کر کے کٹھالی سے نکالا۔ مگر یونیورسٹی کی ملازمت میں مشرقی علوم کے قدردان انگریزوں کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ سیر و سیاحت اور وسط ایشیا اور ایران کی مجالس نے اس زر خالص کو ایسا چمکایا۔ کہ اردو علم ادب میں آزاد کا کلام کندن کی طرح دمکنے لگا۔ قصص ہند میں وہ سادہ پرکاری دکھائی ہے کہ سبحان اللہ۔ مبتدی پڑھیں تو سب مطالب سمجھ میں آجائیں۔ منتہی پڑھیں تو شیرینی کلام کے چٹخارے لیں۔ نیرنگ خیال میں ایک یونانی طرز تحریر کا ایسا نمونہ اُڑا لیا ہے کہ یونانی یاد کریں کہ اُڑانے والے رنگ یوں اُڑا لیتے ہیں۔ الیگوری انگریزی میں یونانیوں کی تقلید سے کسی زمانہ میں بکثرت مروج رہی اور اب تک پسند کیجاتی ہے۔ اس میں بہت سے ضروری اور مفید مطالب کسی ایسے پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ جس کا ربط اُن مطالب سے بظاہر نہ معلوم ہو۔ مشرقی علم ادب کے

نظمِ آزاد

کچھ عرصہ ہوا شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے کلام منظوم کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا۔ نظمِ آزاد۔ جو قیدِ حسن و عشق سے آزاد ہے۔ مولوی آزاد نے جو رتبہ اُردو زبان کے اعلیٰ ترین مصنفوں میں پایا ہے محتاجِ بیان نہیں۔ تصنیفاتِ نظم کے میدان میں تو وہ معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ نظمِ جدید رنگ میں کچھ کچھ کہتے تھے اور طبیعت کی تیزی قیدِ حسن و عشق سے نکلکر بھی اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ اب ایک عرصہ سے اُردو علم ادب کی بدقسمتی نے ملک کو اُن کی دماغی خدمت سے محروم کر دیا ہے اور انکی مفید تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ انکی نثرِ موزوں کی اب صرف یاد باقی ہے۔ اور نظمِ آزاد کی فقط کہانی زبانوں پر ہے۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب پنجاب میں پہلے پہل تعلیم کا چرچا ہوا۔ اور لائٹنر صاحب مشہور جرمن عالم نے دار الخلافہ پنجاب میں دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اور اطراف و جوانب سے سخن دان اور سخن فہم لوگ جوہرِ سخن کی قدردانی دیکھ کر لاہور کیطرف جُھکے۔ انہیں یاد ہوگا۔ کہ جو مشاعرے انجمن پنجاب کے متعلق ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی سے ہوتے تھے اور جن میں مشتاقانِ سخن بلاقید مذہب و ملت جوق جوق آتے تھے۔ اُن میں گلشنِ ذوقِ دہلوی کا یہ عندلیب کس انداز سے چہکتا تھا۔ فصاحت اسکے کلام پر نثار ہوتی تھی۔ اور بلاغت اسکی طرزِ تحریر پر فدا تھی۔ دلی کے علوم و فنون کے باغ پر جب غدر کی خزاں آئی۔ اور کئی بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے۔ کئی پودے سوکھ گئے۔ کئی پھول کملا گئے اور کئی غنچے بن کھلے مرجھا گئے۔ تو چند مرغانِ چمن نے اس اُجڑے دیار سے کوچ کر کے خطۂ پنجاب کو آن بسایا۔ گو اس ملک میں وہ گل بوٹے جو انکے مایۂ زندگی تھے انہیں نظر نہ آتے تھے۔ تاہم انہوں نے

کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی نئے مذہب کا بانی ہونا چاہے۔ اور عجب نہیں اندنوں ایسے ہی خیالات مولانا کے دل میں جاگزین ہوں۔ دُوسرا نتیجہ اِن دنوں کی سرگرمی کا غزلیات ہیں۔ پُرانی مشق کی غزلیں جو کبھی کسی کو دکھاتے بھی نہ تھے۔ آجکل نکال نکال کر پڑھتے ہیں اور نئی غزلیں کہتے ہیں۔ علم قلب انسانی کے ماہر اِس بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے کہ علالت میں مولانا کی طبیعت نے مُدت کے بعد غزل کی طرف کیوں رجُوع کیا ہے۔ اِس میں تو شک نہیں کہ ابتدائی عُمر میں مولینا آزاد نے غزل گوئی میں خُوب زور مارا ہوگا گو جوانی میں ضروریات زمانہ کے احساس سے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا۔ اور زیادہ پُختہ کاری نے نثر کو ترقی دینے کی ضرورت سجھائی۔ لیکن جب اِس فکر سے فراغت ہوئی کہ ضروریات زمانہ کیا چاہتی ہیں۔ پھر وہی پُرانا رنگ غالب آیا۔ آجکل غزل گوئی مقبول مشاغل میں ہے۔ اور یہ مزے کی بات ہے کہ اِس میں کسی دماغی عارضہ کا اثر نظر نہیں آتا البتہ تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں اور بے پروائی سے رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی اُنکو لے جائے یا چھپوائے۔ چونکہ ہم اُن لوگوں میں ہیں جو انکے ہر قسم کے کلام کے ہر وقت مشتاق رہتے ہیں۔ اور ہمیں بہت سے احباب کا بھی حال معلوم ہے جو مولینا کے کلام کو نہایت شوق اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسلئے ہم نے یہ گستاخانہ کوشش کی ہے۔ کہ ہم مولینا کی غزلیات کچھ نئی کچھ پُرانی اپنے ناظرین کے لئے حاصل کریں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دستِ شوق کی یہ گستاخی مولینا بھی قابلِ معافی سمجھینگے اور کبھی کبھی شائقین کو اپنے کلام سے مستفید ہونے کا موقعہ دینگے۔ ہمارے مہربان آغا محمد ابراہیم صاحب جو مولینا کے فرزند رشید ہیں۔ اِن غزلوں کے ہم پہنچانے کے لئے خاص شکریہ کے مستحق ہیں:-

غزلیاتِ آزاد

اِس دلِ پُرداغ سا گلشن میں اِک لالہ تو ہو ۔۔۔ پر یہ گُل جیسا ہے کوئی دیکھنے والا تو ہو

ذخیروں میں تو مذہبی کُتب میں اس کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اور مولانا رُوم فارسی لکھنے والوں میں اس طرز کے بادشاہ ہیں۔ مگر جو وسعت مغربی مصنّفوں نے اس کو دی ہے۔ اور جس حد تک انہوں نے استعاروں کو پھیلا کر طویل کہانیاں بنائی ہیں۔ اسکے نمونے ایشیائی تصنیفات میں کمیاب ہیں۔ اِسی سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاں اِس کے لئے ایک لفظ تلاش کریں تو مشکل سے پائیں۔ ہاں یہ شعر اس کا مفہوم خُوب ادا کرتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مگر اُردو میں یہ رنگِ خیال نہایت عُمدہ اور نہایت کامیاب ایلیگوری ہے۔ آبِ حیات میں آزاد نے دریا کوزہ میں بند کیا ہے۔ اور زبانِ اُردو کے اُستادوں کے کلام پر اپنے عبُور اور اُنکے حالات کی نسبت اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہُوئی ہے۔ اور کئی دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک چُکی ہے۔

دربار اکبری کے نورتن اگرچہ آزاد کے زمانۂ علالت میں مولوی ممتاز علی صاحب کی کوشش سے چھپے ہیں۔ مگر انہیں آزاد نے دربار میں اپنی صحت کے دنوں میں اپنے ہاتھوں سے ہی بٹھایا تھا۔ دیوان ذوق جہانتک مکمل دستیاب ہو سکا مع تمہیدوں اور حواشی کے چھپوا کر ذوق کا حق اُستادی ادا کیا گیا ہے۔ اور جو چھوٹی چھوٹی درسی تالیفات آزاد کیا اُردو کیا فارسی مُلک بھر میں مروّج ہیں۔ وُہ اِنکے علاوہ ہیں۔

گو عارضۂ دماغی نے آزاد کے فیضان سے مُلک کو محروم کر دیا۔ مگر یہ ایک طرفہ تماشا ہے کہ مولانا کا کام کا عادی دماغ علالت میں بھی بے کار نہیں رہ سکا۔ اور اشہبِ قلم صفحۂ کاغذ پر برابر گھوڑ دَوڑ کرتا رہا۔ اِس دَوڑ دھوپ کا ایک نتیجہ تو کتاب سپاک نماک ہے جو مطبع رفاہِ عام۔ لاہور نے ایک اعجوبہ کے طور پر چھاپی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دُوسرے دماغوں کی بیماری سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ وُہ کتاب کسی ایسے شخص

صنم ہے گردش عالم بجا ہے پھیرے تیری اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

خدا کے واسطے آزاد رو کو نالۂ دل کو

کہ کوئی آن میں کون و مکاں بے لامکاں ہوتا

یہ سیکھا کہاں سے تو نے یہ طرز ستم ایجاد کی ہجوم ہے بیداد گر ہر سو تری بیداد کی

پوچھتا حالت ہو کیا ہے دل ناشاد کی آہ کی ہمت نہیں طاقت نہیں فریاد کی

دل ہے سوز دل کہ ہر بوند لہو کی بوند کے آبلہ آتا زباں پر نشتر فصاد کی

آب داری کے لئے محتاج خاکستر ہوا شکست آئینہ نے اپنی آبرو برباد کی

آرزو حسرت ہے یہ کس کا کہ یہ دل اب تلک جوئے اشک آنکھوں سے جاری ہے پئے امداد کی

سرو ساں زنجیر الفت سے ہے پابند چمن

نام کو آزاد ہے حالت ہے یہ آزاد کی

غیر دیدار صنم گر ہو سروکار مجھے تو میسر نہ ہو اللہ کا دیدار مجھے

تیری الفت نے کیا جیتے جی ہجر مجھے جان سے کھوتا ہے پیارے یہ ترا پیار مجھے

دیتے کیا کیا ہیں دوا سے شب فرقت میں ہم دل بیمار کو میں اور دل بیمار مجھے

حق خدمت میں ملے دیکھیے کیا حضرت شاہ کہ ہے قسمت میں تری عشق کی سرکار مجھے

دیکھنا قید تعلق میں نہ آنا آزاد

دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنار مجھے

آفریں ہمت کو اس کے بدلے کا جیتے جی تو ہے | [illegible] ایسا جگر والا تو ہو
ہم تو قیس و کوہکن کے بھی تماشے دیکھ چکے | لیلیٰ و شیریں سا کوئی دیکھنے والا تو ہو
ایک ہی ساغر میں کچھ ایسا [illegible] | [illegible] سے تیرا متوالا تو ہو
ہاتھ خالی مردم دیدہ بتوں سے [illegible] | [illegible] مژگاں میں ایک مالا تو ہو
ناخن خار آ کے خود عقدہ ترا [illegible] | [illegible] شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

کچھ نہ کچھ آزاد کو بھی چاہئے دل بستگی
گر نہ [illegible] تو ہو

مثالِ ابرِ کرم فیض عام کرتے ہیں | [illegible] جو خوب کام کرتے ہیں
کیونکہ اہلِ کرم ہوویں کامیاب جہاں | [illegible] جو کرتے وہ کام کرتے ہیں
ہزاروں قافلے حسرت کے دشتِ غربت ہیں | ہمارے خانۂ دل میں مقام کرتے ہیں
دلوں میں کرتے جو الفت سے ہیں جہانداری | جہاں کو ایک نظر میں غلام کرتے ہیں
ہیں اہلِ دل ابھی زندہ کہ ذکرِ خیر ان کے | دلوں سے آ کے سلام و پیام کرتے ہیں

دکھا کے سبزۂ جنت کے باغ سبز آزاد
غزالِ نفس رمیدہ کو رام کرتے ہیں

جو نالوں سے مرے دل کے تہ و بالا جہاں ہوتا | تو پھر نیچے زمیں ہوتی نہ اوپر آسماں ہوتا
بلا سے دشمنِ جانی مرا سارا جہاں ہوتا | کسی صورت سے اے جانِ جہاں تو جانِ جاں ہوتا
تمہارے بیدلوں کی خاک اگر صرفِ چمن ہوتی | تو ہر اک شاخِ گل پہ جائے غنچہ گل عیاں ہوتا
جو کوئی چوٹ دل کی ساتھ تیشے کے اثر کرتی | تو جائے آب ہر چشمہ سے شیریں خوں رواں ہوتا
دلِ نالاں جرس کی طرح آ جاتا ہے جنبش میں | رواں سینے سے جب ہے آنسوؤں کا کارواں ہوتا

چھوٹے تنگ و تاریک کمروں میں رہیں جہاں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت اچھی طرح نہیں ہوا ور انہیں کمروں میں دن رات کا بہت سا حصہ صرف کریں تو خالص ہوا کس طرح میسّر ہو سکتی ہے؟ اس طرح خالص ہوا کا ملنا ناممکن ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہوا کثیف ہو جائیگی۔ پھیپھڑے پھیلنے نہیں پائینگے۔ دل کی حرکت سست ہو جائیگی۔ خون صاف نہیں ہو گا۔ اور جسم کو ٹھیک ٹھیک غذا پہنچنی بند ہو جائیگی۔ خصوصًا طالب علموں کی حالت بہت قابل اصلاح ہے۔ گھٹ گھٹا کر میز کے پاس بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں یا کتاب کو جھک کر پڑھتے رہتے ہیں۔ اس سے سینہ رُکا سا رہتا ہے۔ اور پھیپھڑے پھیلنے نہیں پاتے۔ اس صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ طلبہ کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور انہیں کمزوری ہو جاتی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ جسقدر سخت خرابیاں پیدا ہونی چاہئیں اُن سے بہت کم وقوع میں آتی ہیں۔ ہر ایک کمرہ خصوصًا چھوٹا کمرہ خوب ہوا دار ہونا چاہیئے۔ اس کمرہ کے اردگرد صفائی ہونی۔ اور چاروں طرف کے مکانات اور کمرے اچھے ہوادار ہونے چاہئیں۔ اس کمرے کو وقتاً فوقتاً خالی کر دینا چاہیئے۔ اور اس میں کی ہر ایک چیز کو خوب ہوا دینی چاہیئے۔ اور خواہ طالبعلم ہو خواہ کوئی اور شخص ہو ہر ایک کا فرض ہے کہ باہر جائے اور زیادہ خالص ہوا میں دم لینے کے موقع کو ہاتھ سے نہ دے۔ اس کام میں نہ روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے اور نہ دام دینے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ مُنہہ ڈھانپ کر سونے کے عادی ہیں۔ اور جاڑوں میں سر سے پاؤں تک کمبل لپیٹ لپاٹ کر سو جاتے ہیں۔ یہ عادت بھی ضرور صحت کے لئے مضر ہے اگر کمبل اس لئے لپیٹتے ہیں کہ نتھنوں میں کسی قسم کی بدبو نہ جانے پائے تو بدبو کے باعث کو دُور کرنا چاہیئے۔ اگر یہ وجہ ہے کہ کیڑوں سے یا سردی سے بچیں تو اس کے لئے اور علاج ضروری ہیں۔ کیونکہ اس طرح آہستہ آہستہ اور نامعلوم طور پر زہر کھانا اور اس طرح جو اہم کام کرنا ہے اُسکے لئے بدن کو ناقابل کر لینا مذہب صحت کے رُو سے گناہ ہے۔ اور اس بارہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا فرض ہے کہ خالص ہوا کی ضرورت لوگوں کو جتائیں اور

صحت کی شرائط

(ترجمہ از مارل ریڈر۔ مولفہ ڈاکٹر ساٹھ صاحب بہادر)

یہ امر مسرت بخش ہے کہ تعلیمی اور ذہنی ترقی کی طرف طبیعتوں کی رغبت ہوتی جاتی ہے مگر ذہن پورا پورا جب ہی کام دیسکتا ہے کہ جسم کی خبرگیری پر کافی توجہ ہو۔ ہمیں لازم ہے کہ ہم اپنی جسمانی ساخت کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ ورنہ ہماری صحت ضرور خراب ہو جائیگی اور کمزوری طبیعت یا قوائے عقلیہ کے ضعف کی مصیبتوں میں مبتلا ہونگے لیکن ہم ٹھیک ٹھیک زندگی اسیوقت بسر کر سکتے ہیں جب ہمیں انسانی ساخت کا اور اُسکے مکمل رکھنے کے لیے ضروری شرائط کا کچھ علم ہو۔ ذیل میں ہم بعض نہایت ضروری شرائط درج کرتے ہیں۔ ہر ایک شرط کی ذیل میں جسقدر مناسب سمجھا گیا اُسقدر علی باتیں بھی سمجھائی گئی ہیں:۔

(۱) تازہ ہوا۔ جسقدر تازہ ہوا کا میسر ہونا صحت کے لئے ضروری ہے اِسسے زیادہ اور کوئی شے ایسی ضروری نہیں۔ جسم کی پرورش کے لئے ہوا ایسی ضروری ہے جیسے کہ غذا۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہوا غذا سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ غذا تو خاص خاص وقت پر ضروری ہوتی ہے اور تازہ ہوا ہر نفس پر جو برابر آتا رہتا ہے درکار ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جس ہوا میں ہم دم لیتے ہیں وہ خالص اور تازہ ہو۔ خالص ہوا سے خالص خون پیدا ہوتا ہے۔ اور غیر خالص یا کثیف ہوا ایسے زہر کا اثر رکھتی ہے جو چُپکے چُپکے اپنا کام کر رہا ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ آکسیجن جو ہوا کا ایک جُزو ہے خون کے صاف کرنے کا کام دیتا ہے اور ہوا میں جس قدر یہ جزو کم ہوگا اسیقدر ہوا انسان کے استعمال کے لئے کثیف اور نکمی ہوگی۔ لیکن اب یہ سوال ہے کہ اگر ہم چھوٹے

ہر ایک قسم کی غذا سے جسم نہایت اعلیٰ درجہ کی پرورش حاصل کرسکتا ہے۔ یورپ میں بعض نہایت
خوبصورت آدمیوں نے جو کی روٹی اور دودھ پر پرورش پائی ہے۔ شمالی ہند کی عمدہ
قومیں اب بھی زیادہ تر گیہوں جوار مکی باجرہ اور چاول پر گذارہ کرتی ہیں۔ افریقہ کا حبشی
اکثر جوار مکی اور چند نباتات کھا کر بڑا قدآور جوان ہو جاتا ہے۔ اور روما کا لڑنے والا سپاہی
نرے جو ہی کھا کر پلتا تھا۔ نباتی غذائیں سستی اور سیدھی سادی ہوتی ہیں اور ان میں
کسی قدر چربی اور مادہ بھی ہوتا ہے جو کھانے کی چیزیں ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نباتی
غذائیں جن میں کبھی کبھی نباتی چربی کے ساتھ گھی بھی ہو سیدھے سادے لوگوں کے لئے
نہایت موافق ہیں۔ شرب کی بات پوچھو تو سادہ پانی سے بہتر پینے کی چیز آج تک دریافت
نہیں ہوئی۔ شراب یا نشہ لانے والی چیزیں صحت کے لئے ضروری نہیں ہیں اور ان میں
اکثر ایسی ہیں جو نقصان دینے والی ہیں۔ جب تک آدمی تندرست ہے تو اُسے خواہ
کچھ ہی نشے کی چیز پلائی جائے وہ ضرور مضر ہوگی۔ اور یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے کہ جو
شخص صرف صاف پانی پی کر گذارا کرتے ہیں جو رحیم و کریم خدا نے ہمیں دیا ہے خود ایسے لوگ
ہیں جو بہت محنت کش ہیں اور دنیا میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

(ج) لباس مختلف موسموں کے لئے مناسب لباس رکھنے سے صحت میں بہت کچھ
ترقی ہو سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ لباس سے
اعصابی حرکتیں یا دوران خون بند ہو جائیگا۔ مگر ہر ایک شئے ڈھیلی ڈھالی ہونی چاہئے
اور یہ قاعدہ سر پیر اور جسم دونوں کے لئے ہے۔ کسی طرح کا کساؤ یا تنگی نہ ہونی چاہئے کیونکہ
اس سے قدرتی عمل اچھی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر پنجاب میں بعض موسموں میں خاص احتیاط درکار
ہے۔ جب سرما کا موسم قریب آتا ہے اُس وقت لوگ عموماً بہت ہلکا کپڑا پہنتے ہیں۔ سردی
لگ جاتی ہے۔ بخار ہو جاتا ہے اور الزام تبدیل موسم پر لگاتے ہیں۔ حالانکہ اکثر ہم خود اپنی
علالت کے بانی ہوتے ہیں۔ اوّل تو جو کپڑے ہم دن میں پہنتے ہیں صبح اور شام ان سے مختلف

عمدہ صحت کی نعمت اپنے ملک کے لوگوں میں پھیلائیں - ان باتوں کا خیال نہ رکھنے سے کسی ایسی چھوٹی موٹی چیز کو نقصان نہیں پہنچتا - بلکہ اس سے انسان کی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے -

(ب) اکل و شرب - غذا زندگی کے لئے ضروری ہے - غذا جسم انسانی کی کل کے لئے ایندھن کا کام دیتی ہے - اسی سے جسم کی حرارت قائم رہتی ہے - کافی عمدہ غذا کھانے سے صحت کو ترقی ہوتی ہے - جو غذا معدہ میں پہنچتی ہے اور قوت ہاضمہ جسے تیار کرتی ہے وہ خون میں چلی جاتی ہے - یا اسکا خون بن جاتا ہے - اور پھر دل کے ذریعہ جسم کے تمام حصوں میں پہنچ جاتی ہے - محنت سے جو نقصان جسمانی قوت میں ہو چکتا ہے - غذا اس کی تلافی کرتی - بلکہ قوت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی ہے - اس کے متعلق دو باتیں قابل لحاظ ہیں یعنی غذا کی کمیت اور کیفیت یا یوں کہیں کہ غذا کتنی ہو اور کیسی ہو - معدہ مقررہ وقت میں غذا کی خاص مقدار کو ہی ہضم کر سکتا ہے - اور اگر معدہ میں بہت کچھ بھر لیا ہے تو معدہ اپنا کام کرنا بالکل چھوڑ دیگا اور اگر کریگا تو بری طرح کریگا - جس سے بہت سی بیماریاں پیدا ہونگی - غنیمت ہے کہ اس امر میں صرف بھوک ہی کافی رہنما ہے اگر سیدھی سادی غذا کھائی جائے - یہ سوال بڑا ضروری ہے کہ خوراک نہایت عمدہ قسم کی ہو - ہمیں معلوم ہے کہ ہوا میں ایک قسم کا گاس جسے نائٹروجن کہتے ہیں - بہت کچھ موجود ہے - یہ شے مجسم شکل میں تمام زندہ جسموں میں ملتی ہے اور زندگی کا بڑا سہارا ہے - اب سوال یہ ہے کہ یہ نائٹروجن ہمارے جسموں کے اندر کس طرح چلا جاتا ہے - ہوا کے ذریعہ نہیں - اگرچہ بظاہر یہ نہایت قدرتی طریق معلوم ہوتا ہے - بلکہ نائٹروجن غذا کے ذریعہ جسم میں پہنچتا ہے - جس غذا میں یہ جزو ہوتا ہے اسے نائٹروجن والی غذا کہتے ہیں - اور عمدہ غذائیں وہ ہیں جنمیں اس جزو کی مقدار اچھی ہو - ایک دفعہ اسپر بہت کچھ بحث ہوئی تھی کہ آیا نباتی غذائیں زیادہ نائٹروجن والی ہیں یا لحمی غذائیں - اصل تو یہ ہے کہ ان دونو قسم کی غذاؤں میں یہ جزو موجود ہے - اور ان میں سے

شخص ہو کر نکلو گے۔ یہ بیرونی پاکیزگی آدمی کی روح پر بھی پرتو ڈالتی ہے۔ اور بیرونی صفائی سے
میلان نیک چیزوں اور نیک کاموں کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔

(۵) ورزش جسم کا نشو و نما اور اسکی صحت ورزش پر موقوف ہے۔ ہر رگ اور پٹھے اور ہڈی کی نسبت
ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب ورزش ہی سے مکمل ہوتے ہیں۔ خواہ امیر خواہ غریب ہر ایک کی زندگی صرف
کام کرنے کی زندگی ہے یا یہ کہو کہ زندگی کیا ہے کام کرنے کی طاقت ہے۔ اور کسی انسان کی اصلی طاقت
اور جوہر اسکے کام کرنے کی طاقت سے اندازہ کئے جا سکتے ہیں۔ ماسوا اسکے خود کام کرنے کی طاقت
بشرطیکہ حد سے زیادہ زور نہ ڈالا جاوے۔ اور زیادہ طاقت کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور اس لئے
ترقی اور مضبوطی کا باعث ہے۔ پروفیسر بلیکی صاحب فرماتے ہیں۔ طالب علم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ
کرسی پر بیٹھا رہے میز پر جھک کر کام کرتا رہے اور کتاب کا غور سے مطالعہ کرتا رہے تو ممکن نہیں کہ
اس طریقہ سے اسکا جسم نشو و نما پائے۔ ورزش ہی سے خون گردش کر سکتا ہے اور رگیں اور پٹھے
آزادی سے حرکت کر سکتے ہیں۔ اگر ورزش نہ کی جاوے تو قدرت اپنی تحقیر گوارا نہیں کرتی۔
یعنی ورزش نہ کرنے کا انجام برا ہوتا ہے۔ ہر ایک طالب علم کو پختہ ارادہ کرنا چاہیے کہ کم از کم
دو گھنٹے کھلی ہوا میں پھرا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کریگا اسکے پیر سرد ہو جاینگے۔ جسم کی اندرونی
کل کے پہئے چلنے سے رہ جاینگے اور مختلف طرح کی سعدے اور سر کی بیماریاں ستانے لگینگی۔
ان باتوں سے اسے کچھ عرصہ کے بعد ضرور معلوم ہو جائیگا کہ وہ قدرت کے برخلاف گناہ کر رہا ہے اور اگر وہ اپنا
رویہ درست نہ کریگا تو نالائق لڑکے کی طرح ضرور اسکو سزا ملیگی۔ کیونکہ قدرت ایسی نہیں جیسی بعض نرم دل انسان
آقا اپنے نوکروں کے ساتھ سلوک کرنے میں حد سے زیادہ رحمدل ہوتے ہیں۔ اس مثل کو ہر کوئی جانتا ہے۔ کہ اگر
کسی لڑکے کو دن بھر کام ہی کام ہوگا اور کھیلنے کا نام ہی نہیں ہوگا تو وہ سست اور الھڑ ہو جائیگا۔
یا بہت جلد کمزور بیمار اور نکما ہو جائیگا۔ پس اگر جسم کو صحیح و سالم اور طاقت ور رکھنا چاہتے ہو تو برابر بیٹھکر
کام کرنیکی عادت سے کسی وقت رہائی بھی ضرور ہے۔
باقاعدہ معمولی کام سے رہائی پانیکو تفریح کہتے ہیں لیکن نوجوانوں کو تفریح کے علاوہ اور بھی کسی بات کی ضرورت

کپڑے پہننے چاہئیں۔ اور جب جاڑا خوب پڑنے لگے ہمیں گرم کپڑے پہننے چاہئیں اور جلد کے ساتھ رہنے والا کپڑا فلالین کا ہونا چاہیئے۔ ان باتوں کی احتیاط نہ کرنے سے بہت سے لوگوں کی صحت بگڑ جاتی ہے اور بہت سے لوگ سال بسال مرجاتے ہیں سردی کی موسم میں سینہ کو خصوصاً بخوبی ڈھکا رکھنا چاہیئے۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ شمالی ہندوستان کے غریبوں میں جتنی موتیں موسم سرما میں کافی لباس نہ ہونے سے ہوتی ہیں اتنی اور کسی وجہ سے نہیں ہوتیں۔ حفظِ صحت کی شرط کے مطابق یہ ضرور ہے کہ لباس اکثر تبدیل کیا جائے اور صاف رکھا جائے۔

(د) صفائی۔ کل جسم کو روزمرہ ستھرے پانی سے دھونا چاہیئے۔ بدن مختلف قسم کے دھاگوں یا تاروں سے مرکب ہے۔ بدن ایک طرح کی انگیٹھی ہے اور اس میں مصالحہ جلتے رہتے ہیں۔ جن سے تار بنتی ہیں اس جلنے کی حالت میں بہت کچھ کثافت اور غلاظت رہجاتی ہے اور جسم کا اس غلاظت سے صاف رہنا ضرور ہے ورنہ صحت کو نقصان پہنچیگا۔ نکمے مواد کا بہت سا حصہ جلد کے مساموں میں سے پسینہ کے ذریعے نکلتا رہتا ہے۔ اور نہانا یا غسل کرنا ضروری ہے تاکہ یہ مسام کھلے رہیں اور نکما مادہ انکے ذریعے خارج ہوتا رہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام جسم میں حرکت زیادہ ہوگی اور آرام خوب ملیگا۔ لیکن آسائش اور آرام کے علاوہ پاکیزگی یا صفائی صحت کے لئے ضروری ہے۔ برعکس اس کے صفائی کے نہ ہونے سے بہت سی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ علاوہ اسکے یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے بدن کی صفائی کا خیال نہیں رکھتے ان میں دل یا ذہن کی صفائی بہت کم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے بیرونی صفائی کا خیال رکھنا اکثر مذہبی جوش یا سرگرمی سے متعلق ہے۔ اور اس لئے جو کہاوت مشہور ہے وہ دراصل سچ معلوم ہوتی ہے کہ پاکیزگی خداپرستی سے دوسرے درجہ پر ہے۔ ایک بڑا مصنف لکھتا ہے کہ صرف نہانے دھونے میں کونسی پرستش شامل نہیں ہے؟ کپڑے اتار ڈالو۔ کسی حمام میں یا بہتی ہوئی ندی کے صاف وشفاف پانی میں جاؤ اور وہاں نہاکر پاک صاف ہو جاؤ تو زیادہ صاف اور بہتر

ابرِ کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا سرِ کوہسار پہ دیکھے کوئی جوبن میرا
غیرتِ تختۂ گلزار ہے مسکن میرا کہ گل افشاں ہے سرِ گوشۂ دامن میرا

کبھی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُرافشاں ہونا ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا سبزیٔ بختِ جوانانِ گلستاں ہونا

بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دُور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں جب افق پر کبھی چُپکے سے چمک جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

دل لگی کوہ کے چشموں سے مجھے بھاتی ہے
زندگی اپنی اسی طرح گذر جاتی ہے

غنچۂ گل میرے سائے سے چٹک جاتا ہے اخترِ قسمتِ گلزار چمک جاتا ہے
میرا ہر قطرہ گلستاں پہ پھڑک جاتا ہے دلِ بلبل کی طرح گل سے اٹک جاتا ہے

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

ہے - ۲۱ یا ۲۲ برس کی عمر تک ہڈیاں اور رگ پٹھے سب کے سب کچے ہوتے ہیں اور حالت پختگی کو نہیں پہنچتے اور جسم کو پھیلنے اور مضبوط ہونے کی ضرورت ہوتی ہے - اس مطلب کے لئے ضروری ہے تمام رگ پٹھوں اور جوڑوں سے کام لیا جائے - پس یہی کافی نہیں کہ آدمی کھلی ہوا میں پھرا کرے - اگرچہ یہ بھی بطور خود اچھی بات ہے - باہر جا کر ایسے کھیل اور مشغلے ڈھونڈنے چاہئیں جس سے کل جسم میں طاقت آئے لیکن یہ کھیل سب ایک ہی قسم کے نہ ہوں بلکہ مختلف ہوں مثلاً چلنا پھرنا ہے اس سے ہاتھ پاؤں کی اور کسیقدر رگ پٹھوں کی بھی کثرت ہوتی ہے لیکن جسم کے اوپر کے حصہ کو اسسے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا - اسلئے اس کے ساتھ گیند بلا - تیرنا - یا کشتی کھیلنا یا کوئی اور ورزش ہونی چاہیے جس سے جسم کے اوپر کے حصہ کی ورزش ہوتی رہے - تمام رگ پٹھوں کو حرکت میں لانے کے لئے ورزش کی باقاعدہ تعلیم ہونی چاہیے - لیکن جہاں کہیں یہ نہیں ہوسکتا تو وہاں شاید اس غرض کے لئے چلنا پھرنا یا دوڑنا اور گیند بلا یا ہوکی[51] کافی ہوگی - بہرحال نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جسم میں تناسب اور مضبوطی ہو اور انسان میں بہت کچھ صحت طاقت پختہ ارادہ اور خوش طبعی ہو - ورزش کے بارہ میں بڑی غلطی جس سے بچنا لازم ہے یہ ہے کہ کثرت حد سے زیادہ سخت اور زور کی نہ ہو - اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا - رگ پٹھوں پر بہت زور نہیں ڈالنا چاہیے - علاوہ بریں جو کثرت کہ فرحت کے لئے کیجائے اسکو اسقدر برابر جاری نہ رکھنا چاہیے کہ انسان تھک جائے اور جیسا کہ بعض اوقات کھیلوں میں دیکھنے میں آیا ہے - ورزش کے بارہ میں ایک مصنف یہ کہتا ہے کہ ہر ایک کام میں جب اس قدرتی تحریک کی تعمیل کرنی چاہیے جو چپکے سے کان میں کہدیتی ہے کہ بس لو چلا کر تھکنی ہے کیا بس ہو ورزش کی طاقت بخش خوشیوں کی پوری تعریف کون کرسکتا ہے - اس سے جسم منقبض اور بوجھل نہیں ہوتا بلکہ آدمی ہلکا پھلکا اور چست و چالاک ہوتا ہے - ذہن میں انتشار اور دھندلا پن نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک امر کو بخوبی صاف طور پر سوچتا اور سمجھتا ہے صبح کا وقت بڑا خوشنما معلوم ہوتا ہے اور شام کا وقت آہستہ آہستہ چلا آتا ہے اور نہایت صاف اور عمدہ معلوم ہوتا ہے - دیکھو مئی کے مہینے میں جبکہ خوشبودار ہوا چلتی ہے تو چھوٹے چھوٹے لیلے یا بھیڑ کے بچے مرغزاروں میں کیسے اچھلتے کودتے پھرتے ہیں - خوشی کے مارے پچھلی ٹانگوں سے کھڑے ہوجاتے ہیں - وہ خوشی میں پھولے نہیں سماتے - لیکن سوائے اعلیٰ درجہ کی صحت کی سچی اور جوشیلی خوشی جس سے خواہ مخواہ اچھلنا کودنا سوجھے حاصل نہیں ہوتی -

م - ل

[51] ہوکی ایک انگریزی کھیل کا نام ہے - جو پرانے چوگان کے سے ملتی جلتی ہے - انگریزی پولو تو اب مشہور چیز ہے - بغیر سواری کے پولو ہوکی بن جاتی ہے -

صبح آغاز و شام انجام

صبح ہے جلوۂ قدرت کا ہی اعجاز آغاز　　　وقت ہی وقت ہے کہ ہو سیرِ نظرباز آغاز
ہلگئے برگِ شجر جھوم کے اُٹھیں شاخیں　　　کی نسیمِ سحری نے وہ تگ و تاز آغاز
آنکھیں نرگس کی کھلیں خواب سے سبزے چونکے　　　طفلِ گہوارۂ شبنم نے کیا ناز آغاز
چہچہے اُٹھنے لگے۔ باغ میں غنچے چٹکے　　　بلبل و گل میں ہوا ناز کا انداز آغاز
یادِ حق میں ہے جو یوں محو تو کچھ دور نہیں　　　سورۂ نور کرے سروِ سرافراز آغاز
وردِ ہر خار ہے بافالقِ اصباح کا ذکر　　　نغمہ کر تو بھی کوئی مرغِ خوش آواز آغاز
وہ سماں صبح کا نکھرا ہوا وہ عالمِ نور　　　سجدۂ شکر کرے ہر بتِ طناز آغاز
اپنے مسکن سے چلے اُٹھ کے اُدھر چوپائے　　　کی اِدھر طائرِ پرباز نے پرواز آغاز
ہر صدا کا یہی مطلب ہے کہ اُٹھ کام کو چل　　　ہر نفس کا یہ اشارہ ہے کہ آغاز! آغاز!
کام کی سب کو بندھی دُھن ہے یہی وقت نفیس　　　اِس میں رکھتا ہی سرانجام کی پرواز آغاز
دن چڑھ آیا وہ گئی صبح پر اب تک تم نے　　　کام اپنا نہ کیا اے مرے دمساز آغاز

کام کی بات نہ سیکھی تو وہ کس کام کی سیر
صبح کی سیر وہ تھی کیجئے اب شام کی سیر

دن گیا۔ شام ہوئی۔ ہو گئے سب کام انجام　　　سچ ہے ہر رنج کا آخر کو ہے آرام انجام
کام انجام کو تا شام نہ کیونکر پہونچیں　　　صبحِ آغاز کی ہے نام خدا شامِ انجام
چھپ گیا مہرِ جہانتاب شفق پھولگئی　　　کر چکی کارِ جہاں گردشِ ایام انجام
وقتِ تعطیل ہے لے ہاتھ اُٹھا کاموں سے　　　کام ایسے میں کریگا کوئی ناکام انجام
روشنی ہوگئی کافور اندھیرا چھایا　　　مہرِ روشن کا ستاروں نے دیا کام انجام

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کوہسار میں دہقانوں کے

ہے مجھے دامنِ کوہسار میں سننے کا مزا — نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا
وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اترنا اس کا — حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا
سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اٹھاتے آنا
اور وہ تھم تھم کے اترتے ہوئے گاتے آنا

قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اٹھتا ہے — شیشۂ خاطرِ محزوں سے غبار اٹھتا ہے
کوئی کہتا ہے کہ وہ ابرِ بہار اٹھتا ہے — اور کوئی جوشِ طرب میں یہ پکار اٹھتا ہے
تند و پرشور و سیہ مست زکوہسار آمد
مے کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

میری عادت میں ہے اک شور مچاتے آنا — سرِ کوہسار سے طنبور بجاتے آنا
چھیڑ سے باغ کی کلیوں کو ہنساتے آنا — شکوہ ہائے ستمِ مہر مٹاتے آنا
توسنِ بادیہ اڑتا ہوا آتا ہوں میں
گرمیٔ مہر کے کشتوں کا مسیحا ہوں میں

وہ ضیا گسترِ عالم وہ عروسِ زیبا — نام انسان کی بولی میں قمر ہے جس کا
اٹھ گیا موجِ ہوا سے کبھی دامن جو مرا — ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پردا
نظر آتے ہی مگر پردہ نشیں چھپتے ہیں
روئے تاباں کی جھلک دے کے حسیں چھپتے ہیں

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر — چاکِ دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر — گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر
مقصدِ ہر صدفِ قلزمِ ذخار ہوں میں — ابرِ رحمت ہوں گہر دار گہر بار ہوں میں

گلوں کو کھوروں پہ جب چاہیں وہ بسا چھوڑیں
توں کو چولھوں پہ جب چاہیں وہ ہنسا چھوڑیں

جہاں وُہ جاتے ہیں قدرت ہی ساتھ ساتھ اُنکے
خدا کے ہاتھ ہیں گویا ہیں دونو ہاتھ اُنکے

جہاں سر اُنکا ہی رحمت کا اُس پہ سایہ ہے
کہ سر نہیں ہے یہ قدرت کا ایک آیہ ہے

نگاہ کرتی ہے ملے آسماں کے زینوں کو
شکست ملتی ہے آنکھوں سے دُوربینوں کو

وُہ دِل ہے یا کہ سُویدا کی ظلمتوں میں گھرا
اُبل رہا ہے پڑا آب زندگانی کا ؟

زمانے بھر سے بڑی گرچہ زندگی تو ملی
مگر نصیب کہاں خضر کو یہ زندہ دلی

خُدا ہی جانے کہاں وُہ ہیں مُنہہ چھپائے پڑے
یہ ہر جگہ ہیں مگر باغ اک لگائے کھڑے

بہار کی ہے گھٹا سر پہ آکے جھوم رہی
شگفتگی ہے قدم آکے انکے چُوم رہی

(شہباز)

اِنقلابِ ہستی

(ترجمہ از شکسپیر)

الوداع اَے جاہ و حشمت الوداع
ہستیِ اِنساں ہے کیا؟ ناقص متاع

نخلِ اُمید آج ہے شاداب و تر
ہیں لگے عزت کے گل اُس میں ثمر

تیسرے دِن گردشِ چرخِ زحل
اُس پہ برساتی ہے لاکر ابر خول

خاک میں لو وُہ اُمیدیں مل گئیں
جڑ تلک شاخیں شجر کی جل گئیں

مُجھ پہ بیتی ہے یہ ساری واردات
اَوج دُنیا کی یہ دیکھو کائنات

یُوں پڑا ہوں اب تو میں بے بال و پر
جڑ سے جیسے گر پڑے تازہ شجر

شوخ بچوں کی طرح میں سالہا
بحرِ عظمت میں سدا تیرا کیا

شُومیِ طالع سے تھا غافل مگر
تیرنا تونبوں کے بل ہے پُرخطر

شمعیں آئیں وُہ ہوئے قصرِ معلّے روشن ہجرِ دلبر کا ہوا وصلِ دل آرام انجام

نغمۂ مرغِ سحر وُہ !! یہ بلا خاموشی خدمتِ بادِ صبا دیتے ہیں اوہام انجام

روزِ محنت ہُو گیا چین کی وُہ رات آئی سارے کاموں کا تقاضا ہے کہ انجام انجام

آشیانوں میں چھپے مورومَلخ اور اب تک کام پایا نہ ترا اَے دلِ خود کام انجام

فکرِ انجام سے کیا کام کر آغاز کی فکر حُسنِ آغاز کا شرطیہ ہے انعام انجام

ایسے آغاز کی توفیق نے یاروں کو یارب آغاز سے وابستہ ہو مادام انجام

کام کیا کہئے ہو آزاد سنورتے ہی نہیں
اچھے اسلوب سے آغاز تو کرتے ہی نہیں

آزاد — (غلام بھیک نیرنگ انبالوی)

سعدی

یہ وُہ بزرگ ہیں آئے جو پہلے مکتب میں نصیحتیں ہی سُناتے ہر ایک مطلب میں

اگرچہ پہلے پہل کچھ بہت ہتیں ہو رہے بہاتے سرکہ تصنع سے کچھ جبیں سے رہے

مگر جو ہم سے وُہ مانوس رفتہ رفتہ ہُوئے گلوں کی طرح گلستاں میں شگفتہ ہوئے

نصیحتوں سے نہ پھر اُنکی ہم ملول ہُوئے کہ غنچے چینِ جبین کے بھی گل کے پھول ہُوئے

ترُش بھی ہو کے وہ رُو اب مزہ دکھانے لگا جبیں کے سرکے سے چٹنی کا لُطف آنے لگا

اجازتیں ہمیں دیتے ہیں روک ٹوک کے ساتھ ہیں کانٹے پھُولوں کے پہلو میں نوک جھوک کے ساتھ

شکر وُہ گھول کے نیبو نچوڑ دیتے ہیں شراب ڈھال کے وُہ برف چھوڑ دیتے ہیں

فساد کرتے ہیں جس وقت دُو پیٹ کے وُہ کھلاتے گولیاں ہیں تب ورق لپیٹ کے وُہ

ہر ایک بات کو سانچے میں ڈھال دیتے ہیں ہمارے سر سے ہر آفت کو ٹال دیتے ہیں

ہنسی ہیں ڈال کے ناخوش گوار باتوں کو اڑاتے بیٹھ کے ہیں مصریوں نباتوں کو

یہ بڑھنے والی دنیا - لاکھ اختیار کر لے ۔۔۔ انصاف و عدل و قانوں - پر شک نہیں ہے بھلا
ہے تیرا کام تیرا - اور وہ صدائے غیبی ۔۔۔ وہ صوتِ رعد جس نے - ہمدان ہلا دیا تھا
گونجے گی تا قیامت - ہے یادِ ربعِ مسکوں

صادق علی خاں

کچکول

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے ۔۔۔ بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لئے
دیکھ لیتا ہوں جہاں تنکا کوئی چبھتا ہوا ۔۔۔ میں اُٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کے لئے
ہمصفیرو تم مری عالی نگاہی دیکھنا ۔۔۔ شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لئے
وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے ۔۔۔ مینے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے
قصہ خواں نے کیوں سُنا دی داستاں مجھ کو مری ۔۔۔ رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لئے
آنکھ ملجاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری ۔۔۔ ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لئے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چنکے تو ۔۔۔ آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر ۔۔۔ ورنہ میں اور اُڑکے آتا ایک دانے کے لئے
عشق نے مٹی کو مسجودِ ملائک کر دیا ۔۔۔ ورنہ انساں اور فرشتے سر جُھکانے کے لئے
اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت ۔۔۔ آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے
صبحِ پیدائش یہ کہتا تھا کسی کو دردِ عشق ۔۔۔ آنکھ رونے کے لئے دل ٹوٹ جانیکے لئے
ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے ۔۔۔ یہ غزل لکھی ہمایوں کو سُنانے کے لئے

(اقبال)

اُس غرورِ جاہ نے انجامِ کار　　چھوڑ تنہا مجھ کو - لی راہِ فرار
طُولِ خدمت نے کیا زار و نحیف　　بحر ہے مّواج اور مَیں ہوں ضعیف
اَے شکوہ و حشمت و کبر و غرور　　ہو گیا ہُوں سخت میں تم سے نفور
دِل مرا ہے تم سے بالکل پھر گیا　　کُھل گیا اب راز سربستہ جو تھا
رحم کے قابل ہے اُس کا حالِ زار
لُطفِ اُمرا کا جو ہو اُمّیدوار

مُحی الدّین صدّیقی (از لکھنؤ)

برطانیہ اور امریکہ

سنہ ۱۷۸۲ء میں
(ترجمہ از ٹنی سن)

اَے تو کہ بھیجتی ہے اپنے جوان رعنا　　بحر و بر جہاں پر کرنے کو حکمرانی
تو مادرِ قوی ہے - اک نسل ضیغمی کی　　کر ناز دیکھ اپنے بیٹوں کی جانفشانی
چھینے جنھوں نے تجھ سے اپنے حقوق سارے
اس بات کا عجب کیا - اک جوش برمحل سے　　روکے اگر اُنھوں نے - مردانہ تیرے بازو
اور تیری ہی عقیدت میں - تجھ سی جنگ کر کے　　پھر وُہ سبق پڑھایا - سکھلا چکی تھی جو تو
تھا اُن میں خُون انگلش - فرزند تھے تمہارے
لازم یہ ہے کہ خوش ہو آزادہ خوش دلی سی　　اور تنکے کو وہ پیکر! بس پاش پاش کر دے
گر بھیجے وقت طوفاں - بحر اژدروں کی لہریں　　ٹوٹیں جو بے محابا - پاؤں میں آکے تیرے
گستاخ ہے سمندر - اسکے دھوئیں اُڑا دوں

جب کہیں جاتے ہو آتے ہو پشیماں ہو کر — تم کو جانا نہیں آتا ابھی مہماں ہو کر

مصلحت سے نہ کیا جور تو کیا ہوتا ہے — آدمی توبہ کرے دل سے پشیماں ہو کر

دیکھنے والے ہی سو عیب لگا دیتے ہیں — کوئی جو چاہے کرے آنکھ سے پنہاں ہو کر

ہائے ویرانیٔ دل بے سروسامانیٔ دل — ترے ارمان بھی پچھتائے ہیں مہماں ہو کر

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) —— (داغ)

شبِ فراق جو دستِ دعا بلند ہوا — ندا ہوئی کہ بابِ قبول بند ہوا

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) —— (داغ)

تو نے جدن سے کی مسیحائی — کوئی اچھا نظر نہیں آتا

ہمیں اے داغ کور باطن ہیں — ورنہ وہ کیا نظر نہیں آتا

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) —— (داغ)

عشق در پردہ پھونکتا ہے آگ — یہ جلانا نظر نہیں آتا

دل نے اس بزم میں بٹھا تو دیا — اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) —— (داغ)

مارنا دل کا سمجھتا ہوں جہادِ اکبر — وہی غازی ہے بڑا جس نے یہ کافر مارا!

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) —— (داغ)

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے — رہروو! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ

(الف دین وکیل) —— (میر درد)

کتابیں ڈھونڈھتی ہیں مجمع احباب مدفن ہیں — اثر باقی ہے آنکھوں میں ابھی خوابِ پریشاں کا

(میراں بخش کلرک دفتر پوسٹ ماسٹر جنرل لاہور) —— (تسلیم)

بتاؤں کیا سفر کی طرح گر پوچھے کوئی مجھ سے — غرض کیا ہے کدھر جاتا ہوں کیوں آیا کہاں آیا!

(اقبال) —— (تسلیم)

چیونٹی

نظر آتی ہے چیونٹی گو بہت کم نوعِ خلقت میں
امنگیں اسکی دیکھے کوئی لیکن عزم و عادت میں

تمنّا ہیں تدبّر ہیں تجسّس ہیں ذکاوت ہیں
ذخیرے کے فراہم کرنے میں نوعی حمایت میں

ذرا اس تنگ تر سینے کا فرطِ جوش تو دیکھو
دماغِ نرم و نازک کا وفورِ ہوش تو دیکھو

(نتیجۂ علامہ احمد حسن صاحب حسنی)

کیا جانے کس کے دم سے ہے آباد میکدہ
ساقی وظیفہ بند نہ کر بادہ خوار کا

(انور دہلوی)

نکلے وہ کھولے ہوئے زلفِ رسا بالائے دوش
لے چلی برقِ طپاں کالی گھٹا بالائے دوش

اٹھ کھڑے ہونگے کسی دن یہاں سے دامن جھاڑ کر
زادِ راہ لینگے نہ فرشِ بوریا بالائے دوش

واں کھلیگا جب کہ دفتر آئینے کس شان سے
اپنا اپنا پشتارہ لئے اہلِ خطا بالائے دوش

عیب پوشِ جسم ہوتا جامۂ عریاں تیرے
بار اس دو گز کفن کا کیوں رکھا بالائے دوش

مرکے بھی کیا خاک ہوتی ہے سبکدوشی شمیم
بارِ اعمال عمر بھر کا لیچلا بالائے دوش

(سلامت علی سب انسپکٹر تھانہ قیصر گنج) (میر حیدر مہدی شمیم)

شمیم خستہ دل ملکِ عدم کے جانے والوں کو
صدا دیتے رہے مڑ کر ادھر بھی دیکھتے جاؤ

(سلامت علی سب انسپکٹر تھانہ قیصر گنج) (میر حیدر مہدی شمیم)

وہ کونسی جگہ ہے جہاں تو مکیں نہیں
ہے یہ خیالِ خام کہیں ہے کہیں نہیں

(نواب شمشیر بہادر جھجھری)

انکے جلوے سے ہے خالی دلِ حیراں کسکا
نظر آتی ہے ہر آئینے میں صورت انکی

(نواب شمشیر بہادر جھجھری)

جیتے جی کا یہ بھی اک آزار ہے
صبر کرنا وعدۂ دیدار پر

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) (داغ)

دل کا سودا جو کرے تم سے وہ سودائی ہے
دام دیتے نہیں تم مال پرایا لے کر

آنکھ کا ہے یہ اشارہ کہ نہ چھوڑیں دل کو
منہ سے کہتے ہیں کرے کوئی اسے کیا لیکر

(محمد نصیب بیرسٹر ایٹ لا) (داغ)

لیلیٰ کا نام زندہ ہے اب تک جہان میں — تم بھی نباہ دو کسی اہلِ وفا کے ساتھ

(سید محمد تقی وٹرنری اسسٹنٹ لاہور) — (انور دہلوی)

کیا نہ کہتی دلِ صدچاک کی حسرت بلبل — گوشِ گل کو جو میسر شنوائی ہوتی

(اقبال) (تسلیم لکھنوی)

طوف ہر نخل کرینگے صفتِ گردِ نسیم — ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہونگے

(اقبال) (مرزا اصغر علیخاں نسیم دہلوی)

خارِ حسرت بیان سے نکلا — دل کا کانٹا زبان سے نکلا

(اقبال) (داغ)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(اقبال) (مومن)

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہیں یہ کیف شراب ہے — لب یار چومے تھے خواب میں وہی جوشِ مستی خواب ہے

مجھے در پہ اپنے تو رہنے دے نہ اٹھا تو بہرِ خدا مجھے — جو اٹھے تو دو دو جگہ بھلا مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے

دلِ عندلیب پہ نقش نہیں گلِ لالہ کے یہ ورق نہیں — مرے عشق کا وہ رسالہ ہے ترے حسن کی یہ کتاب ہے

(محمد سخاوت حسن خاں تعلقدار ضلع بیدر دکن) — (مولوی عبدالحلیم عاصی)

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر — ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

(خواجہ محمود بی-اے) — (امیر مینائی)

تمنا زیست میں تھی اپنی اے شرر — کہ اپنی خاک ہو اور کوئے دلبر

نہ پوری یہ ہوئی اے وائے مرکر — صبا نے اسکے کوچے سے اڑا کر

(خواجہ محمود) خدا جانے ہماری خاک کیا کی (تضمین بر مصرعہ مصحفی)

آئے تو انکو رنج نہ آئے تو مجھ کو رنج — مرنے کی میرے کاش نہ ان کو خبر کریں

(لالہ سریرام ایم-اے) — (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ دہلوی)

اے مرگ آ کہ میری بھی رہجائے آبرو — رکھا ہے اسنے سوگ عدو کی وفات کا

(رر)

طوفانِ اشک لانے سے اے چشم فائدہ — دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

(رر) (رر)

اٹھ اٹھ کے دردِ دل تجھے نشتر زنی ہے کام — کیا جانے تو کہ بیٹھے ہیں ہم کس خیال میں

(رر) (نواب صفدر علی خاں صفدر مرحوم)

جلد ۲ نمبر ۶ ستمبر ۱۹۰۱ء

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے ○

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز کے اہتمام سے [illegible]
[illegible] آفس سے ایڈیٹر نے [شائع کیا]

خریدارانِ مخزن

کے ساتھ

ہمیں اب اتنا تعلق تو ہے کہ انہیں تھوڑی سی تکلیف دے سکیں اور وہ تکلیف اسی رسالہ کے متعلق جسے روز بروز اچھا بنانا اور جسکی ترقی میں کوشش کرنا ہماری انکی متحدہ غرض ہے۔ ہم اُن پر اسقدر حق تو نہیں سمجھتے کہ اُن سے درخواست کریں کہ وہ کام کاج چھوڑ کر اس رسالہ کی خریداری بڑھانے کی کوشش کرتے پھریں۔ یا اُن میں سے ہر ایک کم از کم ایک دو خریدار ہمیں پیدا کر دے۔ مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان **دو** اشتہاروں کو جو اس رسالہ کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں اور جن میں مخزن کا حال درج ہے۔ اپنے دوستوں میں کسی ایسے **دو** حضرات تک جو اسوقت مخزن کے خریدار نہیں ہیں پہنچا دیں۔ ہم یہ تکلیف اُنہیں نہیں دیتے کہ وہ **مخزن** کی سفارش بھی ساتھ کر دیں۔ بلکہ جن صاحبان کی ہاتھ میں یہ اشتہار جائے۔ اُن سے یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ رسالہ خود اپنی سفارش کرے تو اس کے معاونین کی فہرست میں وہ بھی اپنے اسمائے گرامی درج کرا لیں ٭

مخزن

زندہ دلوں کا وطن

خدا جانے کس مقبول گھڑی میں سید احمد خاں مرحوم کی زبان سے "زندہ دلانِ پنجاب" کا فقرہ نکلا تھا۔ کہ تیر کی طرح نشانہ پر بیٹھا۔ اور جزوِ زبانِ اردو بنگیا۔ اب جس اخبار کو کھولو۔ جس قومی مجلس کی روئداد کو پڑھو۔ جس تحریک کے اشتہار پر نظر ڈالو۔ یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو کوئی باشندگانِ پنجاب کو کسی کام کا شوق دلانا چاہتا ہے۔ وہ ان الفاظ کے ذریعہ انکو یاد دلاتا ہے۔ کہ یہ تمغا جو قوم کی جانب سے انہیں مل چکا ہے۔ اسکی لاج رکھیں اور بعض دوسرے صوبجات کی طرح بے اعتنائی سے کام نہ لیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ افسوں کسی دفعہ چل جاتا ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اگر زندہ دلی سے مراد قومی اور ملکی بہتری کے لئے سر توڑ کوشش ہے۔ تو پنجاب کچھ ایسا بہت مستحق نیکنامی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ملک کے اور حصّوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ اور یہاں ایک دھیما سا چراغ ٹمٹماتا نظر آئے۔ مگر ترقی جس چیز کا نام ہے اس سے ابھی پنجاب بھی بہت دُور ہے پنجاب میں بھی بہت تھوڑے لوگ ہیں جو فی الحقیقت خطاب "زندہ دلان" کے مستحق ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ جو زندہ دلوں کو مُردہ دل بنانا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں روڑا اٹکانا۔ بنے ہوئے کام بگاڑنا۔ اور ترقی کے راستہ میں سدِّراہ بننا اپنا شعار کئے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس اصلیت سے واقف ہیں۔ انہیں بڑی ندامت ہوتی ہے جب وہ ہر طرف سے اپنے ہموطنوں کی تعریفیں سُنتے ہیں اور بے ساختہ اُنکے مُنہہ سے دُعا نکلتی ہے کہ جو کچھ وہ بظاہر سمجھے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت بنجائیں۔ تاکہ اس ندامت سے ہائی

اسے بہت کم حاصل ہوئی۔ اس گمنامی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مدتوں دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جن کی آنکھیں شاہی کی آب و تاب کے تماشے دیکھ چکی تھیں۔ پنجاب کو کچھ نظرِ حقارت سے ہی دیکھتے رہے۔ اور چونکہ یہاں کے باشندوں میں وُہ نفاست اور سلاست نظر نہ آئی جو شاہی دربار کے قرب نے اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ اور ان شہروں کے مضافات کو سکھائی تھی۔ اس لئے انہیں شائستگی کے حلقہ سے باہر سمجھتے رہے۔ اہلِ پنجاب جو اُن اثرات سے خالی تھے جو انکے ہمسایوں پر پڑ چکے تھے۔ ہندوستانی حضرات کی غیر معمولی نازک مزاجی کو دیکھ کر اُن سے الگ رہے اور انجام کار دونوں ایک دوسرے سے رُک رُک کے ملنے کے عادی ہو گئے اور ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک علیحدگی سی ہو گئی۔ سر سید مرحوم نے جو بڑے اہم کام اپنی زندگی میں سرانجام کئے۔ اُن میں یہ بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ اُنہوں نے ہندوستانیوں اور پنجابیوں میں ایک ربط خاص پیدا کر دیا۔ اور ہندوستانی حضرات کو بجائے پنجابیوں سے نفور ہونے کے اُن کا مداح بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اب تک ہندوستانیوں میں بعض ایسے لوگ ملینگے جن میں پہلی کشیدگی باقی ہے اور پنجاب میں کچھ ایسے آدمی نظر آئینگے جو ہندوستانیوں سے بدستور کھنچتے ہیں۔ مگر اکثر صورتوں میں یگانگت اور اتحاد کی بُنیاد مستحکم ہو رہی ہے۔ اور وجہ یہی ہے کہ قوم کے دونوں حصّے ایک دُوسرے کو بخوبی پہچاننے جاتے ہیں۔ اور شناسائی دوستی اور محبت کی ابتدا ہے۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مُلک کا یہ چھوٹا سا حصّہ پانچ دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ اور انگریزوں کے وقت میں یہ پانچ دریا حکمت جدید کے زور سے نہری انہار میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ کہ کہا جا سکتا ہے کہ صفحۂ مُلک پر پانی کی ایک چادر پڑ گئی ہے۔ یہاں کی زمینیں شروع سے حاصل خیز رہی ہیں۔ اور یہاں کے کسان

ہو۔ جواب انہیں اپنی تعریفیں سُنتے وقت لاحق ہوتی ہے۔

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق

تحسین کنند و او خجل از زشتِ پائے خویش

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر زندہ دلی کے زیادہ وسیع معنے لیئے جائیں تو اہلِ پنجاب اس خطاب کے بہت مستحق ہیں۔ اور اس کی وجہ زیادہ تر اُنکے وطن کی قدرتی خوبیاں ہیں۔ پنجاب اور اہلِ پنجاب کی حالت اور عادات کا صحیح اندازہ آج تک دیگر حصصِ ہندمیں نہیں کیا گیا۔ ایک عرصہ تک تو یہ صوبہ کنجِ گمنامی میں پڑا رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے باشندے کس مپُرسی کی حالت میں رہے۔ اسلامی سلاطین کے زمانے میں یہ سلطنت ہندوستان کا ایک دُور افتادہ حصہ تھا۔ جس کی منزلت سرائے سر شاہراہ سے زیادہ نہ تھی۔ سرحد پنجاب ہندوستان کے حملہ آوروں کا دروازہ تھا۔ اور پنجاب بمنزلہ ایک سڑک کے تھا جو بڑے بڑے دار الخلافوں تک پہنچتی تھی۔ وسط ایشیا سے آریاورت کے بانی آئے تو اُنکو بھی گنگ و جمن کی کشش نے راوی اور بیاس کے کناروں کو آباد نہ کرنے دیا۔ آریاورت پہ محمود حملہ کرنے نکلا تو اسکو بھی ہندوستان کی دولت کے مرکزوں نے اپنی طرف کھینچا اور اُس کا شوقِ بُت شکنی گواسے سومنات تک پھرا لایا۔ مگر پنجاب پر اُس نے کوئی خاص التفات نہ کی۔ تیمور لنگ نے بھی اپنی جرّار فوجوں کو لئے ہُوئے پنجاب میں سے گذرجانے پہ ہی اکتفا کیا۔ اور شاہانِ مُغلیہ کی شان و شوکت نے بھی دہلی اور آگرہ کو ہی انتخاب کیا۔ پنجاب کا پرانا دار الخلافہ لاہور صرف ایک صُوبہ کے گورنر کی ہی قیام گاہ رہا۔ اور پنجاب کے وسیع میدانوں۔ سیراب کھیتوں اور دلچسپ سبزہ زاروں کا ذکر کہیں ضمنًا آیا تو آیا۔ کہیں جہانگیر نے کشمیر جنت نظیر کو جاتے جاتے اپنی تزک میں لکھدیا کہ پنجاب کے فلاں مقام سے گذر ہوا۔ تو اسکے منظر کو دلاویز پایا۔ کہیں کسی نے کابل کو جاتے ہوئے یا آتے ہوئے کسی مقام کو قابل تذکرہ خیال کرلیا۔ تو پنجاب کا نام آگیا۔ مگر اس سے زیادہ خصوصیت

بہ حیثیتِ قوم اچھے جہاز راں ہیں۔ کیوں؟ صرف اِس لئے کہ قدرت نے اُنکو دُنیا سے اِس قدر الگ تھلگ ڈالدیا تھا۔ کہ بغیر جہاز رانی کے وُہ شائستگی کی نعمت سے بہرہ ور ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اہلِ انگلستان کامیاب تاجر اور باہمّت سیّاح ہیں۔ کیوں؟ اِس لیے کہ اگر صرف اپنے مُلک کے سہارے بیٹھتے تو سوائے آلو کے اور کچھ کھانے کو ہی نہ ملتا۔ لوہے کا کام انگلستان میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ اِس لیے کہ انگلستان کی سرزمین لوہے کی کان ہے۔ اسی طرح جاپان اپنی جغرافیائی حالت میں ایشیا میں انگلستان کا جواب ہے۔ اِسی طرح برّ اعظم سے الگ پڑا ہوا ہے۔ اِسی طرح چاروں طرف پانی سے گھِرا ہوا ہے۔ اِسی طرح دندانہ دار ساحل بحر رکھتا ہے۔ اِسی طرح اکثر پیداوار کے لئے دُوسرے مُلکوں کا حاجتمند ہے۔ اور اُسی طرح ایک باہمت قوم کا وطن ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس اہلِ پنجاب بھی جیسی حالت میں ہیں یا جس حالت تک پہنچینگے۔ اپنے وطن کی خصُوصیّتوں کے اعتبار سے ہی بنے ہُوئے ہیں اور اِسی اعتبار سے بڑھینگے۔ اِن کی زراعت پیشہ زندگی۔ اِنکے وطن کے کوہ و دریا۔ اُس کے چٹیل میدان۔ سب اِس بات کے متقاضی ہیں کہ یہ جفاکش اور سادہ اطوار ہوں۔ تکالیف کے عادی اور سفر کو آسان سمجھنے والے ہوں۔ ممکن ہے کہ پنجابی کی جفاکشی اور سادہ وضعی دُوسرے صُوبجات میں کنجوسی پر محمول کی گئی ہو۔ مگر جاننے والے جان سکتے ہیں کہ یہی ایسی خوُبیاں ہیں۔ جن سے اُمید ہو سکتی ہے کہ پنجابی بڑھنے والا آدمی ہے۔ پنجاب میں لکھپتی اشخاص اکثر اوقات لمبے لمبے قدم مار کر چلتے۔ مُستعدّی سے کام کرتے اور حسبِ ضرورت میلوں پیادہ چلنے کو آسان سی بات سمجھتے دکھائی دینگے۔ ممالک مغربی و شمالی میں معمولی سفید پوش بھی تھوڑی دُور تک بغیر سواری کے چلنا عار سمجھیگا۔ پنجابی کے دسترخوان پر سیدھی سادی روٹی اور سیدھا سادہ سالن ہوگا اور بس۔ ہندوستان میں دسترخوان دسترخوان نہ سمجھا جائیگا جب تک اُس پر کم از کم چار پانچ

محنت و مشقت میں ضرب المثل ہیں۔ اُس پر پانی کی مناسب تقسیم نے وُہ لُطف پیدا کیا ہے۔ کہ فصل کے دنوں میں اطراف مُلک میں ایک گلزار کھل جاتا ہے۔ بشرطیکہ فلک کا اہلِ ہند پر خاص عتاب نہ ہو اور بارانِ رحمت کا نزول بھی انسانی حکمتوں کا معاون ہو جائے۔ غلہ کامیاب فصلوں میں اِس کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دُوسرے صُوبجات میں نہ جائے اور ممالکِ غیر کی خرید نہ ہو۔ تو وُہ ارزانی ہو کہ باید و شاید۔ اِس عام سیرابی کے علاوہ بعض قطعات خصُوصیت سے سیر حاصل ہیں۔ ستلج اور بیاس کے درمیان ایک دوآبہ ہے۔ جو خوبیٔ آب و ہوا اور کثرتِ باغات و اشجار کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ ایک طرف راولپنڈی اور دُوسری طرف گورداسپور کے قریب بعض مقامات دامن ہائے کوہ میں واقع ہیں۔ جنکے قدرتی چشمے اور خوشگوار پانی اور اُنکے زور پر بڑھنے والے میوں کے باغ "جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الانہار" کا سماں آنکھوں میں کھینچ دیتے ہیں۔ بعض اضلاع ہیں۔ کہ نسبتًا غیر آباد اور سرسبزی و طراوت سے خالی ہیں۔ مگر اُن میں اَور کچھ نہیں تو ہوا نہایت صحت بخش ہے۔ کشمیر کا قُرب اور اس کے ساتھ پنجاب کا قدیم اور موجُودہ تعلق اِس صُوبہ کے لئے باعثِ رونق ہیں۔ بعض اضلاع پنجاب کی حد ریاست کشمیر کی حد سے ملتی ہے۔ یہ اضلاع زبانِ حال سے ع جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد + پکار رہے ہیں۔ سملہ کا پہاڑ اور اُس کے ساتھ کی پہاڑی ریاستیں۔ کانگڑہ کا ضلع مع اپنے قدرتی منظروں کے۔ تماشائے قدرت کے دلدادوں کے لئے کشش خاص رکھتے ہیں۔ اور اِن سب قدرتی سامانوں کا مجمُوعی اثر باشندگانِ پنجاب پر پڑتا ہے۔ کسی مُلک یا حصّہ مُلک کی جغرافیائی حالت ہمیشہ ایک خاص اثر اہلِ مُلک پر رکھتی ہے۔ اہلِ عَرَب کی ترقی کا راز اُنکے صحرائی مُلک میں مستتر تھا۔ اگر انہیں گھر میں کھانے کو مِل جاتا تو مشکل تھا کہ وُہ دُنیا کے مشارق اور مغارب کو چھان مارتے۔ اہلِ انگلستان کی اکثر خوبیاں اُنکے وطن کی برکت سے ہیں۔ اہلِ انگلستان

پنجابیوں میں اُن سب اقوام کی اچھی اچھی چیزیں جن سے انہیں سابقہ پڑا ہے مروّج ہوگئی ہیں
پنجاب میں کئی گھر ملینگے جہاں زن ومرد ایرانیوں اور افغانوں سے فارسی میں گفتگو کرتے
اور اُنکے ساتھ قہوہ پیتے ہیں۔ کشمیریوں کے ساتھ قیماق چائے اُڑاتے ہیں۔ ہندوستانیوں
کے ساتھ پان کھاتے ہیں۔ اور اُردو میں باتیں کرتے ہیں۔ اور خالص پنجابی مجلس ہو
تو پنجابی بولی جاتی ہے اور حقہ بھری سبھا میں یوں پھرتا ہے جیسے گوپیوں میں کاہن
ہر زبان کے تلفظ کو پنجابیوں میں سے تیز ذہن لوگ آسانی سے اُڑا لیتے ہیں۔ اور زبان کو
یوں بولتے ہیں جیسے اُن کی اپنی ہو۔ باایں ہمہ بلا ضرورت کم بولتے ہیں اور خموشی پسند
واقع ہوئے ہیں۔ یہانتک کہ ہندوستانی بھائی انہیں عموماً عجمی کہتے ہیں۔ کوئی پنجابی
آپ کو سفر میں ملے تو بہت کم ایسا ہوگا کہ خود بخود آپ سے مستفسر حالات ہو یا گفتگو شروع
کرنا چاہے۔ لیکن اگر اتفاق سے گفتگو شروع ہو جائے تو پردۂ تکلف جلد درمیان سے
اُٹھ جاتا ہے۔ دوست بننے میں پنجابی بہت مستعد اور زود باز نہیں۔ مگر دوست بنجائے
تو پکا دوست ہوتا ہے۔ پنجابی گھر کا ایسا ہی عاشق ہے جیسا ہند کا کوئی اور باشندہ۔ لیکن
جب گھر سے نکل کھڑا ہو تو افریقہ اور آسٹریلیا اور امریکہ سب ایک ہے۔ دُنیا کے دُور سے دُور
حصوں میں پنجابی کا سُراغ ملتا ہے اور جُوں جُوں علم کی روشنی پھیلتی جائیگی۔ زندہ دلوں
کا وطن اپنے ہونہار بیٹوں کو ہر ملک و دیار اور ہر آب و ہوا میں جاگزین ہوتا۔ اور پھلتا پھولتا دیکھیگا

اَمریکا کا بے تاج بادشاہ

مسٹر مکنلے جو امریکا میں اضلاع متحدہ کا بے تاج بادشاہ تھا۔ نے وفت یہ کہہ کر جاں بحق ہوا کہ "اے خدا
تیری رضا مقدم ہے"۔ متوفی پریسیڈنٹ کے ان آخری الفاظ کی نسبت حال ہی انگلستان کے ایک
پادری صاحب نے گرجے میں وعظ کرتے ہوئے نہایت پر اثر تقریر کی۔ جس کے ایک مختصر سے حصہ
کا ترجمہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

رکابیاں نہ ہوں۔ یہاں تکلف سے خالی ہونا ہنر اور وہاں پرتکلف ہونا داخلِ خوبی شمار ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ پنجابی کے لئے ضرورت ہے کہ کبھی کبھی اپنے ہندوستانی بھائی سے تکلف کی کتاب کے۔ بہت نہیں۔ تو ایک دو ورق ہی پڑھ لیا کرے۔ اور ہندوستانی کو چاہیئے کہ بے تکلفی کا سبق پنجابی سے سیکھ لے۔ شایستہ زندگی کے لوازم پنجابی کو ذرا پرتکلف ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اپنی اصلی سادگی ہاتھ سے نہ کھو بیٹھے۔ ہندوستانی اگر زندہ دلوں کے وطن کی سیر کرے اور پنجابیوں سے بے تکلف ربط اور میل جول بڑھائے تو بہت سی وہ مردانہ اور مفید عادتیں سیکھ سکتا ہے۔ جو اسے ترقی کرنے میں پوری مدد دیں۔

پنجاب کی اگر کوئی سیر کرے تو وہ جابجا صحت بخش زندہ دلی کے ثبوت پائیگا جس کو اگر عمدہ موقعوں پر استعمال کیا جائے تو قومی امور میں سچی زندہ دلی پیدا ہو جائے۔ اِس صوبہ کی آبادی گلہائے رنگارنگ کا ایک عجیب گلدستہ ہے۔ ہر شہر میں ایک معقول تعداد ملک کے دیرینہ باشندوں کی ہے۔ جو آریہ نسل سے ہیں۔ پنجاب کے آریہ اصل والے باشندے رنگ روغن میں اپنے اُن بھائیوں سے اچھے ہیں جو گنگا کنارے جا بسے ہیں اور جنکے رنگ کو پورب کے آفتاب کی زیادہ سخت حدت نے قدرے سیاہ کر دیا ہے۔ انکے علاوہ ہر شہر میں ایک خاص حصہ مسلمانوں کی مختلف اقوام کا ہے۔ جن میں سید عربی الاصل مُغل تاتاری اور پٹھان افغانستان سے آئے ہوئے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں ایک کثیر تعداد کشمیری الاصل باشندوں کی ملتی ہے۔ جن میں سے بعض اب تک اپنی مادری زبان اور اپنے وطن مالوف کی عادات کو نباہے جاتے ہیں اور بعض ٹھیٹھ پنجابیوں میں مِل جُل گئے ہیں۔ اِس ملاپ نے پنجاب کے بعض مقامات کو کانِ حُسن و ملاحت بنا دیا ہے اور وہ وہ صورتیں پیدا کی ہیں۔ جنکا نظیر ہندوستان کے اَور بہت کم حصوں میں پایا جاتا ہے۔ اثر قبول کرنے کی طاقت کچھ قدرت نے اِس علاقہ میں ایسی ودیعت کی ہے کہ شایستہ

زعفران

سری نگر دار الخلافہ کشمیر سے جانب جنوب کوئی آٹھ نو میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ بنام پانپور یا پام پور دریائے جہلم کے کنارہ پر آباد ہے جسکو گذشتہ زمانہ میں پدم پور کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ روزِ ازل سے قدمگاہ حضرت آدمؑ یعنے ہندوستان جنت نشان اور خاک ہندوستان میں کشمیر بہشت نظیر اور سرزمین کشمیر میں خاص پدم پور کی مٹی میں یہ تاثیر ودیعت ہوئی کہ زعفران جیسے بیش بہا اور نایاب چیز کا وطن مالوف کہلائے۔ ہونے کو تو زعفران ایک خاص حصہ یا علاقہ کشتوار اور ایران میں بھی ہوتا ہے۔ مگر جو شرف یہاں کی پیداوار میں ہے کہیں سننے میں نہیں آیا۔

وسط جون یا جولائی میں اس کی کاشت شروع ہوتی ہے۔ زمین میں ہل چلا کر مٹی کو ہموار کیا جاتا ہے اور جا بجا خیابان بنا دیئے جاتے ہیں اور قدرت الٰہی کا تماشا نظر آتا ہے۔ چند روز کے عرصہ میں خود بخود پود سر نکالنا شروع کر دیتی ہے اور قریباً تین مہینہ میں اسکا نازک اندام پودا پورے قد کا ہو کر جس کی بلندی فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی وسط ماہ اکتوبر میں اپنے پورے جوبن پر آ جاتا ہے۔ اور اسکی ننھی ننھی شاخیں اپنی پیاری پیاری کلیوں کی آنکھیں کھولنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے شگوفہ زعفران کہتے ہیں۔ جب خاندان گل کا آخری بادشاہ یعنے گل زعفران تاج شاہی کو زیب سر کر کے مسند آرائے انجمن گلشن ہو کر کرسی ناز پہ جلوہ فرمائی کرتا ہے تو اس جشن تاج پوشی کے اشتیاق دیدار میں زندہ دلوں کے دل پر اضطراب اور آنکھیں بے تاب ہو جاتی ہیں۔ اور قرب و جوار کے لوگ جوق جوق ہو کر ہر طرف سے دیدہ و دل اس کے خیر مقدم کے لئے میلوں کی مسافت طے کر کے پہنچتے ہیں اور اس کے قدموں کو

"آج گرجے کے معمولی باجے کے سوا ایک اور باجے کی آواز کرہ ہوا میں گونج رہی ہے۔ دنیا بھر کی عیسائی اقوام اسوقت ہمدردی کے جوش سے پُر ہیں۔ کیونکہ ایک حرمان نصیب قوم کی قوم کو ایک صدمہ نے ماتم میں ڈالدیا ہے۔ اور وہ روتی ہیں اور واویلا کرتی ہیں۔ مگر انکے دل کو قرار نہیں آتا۔ امریکہ کی اس قومی ماتم کی آواز نیاگرا جیسے مشہور اور عظیم الشان آبشار کی پُرشور آواز پر بھی غالب ہے۔ اور انکے پژمردہ دلوں کی آہیں وہاں کے گھنے درختوں کی سایہ سے بھی زیادہ وحشت ناک ہیں۔ اس قومی رنج کی آواز سنسان جنگلوں کو طے کرتی آتی ہے۔ اور خاموشی سے بہنے والی ندیوں کے کناروں تک بھی پہنچتی ہے۔ وہاں کوئی دہقان ایسا نہیں جسکے کھیت پر آج اداسی نہ چھائی ہوئی ہو اور کوئی دوکاندار ایسا نہیں جسکی دوکان آج بند نہو۔ دریائے ہڈسن کا صاف اور شفاف پانی آج اس حادثہ پر سیل اشک بہارہا ہے۔ اور اسکے اردگرد کے سبز سبز درختوں کے چہرے آج اس غم سے زرد ہورہے ہیں۔ آج شہر واشنگٹن ہے اور کوہ غم۔ اور یہ سب اس لئے کہ بدنظمی کی خواستگاروں کا ہاتھ کڑا پڑا ہے اور سرزمین آزادی کا سب سے بڑا خادم قوم حلۂ کفن میں ملبوس ہوکر اُس سے آزادتر سرزمین کو جانیوالا ہے۔ جہاں بُروں کی بُرائی کچھ اذیت نہیں پہنچا سکتی۔ اور شریروں کی شرارت ختم ہوجاتی ہے۔

آگے بھی جب امریکہ کو اس قسم کے صدمات پہنچے۔ تو انگلستان میں اپنی قوم کی امریکانی شاخ کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا گیا۔ مگر اب کے معمولی نہیں بلکہ خاص ہمدردی ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اپنا صدمہ تازہ ہے اور ملکہ معظمہ کے انتقال سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملک سے ایسے ذی اقتدار حاکم کے اُٹھ جانے کا صدمہ کیسا ہوتا ہے۔ جب ملکہ معظمہ نے وفات پائی۔ تو اضلاع متحدہ امریکہ کے باشندوں نے ہمارے ساتھ سب سے زیادہ اظہار ہمدردی کیا تھا۔ اور سب سے زیادہ عزت اور تعظیم ملکہ متوفیہ کی ظاہر کی تھی۔ اصل یہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے یہ دونو قومیں ایک دوسرے کی قریب ہوتی جاتی تھیں۔ ملکہ متوفیہ کے انتقال نے باہمی اخوت اور اتحاد کے سرخط پر مُہر لگادی۔ آج اُس مہر کی پھر تجدید ہوگئی ہے۔ اور عہدنامہ پھر پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ تازہ ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس کی تحریر ایک مقتول کے بےگناہ خون سے ہے اور اسکا کاغذ دونو قوموں کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ مگر دونو قومیں ایک ہوکر مسٹر مکنلے کو رورہی ہیں۔

زعفران کی ابتدا ہماری لاعلمی کے پردہ میں پوشیدہ ہے۔ بعض تو اسے خاص کشمیر جنمی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی جڑ جو پیاز سے بہت مشابہ ہوتی ہے شیوجی نے کسی گوپی جسکا یہ سارا گل کھلایا ہوا ہے اور بعض ایرانی الاصل بتاتے ہیں مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کی کاشت کاری قدیم الایام سے اس سرزمین میں چلی آتی ہے جسکی نسبت عجیب عجیب روایات مشہور ہیں جو نظر انداز کی جاتی ہیں۔

ایام گذشتہ میں زعفران کی کاشت یہاں بہت ترقی پر رہتی تھی۔ چنانچہ عہد مغلیہ میں اور خصوصاً اکبر اعظم سے شاہ جہان تک ۱۰ ہزار سے ۱۲ ہزار بیگہ تک زمین اس کے زیر کاشت تھی اور یہ اپنی معراج کمال پر پہنچ گیا تھا۔ مگر بعد میں بہ سبب متواتر حوادثات ملکی اور قحط سالیوں کے لوگ اسکی جڑوں تک زمین سے کھود کر کھا گئے جس سے پیداوار میں نہایت ضعف آگیا مگر آجکل پھر رو بہ ترقی ہے۔

یہ موسم کشمیر کا عجب دلکش ہوتا ہے۔ ہوا اور فضا نہائت صاف و شفاف۔ آسمان پر کہیں کہنے کو بھی بادل کا کوئی گالا دکھائی نہیں دیتا۔ سورج اپنی پوری رونق سے منزل روز طے کرتا ہے۔ دھوپ میں تمازت کا نام نہیں۔ نور ہے بے نار جس میں آب ہی آب ہے اور تاب کا نام تک نہیں۔ شہر سے وہاں تک سڑک باقاعدہ اور مصفا۔ بائیں جانب پانپور تک برابر فصیل کوہ اور دائیں طرف آب جہلم ایک خاموشی کے عالم میں اپنے آسمانی رنگ کے پانی کے لئے اپنے رستہ پر سانپ کی طرح کہراتا اور بل کھاتا چلا جاتا ہے۔

خزاں کی نیرنگی اور رنگ آمیزی سے سیر کا لطف اور بھی دوچند ہو جاتا ہے جس طرف دیکھو سرخ و سبز پوش اور جدھر نگاہ کرو گلابی اور زعفرانی قبائیں بردوش درخت ایک آن بان کے ساتھ کھڑے ہیں۔ چنار جو اس دیار کے شان و شوکت کا سرتاج ہے اور ہر موسم میں نیا رنگ لاتا ہے۔ اس کے منہہ پر شفق پھولی ہوئی ہے اور اس کے شاندار خیمے لیسے سرخ دکھائی دیتے ہیں کہ گویا کسی کے خرمن عیش میں آگ لگی ہو۔ سفید سے۔ سبز و بسنتی لباس

کبھی قدردانی کی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ کبھی دنعت کے لبوں سے چومتے ہیں۔ اور
کبھی زینت بخش دستارِ عزت و افتخار بناتے ہیں۔ اسکا پھول عشق پیچاں کے پھول
سے قدرے چھوٹا اور گل بنفشہ سے کچھ بڑا ہوتا ہے مگر شکل و شباہت اور رنگت
کے لحاظ سے گل بنفشہ کے قریں تر ہوتا ہے۔ ذرا اس بنفشی سرخی لئے نیلگوں غلاف
کو اٹھا کر دیکھئے اسی میں شمع مراد پوشیدہ ہے۔ جسکو آپ زرگل کہتے ہیں۔

بہ مستوری چراغ سوز دل پرتوے دارد
برنگ شمع بیروں شو بہ بزم شور سامانی (مولوی روحی)

یہی طلائی منقش کی تاریں جو اپنی ارغوانی رنگت سے حسینوں کی آنکھوں کے دوروں کو
شرماتی ہیں جیسے شب کی چاندنی منجمد ہو کر رہ گئی ہو۔ اصل زعفران ہے۔ یہی وہ زعفران
ہے جسکی رنگت عاشق مزاجوں کے چہروں سے کبھی نہیں چھوٹتی۔ اور بڑے بڑے برہمنوں
کی پیشانیوں پر دھرم کا ٹیکا بنکر چمکتی ہے۔

ان تریوں کو پھول سے جدا کر کے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اوپر کا حصہ جو
اصل ارغوانی رنگ کا ہوتا ہے علیحدہ رکھا جاتا ہے اور مگرہ کہلاتا ہے۔ نیچے کا حصہ
جو کچھ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ لچھہ نام پاتا ہے۔ اس نازنین کو دہقانوں کے سخت سخت
ہاتھوں سے تڑوا کر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ پہلے چندے دھوپ
میں سکھاتے ہیں۔ پھر ایک باریک چھڑی کی نرم نرم ضربوں سے کوٹتے ہیں۔ پھر ایک
پانی کے مٹکے میں غوطہ دیتے ہیں وزنی زعفران تہ میں جا بیٹھتا ہے اور افسردہ پنکھڑیاں
پانی کی سطح پر تیر آتی ہیں۔ پانی کو گرا دیا جاتا ہے۔ اور کیسر نکال لیتے ہیں یہ زعفران شاہی کا
معزز خطاب پاتا ہے۔ بڑا کمیاب ہوتا ہے اور سونے کے مول تولا جاتا ہے۔ فصل کے
دنوں میں کشت زاروں اور کارخانہ پر سرکاری پہرہ بیٹھ جاتا ہے اور ایک ایک پھول
کی حفاظت کان طلا کی طرح عمل میں لائی جاتی ہے۔

رنگوں کی تصویریں اپنے سینہ صافی کے آئینہ میں لیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس سے دلآویز نظارہ شب ماہ کا ہے۔ کوہستان شرق سے بدر کامل کا سر اٹھانا۔ ان کی آن میں کسی کے بخت سیاہ کی طرح تاریک وادی کو اپنی نورانی شعاعوں سے بھر دینا پہاڑوں کے آسیب دار سایوں کا سمٹنا او سمٹ سمٹ کر نیچے دامنوں سے لپٹ جانا زعفران زار چاندنی کا چھٹکنا گویا تاروں بھری رات کا زمین پر اتر آنا۔ اسکے پر نور کرنوں کا پھولوں کے رنگین فانوسوں میں سمانا اور دریا کے آئینہ سیال میں جلوں بدر کا ٹوٹ ٹوٹ اتر آنا ایسے جنون خیز سامان ہیں کہ جنکو دیکھ کر فرط انبساط سے غش نہ کرنا اور حواس خمسہ کا سلامت رہ آنا ایک ناممکن سا امر معلوم ہوتا ہے مگر تعجب ہے کہ پھر سب کے سب اچھے خاصے چلے آتے ہیں۔

اے نیند کے ماتو جاگو اور اے محفل شب کے متوالو اٹھو اور آفتاب عالمتاب کے ساتھ اپنی آنکھیں ملاؤ۔ جس کے جہان افروز نور سے عالم معمور اور تاریکی کافور ہوگئی ہے پہاڑوں نے اپنے بازو ناز سے کھول دیئے۔ ساحل دریا نے انگڑائی لی گویا ابھی نیند سے جاگا ہے۔ تخت چمن آراستہ ہے اور رات کا دلکش سین آنکھ کی پتلی کی طرح پھیل گیا ہے خوش نوا پرندوں نے اپنے گھونسلے چھوڑ دیئے۔ وادی مینو سواد کی گود خرمن گل سے بھری ہے اور گل زعفران کا ساغر آبحیات سے لبریز۔ رات کے اس خود رفتہ کرنے والے نظارہ کو دیکھ کر شبنم نے اپنے تمام موتی لٹا دیئے جو سبزے اور پنکھڑی پر اس انداز سے بکھرے ہوئے ہیں کہ شرر کی نثاری اور آزاد کی گل کاری پانی پانی ہوئی جاتی ہے۔ ایکو صبا نے بھی اپنا خرام ناز دکھایا۔ نسیم کے نرم نرم جھونکوں سے نازک ادا شاخوں نے جھومنا شروع کیا۔ پھول سر ہلانے لگے۔ اور موتی زمین پر لوٹنے لگے۔ روح پرور خوشبو کی لپٹیں اٹھیں اور اٹھ کر تمام دشت و کوہسار میں روح رواں کی طرح پھیل گئیں۔

مگر یہ دلفریبیاں اور سحر کاریاں کب تک۔ اس جان بخش ہوا کے جھونکوں

پہنے ہر طرف پرے باندھے سربلند ہیں۔ دوسرے جوانانِ چمن بھی ہفت رنگ گلیوں قباؤں سے مزین ہیں جنکی دو روزہ نوک ابھڑکی پر انکو خود بھی مایوسی ہے۔ ہوا کے چلنے سے رنگ برنگ پتوں کا بکھرنا ایک گلباری کا سماں دکھاتا ہے جو ایک دوسری بہار سے مشابہ ہے اور جسکو خزاں کا شگوفہ کہتے ہیں اسی سے پتہ چلتا ہے کہ خزاں اور بہار میں فرق ہے تو اتنا کہ ایک صبح ہے تو دوسری شام ؎

جنوں پسند ہی مجھ کو ہوا ہو نوں کی + عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

پامپور کے قریب جاکر ذرا شرق کی طرف نظر اٹھاؤ تو ایک قطعہ مرتفع نہایت نامحسوس اٹھان کے ساتھ بلندی کی طرف راغب ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور رفتہ رفتہ منتہائے نظر تک پہنچکر ایک نہایت دلفریب اور خوش قطع ہلال نما وادی کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے جسکے گرد مدوّر پہاڑی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایسے قطعہ مرتفعہ کو یہاں کریوہ کہتے ہیں جو عام طور پر پہاڑوں کے دامنوں میں کم و بیش سلامی چبوتروں کی صورت میں لگے رہتے ہیں اور اپنی زرریزی کے لئے مشہور آفاق ہیں۔ اِس کریوہ کی گود میں طفل زعفران کی پرورش ہوتی ہے۔

جب سورج نیلگوں آسمان کا سارا میدان خالی کر کے مغربی کوہستان کی گھاٹیوں میں اپنا منہہ چھپائے کو ہوتا ہے تو زعفران زار کی کشت ایک دلچسپ کیفیت رکھتی ہے۔ منتہائے نظر پر سبز سبز اور نیلی نیلی پہاڑیوں کی لمبی قطار۔ اور اس کی ناہموار مگر سڈول آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مخروطی چوٹیاں۔ مغربی اُفق پر شفق کا پردہ ارغوانی اور پاؤں میں ایک دلکشا وادیٔ شادمانی۔ درختوں پر پرندوں کا شور اور پکار اور وادیٔ عیش جاودانی زمین گل سے رشک دشت تاتار جس کی زندگی بخش ہوا اور جان پرور خوشبو سے دیکھنے والوں کی آنکھیں شاداب۔ دل شگفتہ اور دماغ معطر ہوتے جاتے ہیں۔ پس پشت دریائے بہت ایک سکران کے عالم میں اپنی پُرتمکنت رفتار کو پورا کرتا اور آسمان کے بدلنے والے

دوراستے

نوروز کی رات تھی - ایک پیر نوّد سالہ اپنے اُجڑے گھر کے دروازہ میں کھڑا تھا اُس نے اپنی حسرت بھری نگاہیں گہرے نیلگوں آسمان کی طرف اُٹھائیں جہاں کہ ستارے ایک صاف اور ساکن جھیل کی سطح پر تیرنے والے سفید اور خوشنما کنول کے پھولوں کی طرح بکھرے ہُوئے تھے - لو! اب اُس نے اپنی یاس مجسّم آنکھیں زمین میں گاڑدیں - کیا دیکھتا ہے کہ ہزار ہا زن و مرد جن میں سے وہ کسی کو بھی اپنے جیسا نا اُمید اور تیرہ بخت نہیں پاتا - اپنے منزلِ مقصود یعنی قبر کیطرف سرگرم رفتار ہیں - وہ سفر ہستی کے کئی منازل قطع کرچکا ہے لیکن وہ اپنے سفر سے کوئی تحفہ بجز گناہ و غم نہیں لایا - اُس کی صحت تباہ ہوچکی ہو - اُسکا شکستہ دل پُر از اندوہ و غم ہے اور اُسے اپنے ایّام پیری میں راحت کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی - اُسکا عہدِ شباب اُسکے سامنے ایک دُھندلے سایہ کی طرح ظاہر ہُوا - جبکہ اُس کے باپ نے اُسے دو سڑکوں کے موڑ پر کھڑا کیا تھا - کون دو سڑکیں؟ ایک تو وہ جو ایک سرسبز پُر امن اور دلفریب گھاٹی کی طرف جاتی ہو - جو عطر آگیں ہَوا سے مہک رہی اور شیریں نغموں اور دلکش گیتوں سے گونج رہی ہے - ہائے! وہ سرزمین جہاں شادمانی ہی شادمانی ہے - جہاں چاروں طرف انگوروں کی لطیف بیلیں لہلہارہی ہیں اور جہاں باغات رشکِ فردوس ہیں - اور ایک وہ جو مسافر کو ایک گہری اور اندھیری غار کی طرف لیجاتی ہے - جسکے آگے کوئی رستہ نہیں جہاں پانی کی بجائے زہر بہ رہی ہے اور جو سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن ہے -

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرطِ نا اُمیدی سے چیخ کر کہا - "اے عہدِ شباب! واپس آ - اے میرے پدرِ بزرگوار! مجھے پھر ایک دفعہ اُسی جگہ پر کھڑا کردے - تاکہ میں اپنے

ہیں زہرِ ہلاہل کی تاثیر ہے اور دمِ مسیحائی میں آہِ سرد نہاں۔ جو خاندانِ گل کو تباہ اور ملکِ گلشن کو ویران کر دینگے۔ اِس خزاں کی نیرنگی پر از خود رفتہ نہ ہو۔ بس جان لو کہ موسم نے آنکھیں پھیر لیں اور زمانہ نے رنگ بدلا۔ اِس اشارہ کو سمجھ جاؤ اور کنارہ کش ہو جاؤ۔

ساقیا قدحے کہ باز از گردشِ چشمِ فلک ۔۔۔ شیشۂ دل شد مکدّر خاطرِ رنداں گرفت

سنگِ جورِ آسماں آئینۂ دل را شکست ۔۔۔ موجِ خوں برخاست ملکِ دیدہ حیراں گرفت

ترکتازِ لشکرِ بادِ خزانی در چمن ۔۔۔ ہر رو سیلابے کہ پائے خانۂ ویراں گرفت

بختِ گل برگشت و عہدِ دولتِ بلبل نماند ۔۔۔ زہر آمیز است کامِ دل۔ دلِ بستاں گرفت

رخصت اے یاراں کہ باز از بستنِ رنگِ خزاں ۔۔۔ گلشنِ کشمیر چوں روئے مہِ تاباں گرفت

روزگارے شد کہ ایں خاک است دامنگیرِ ما ۔۔۔ حیرتم صادق کہ چوں دامانِ آزاداں گرفت

رختِ خود بیروں کش و برخیز و دامن برفشاں ۔۔۔ زعفراں را دیدہ باید راہِ ہندوستاں گرفت

صادق علی خاں

اعجاز القرآن اس محققانہ سلسلۂ مضامین کے دو نمبر اس رسالہ میں درج ہو کر نکاتِ فرقانی کے شائقین کی مسرت کا باعث ہو چکے ہیں۔ اور ان مضامین کو پنجاب کے کئی اخبارات نے مخزن کے حوالہ سے اپنے کالموں میں جگہ دی ہے۔ اب فاضل مضمون نگار مولانا ابوالحسن صاحب صدیقی رجسٹرار ہائی کورٹ حیدرآباد نے اپنے احبابِ خاص کے اصرار سے اس سلسلہ کو جس میں کُل پانچ مضمون ہیں ایک خوبصورت سے رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ جس کا نام وہی ہے جو مضمونوں کا عنوان تھا۔ اس کی شیوع سے باقی تین مضمونوں کے لئے مخزن میں جگہ نکالنے کے فکر سے ہم سبکدوش ہو گئے ہیں اور ہمیں نہایت خوشی ہے کہ اب شائقین کو مکمل سلسلہ ایک رسالہ کی صورت میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ مولانا موصوف سے طلب فرمائیں +

خیابانِ فارس

ذیل میں ہم کتاب "خیابانِ فارس" سے جو لارڈ کرزن کی مشہور کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ اور جسے منشی جعفر علی خاں صاحب بی۔اے تیار کر رہے ہیں ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ کے درج کرتے ہیں۔ گزشتہ سال میں اس ترجمہ کا بصراحت ذکر ہو چکا ہے:۔

طہران کو خیرباد کہتے وقت میں اپنے ناظرین کو ایک ایسے دربار کی تصویر کا ایک رُخ دکھاؤنگا جو عظمت و شان کے لحاظ سے زمانہ سابق میں سلاطین مغلیہ کے دربار کا ہمسر تھا اور ایک ایسی طرز حکومت کا نقشہ کھینچکر بتاؤنگا جسپر باستثنائے چین مشرقیت کا سب سے زیادہ رنگ چڑھا ہوا ہے اور بالآخر ایک ایسے شہر کی سیر کراؤنگا۔ جس میں ایک ایشیائی دارالسلطنت کی ناقابل تغییر خصوصیات کے ساتھ یوروپ کے مستعار لوازم تمدن ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ طہران سے ایک شاہراہ جسکے عرفی مفہوم کا اطلاق صرف نوّے میل کے ایک ٹکڑے پر ہو سکتا ہے اُس عظیم الشان سطح مرتفع کی تدریجی حدود فاصل کی طرف ہماری رہنمائی کرے گی جو سطح سمندر سے بحساب اوسط چار ہزار سے لیکر پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہوگی اور جو ایران کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس سطح مرتفع کے کثیر التعداد سلسلہ ہائے کوہ شمالی اور جنوبی سمندروں کے مابین آرے کے دندانوں کی طرح حایل ہیں۔ جو کم یا زیادہ وسعت کے میدان ان پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں اُنپر ہم کو بڑے بڑے مگر ویران شہروں کی شکل میں گئی گزری شان و شوکت۔ شرمناک بے عنوانی اور اندرونی انحطاط کی محسوس یادگاریں نظر آئینگی۔ تم اپنے اوہام و تعصب اور مورخانہ ... کے پردہ کے پیچھے سے ان دمکتے ہوئے سنہری قبوں کی جھلک دکھا رہا ہوگا جو اولیا کر ...

لئے اچھا رستہ منتخب کر سکوں" لیکن وائے بد قسمتی اُسکا عہد شباب اور اُسکے باپ کی عمر وقت از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ تھے۔ اور اُنکے واپس آنے کی تمنا کرنا فعل عبث تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک ستارہ آسمان سے ٹوٹا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اسے اُسنے اپنے لئے ایک اشارہ سمجھا۔ اور ایک سخت چوٹ اُسکے زار و نزار دل پر لگی۔ پھر اُس نے اپنے عہد شباب کے دوستوں کو یاد کیا۔ جنہوں نے اُسکے ساتھ ہی سفر ہستی شروع کیا تھا۔ جو نیکی اور محنت کے رستہ پر چلے تھے۔ اور آج نوروز کی رات کو جنکا استقبال خوشی اپنی سہیلیوں عزت اور دولت سے ساتھ کر رہی تھی۔ جامع مسجد کے موذن نے نعرہ اللہ اکبر بلند کیا۔ اور اِس آواز نے اُس کے کانوں میں گونج کر اُسے اپنے والدین کی حیات کے وہ لمحے یاد دلائے۔ جب وہ اپنے غافل بیٹے کو خداوند باری تعالیٰ کی عبادت کیطرف راغب کیا کرتے تھے۔ شرم اور رنج سے مغلوب ہو کر اب اُسے آسمان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ پڑتی تھی جہاں کہ اُسکا باپ رہتا تھا۔ اُس کی سیاہ آنکھیں ساون بھادوں کے بادلوں کیطرح آنسو برسانے لگیں۔ اور پوری نا اُمیدی کی حالت میں وہ پکارا۔ "اے جوانی واپس آ۔ اے عہد شباب واپس آ"۔ اور اُسکا عہد شباب واپس آیا۔ کیونکہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا جو وہ نوروز کی رات کو دیکھ رہا تھا۔ البتہ اُسکے گناہ فی الحقیقت تھے۔ اُسنے دلی گرمجوشی سے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ ابھی وقت ہے۔ میں ہنوز اُس گہری غار میں نہیں کودا۔ اور میں ابھی تک اس رستہ پر چلنے کے لئے آزاد ہوں جو سرسبز اور پُر امن گھاٹی کیطرف جاتا ہے اور جہاں مجھے اُمید ہے کہ میں اپنی محنت کا کافی و وافی معاوضہ پاؤنگا۔ اے لوگو! اگر آپ ابھی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہو اور اپنا رستہ منتخب کرنے کے لئے متذبذب ہو تو یاد رکھو کہ جب وقت گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں اگر پاؤں پھسلا اور تاریک غار کی طرف گیا تو تم زار زار روؤگے۔ اور رونا کچھ فائدہ نہ دیگا۔ چیخو گے کہ "اے جوانی واپس آ۔ اے عہد شباب واپس آ"۔ اور شباب واپس نہیں آئیگا ؎

(مفتی غلام جعفر۔ فرخ)

آگرہ

جمنا کے مغربی کنارے پر الہ آباد سے براہ ریل ۲۷۹ میل پر یادگار شاہانِ قدیم جسے آگرہ کہتے ہیں۔ آباد ہے۔ آبادی الہ آباد سے کچھ کم ہے۔ اس شہر کے پاس جمنا کی دھار مشرق کی طرف بہت تیزی سے بڑھ گئی ہے۔ ٹھیک کنارے پر جہاں کہ زاویہ بنتا ہے قلعۂ آگرہ واقع ہے۔ آگرہ اکبر سے پہلے سلطنت لودی کے بادشاہوں کا مسکن تھا۔ لیکن اُنکا شہر جمنا کے مشرقی کنارے پر تھا۔ ۱۵۲۶ء میں بابر نے فتح کے بعد آگرہ کے پُرانے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اسکو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہاں اُس نے ۱۵۳۰ء میں وفات پائی لیکن اُسکا مدفن کابل میں ہے۔ ہمایوں نے اپنا دربار دہلی میں مقرر کیا۔ اکبر نے پھر آگرہ میں اپنا پایۂ تخت بدل دیا اور موجودہ شہر کی دریا کے مشرقی کنارے پر بنا ڈالی۔ اُس کا نام اکبر آباد ہوا۔ اکبر نے قلعہ کو ۱۵۶۶ء میں بنایا۔ اور پھر اور محلات بنانے شروع کئے۔ اکبر کے بعد جہانگیر بادشاہ ہوا۔ اُس نے اپنے باپ کا مقبرہ سکندرہ میں بنایا۔ شاہ جہان کے زمانہ میں آگرہ کی عمارات اَوجِ کمال کو پہنچ گئیں۔ اورنگ زیب نے دہلی کو پھر پایۂ تخت بنا لیا اور اکبر آباد پر زوال آنا شروع ہوا۔ آگرہ میں بعدہٗ بہت سے تبدلات ہوئے۔ ۱۸۰۳ء میں آگرہ کو انگریزوں نے لارڈ لیک کے زمانہ میں مرہٹوں سے لے لیا۔ ۱۸۳۵ء میں شہر نے پھر سنبھالا لیا۔ کیونکہ ممالک مغربی و شمالی کا دار الخلافہ یہی قرار پایا۔ لیکن بعد غدر کے یہ امتیاز پھر آگرہ کے ہاتھ سے جاتا رہا اور الہ آباد پھر دار الخلافہ مقرر ہو گیا۔

آگرہ کا قلعہ سُرخ پتھر کا بنا ہوا ہے اور اس کی دیواریں ۷۰ فیٹ اُونچی ہیں اُس کے اندر مختلف تعمیرات ہیں جو محلاتِ شاہی کے لوازم میں ہیں۔ قلعہ میں ایک دربار عام اور ایک دربار خاص ہے۔ علاوہ انکے اور بہت چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں۔ شیش محل سنگ مرمر

ہوئے کر و فر۔ اپنے باغوں کی خزاں رسیدہ فضاؤں اور اپنے عظیم الشان محلوں کی شکستہ حالی سے جو کبھی زمانہ میں چھ لاکھ پچاس ہزار کی آبادی کی دھمک سے گونجا کرتے تھے ایک حسرت اور درد سے بھری ہوئی داستان سُنا رہا ہوگا گوکہ اس کے پر رونق بازاروں کی گہما گہمی سے ابھی تک اس بات کا ثبوت ملتا ہو کہ بنج بیوپار میں یہاں کے لوگ سرگرمی سے مشغول ہیں اور قومی تجارت فروغ پر ہے۔ شیراز جس میں کبھی حافظ کے دلکش ترانوں کی شیریں صدا آتی تھی اور جو سعدی کے فلسفہ آمیز کلام کی شور انگیزی کا نکہداں تھا ان شعرا کے مقابر کو اپنی آغوش میں لئے ابھی تک اُن پر نازاں نظر آرہا ہوگا لیکن اس کے دلفریب چمنستان۔ رکنے رقص کناں فوارے۔ اور اس کی جانفزا بہاریں اُن لوگوں کے ساتھ چلی گئی ہیں جو انکی مدح میں رطب اللّسان تھے اور جنکا اب فقط نام باقی رہگیا ہے جسکی یاد آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہے ٭

ظفر علی خان

سیرۃ الشّرف۔ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ بہاری مرحوم کے حالات زندگی اور صوفیانہ خیالات کے بیش بہا ذخیرہ کو عام فہم اُردو میں ایک خوبی کے ساتھ جمع کر کے "سیرۃ الشرف" کے نام سے اَلپنچ بانکی پور میں چھپوایا گیا ہے۔ اس ذخیرہ کو جمع کرنے والے ہمارے کرمفرما مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ پٹنہ ہیں۔ جنکو شیخ موصوف سے ارادت خاص معلوم ہوتی ہے۔ مولوی صاحب اُن چند مسلمان رئیسوں میں ہیں جو باوجود امارت اور وجاہت ظاہری کے دولت علم کی تلاش میں رہتے ہیں اور جو علوم باطنی کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ ایسے رؤسا مغتنمات سے ہیں۔ اور اپنے ہم چشموں کے لئے اچھی اور قابل تقلید مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ جلد ساڑھے تین سو سے زیادہ صفحہ کی ہے۔ اور ۱ عہ کو سید محمد عبد الحکیم صاحب شیخ منور علی صاحب سے پٹنہ۔ محلہ صدر گلی کے پتہ پر مل سکتی ہے +

سیر تاج محل

شہر آگرہ بہت خوبصورت نہیں مگر اس کے سر پر وہ شاہجہانی تاج ہے کہ اسے دنیا کے شہروں میں ممتاز کہوں تو بجا ہے۔ سبحان اللہ! کیا عمارت ہے جسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ہے اور عجب نہیں کہ ان سب میں اول نمبر ہو۔ میں نے جب پہلے ہی پہل اسے دیکھا تو شام کا وقت تھا دروازہ میں قدم رکھتے ہی حیرت خوشی اور افسردگی کی ایک عجیب مجموعی کیفیت دل پر طاری ہوگئی۔

دروازے سنگ سرخ کے ہیں اُن میں سنگ مرمر اور رنگین پتھروں کے گل پھول بنے ہوئے ہیں۔ دروازہ سے روضہ تک خوشنما باغ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔ نہر میں فوارہ چھوٹ رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ کی مچھلیاں تیرتیں اور دیکھنے والوں کا دل بہلاتی ہیں۔ نہر کے وسط میں سنگ مرمر کا حوض ہے اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دماغ کو معطر کرکے سن سے نکل جاتے ہیں تو عجب تفریح حاصل ہوتی ہے۔ میں حوض پر کھڑا ہو کر عمارت کو دیکھنے لگا۔ ایک عجب شان نظر آئی۔ روضہ سارا سنگ مرمر کا ہے اس میں محرابوں پر سرخ و سبز رنگ کے پتھروں کے بیل بوٹے بنے ہوئے عجب بہار دکھا رہے ہیں سامنے صحنچیاں اور سنگ سرخ کا بڑا احاطہ دونو طرف مسجد و تسبیح خانہ جن میں ہزار ہا طرح کی صنعت کے نمونہ موجود وسط میں روضہ اور اس کی شاندار دلفریب عمارت یہ کل منظر ایسا خوشنما اور عالیشان معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اس کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ اللہ! گویا جنت میں جو موتی کے محل عطا ہونگے۔ انکا نمونہ نہیں دکھا دیا گیا ہے پاس جا کر دیکھئے تو انسان حیرت کے مارے

کا حمام سیکڑوں چھوٹے چھوٹے شیشوں سے آراستہ ہے۔ موتی مسجد شاہ جہان نے ۱۶۵۴ء میں تعمیر کی تھی۔ یہ مسجد سرخ پتھر کی کرسی پر بنی ہے اور محراب سفید سنگ مرمر کی ہے۔

تاج محل شاہ جہان اور اس کی عزیز بی بی کا مقبرہ آگرہ کا فخر ہے۔ اور ہندوستان بھر میں سب میں اچھی عمارت ہے۔ ممتاز محل نے ۱۶۲۹ء میں دار فانی سے کوچ کیا اس کی رحلت کے بعد اس عمارت کی فوراً بنیاد ڈالی گئی اور ۱۶۴۸ء میں ختم ہوئی تاج محل جے پور کے سنگ مرمر اور فتح پور سیکری کے سرخ پتھروں سے بنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں قریب دو کروڑ کے روپیہ صرف ہوا۔ یہ عمارت جمنا کے کنارے پر شہر آگرہ سے قریب دو میل ہے احاطہ میں بذریعہ ایک بڑے پھاٹک کے داخل ہوتے ہیں۔ سامنے ایک خوشنما سبزہ باغ ہے۔ خاص عمارت دو کرسیوں پر قائم ہے پہلی سرخ پتھر کی ۲۰ فٹ اونچی اور ایک ہزار فٹ چوڑی دوسری سنگ مرمر کی ۱۵ فٹ اونچی اور ۳۰۰ فٹ مربع ہے۔ عمارت ۱۸۶ فٹ مربع ہے۔

آگرہ مختلف ریلوں سے ملحق ہے۔ ٹونڈلہ مقام اتصال آگرہ سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے درمیان میں ایک جمنا کا پل پڑتا ہے۔ آگرہ میں غلہ بکثرت ہوتا ہے۔ سنگ مرمر کا جڑاؤ اور باریک کام یہاں سب سے زیادہ مشہور دستکاری ہے۔

سید امیر حیدر بخت۔ اکبرآبادی

نہ ہے صفائی عمارت کہ ورتماشائش بدیدہ باز نہ گردد نگاہ از دیوار

جب شاہ جہان کا زمانہ اور اُس زمانہ کی اسلامی سلطنت کی شان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور ساتھ ہی موجودہ حالت پر نظر پڑتی ہے تو حسرت کی گھٹائیں دل پر چھا جاتی ہیں۔ ساری بشاشت ہوا ہو جاتی ہے۔ وُہ کیا زمانہ ہوگا جب یہ عمارتیں بن رہی ہونگی ۔ دلوں کے جوش اور عزم کا کیا عالم ہوگا کیسے کیسے صاحبِ کمال موجود ہونگے۔ یا ایک یہ دن ہے کہ زمانہ اُنکے نقشوں کو مٹا رہا ہے۔ اب ہم ہیں نہ کمال باقی ہے نہ علم و فن ہاں اگر کچھ رہگیا ہے تو یادِ رفتگان ۔ مگر اس سے کیا حاصل۔

جوہر بڑوں کے تم ہیں اگر کچھ بھی ہوں تو جانیں
گر وُہ نہیں تو بابا یہ سب کہانیاں ہیں

سجاد مرزا بیگ (از سلطانپور دکن)

غزل

تا درِ جاناں ہمیں اُڑ دل تو جانا منع ہے — گر گئے تو حلقۂ در بھی ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا تب وُہ بولا کون ہے؟ — اب بتادیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے
نام گر بتلا دیا سُن کر کے وُہ چپ ہو رہا — اب پکاریں کس طرح سے غل مچانا منع ہے
گر پکار غل مچایا ۔ وُہ تو خود پردہ میں ہے — سامنے بے پردہ ہوکر اُسکو آنا منع ہے

سامنے بے پردہ ہوکر گر وُہ آیا تو کیا۔
اے ظفر ایسی بکہ دل ہی لگانا منع ہے

ظفر

نقشِ دیوار بنا تا ہے۔ صنّاعوں نے وُہ وُہ تراش خراش کی ہے ایسی ایسی جالیاں اور گل بُوٹے بنائے ہیں کہ صرف دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہیں۔ بیگم کے مزار پر جو کتبہ ہے اُس کا خط اس قدر عمدہ ہے کہ مَیں کہہ سکتا ہُوں کہ اس سے بہتر انسان کے ہاتھ نے نہیں لکھا اور اگر اسلام میں بھی خدانخواستہ بعید از عقل باتیں مانی جاتیں تو ضرور یہ روایت مشہور ہوتی کہ کوئی یاقوت رقم دیوتا لکھ گیا۔ رنگین پتھروں کے پھول جو مزار پر بنے ہُوئے ہیں اسقدر خوشنما ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا اصلی پھُول جو مزار پر چڑھائے گئے ہونگے زمانہ کے اثر سے پتھر بن گئے۔ ایک ایک پھُول میں بیشمار پتیاں ہیں اور ہر پتّی کا رنگ الگ جوڑ سے جوڑ ایسا ملا ہوا کہ خوردبین بھی فرق نہیں دکھا سکتی پتّوں کے موڑ توڑ گل بوٹہ پنکھڑی شاخ بیل ہر ایک اصل سے مشابہ۔ کہتے ہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے دستِ مُبارک میں آہن موم ہو جاتا تھا۔ شائد ان صناعانِ چابکدست کے ہاتھ میں قدرت نے یہ تاثیر دی تھی کہ پتھر موم ہو جاوے اور یہ اُسے جس طرح چاہیں گھڑ لیں۔

تہ خانہ بھی جہاں اصل مزار ہے سنگ مرمر کا ہے اس گرمی میں بھی نہائت سردی ہوتی ہے۔ گویا جنّت کے جھونکے جو ان مغفوروں کے مزار پر آتے ہیں اُسے ہمیشہ ٹھنڈا اور تفریح بخش رکھتے ہیں۔

اگرچہ عرصہ گزر گیا تھا مگر دل نہ چاہتا تھا کہ یہاں سے جائے۔ بڑی دیر سیر کے بعد مینار پر چڑھا تو یہاں سے کچھ اَور ہی عالم نظر آیا۔ اب آفتاب بالکل غروب ہو گیا تھا۔ اور ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۱۸ھ کی پانچویں رات کا چاند گویا اُس منظر کی پُوری پُوری سیر دکھانے کے لیے شمع لیکر حاضر ہوا تھا۔ چاند کی روشنی میں وُہ عمارت کچھ اَور ہی بہار دکھاتی تھی۔ نیچے جمنا لہریں مار رہی تھی۔ دُور دُور تک جنگل نظر آتا تھا دُوسری جانب شہر کی عمارتیں دُھندلی روشنی میں دکھائی دے رہی تھیں۔ روضہ کی عمارت پر چاند نے گویا مہتابی چھوڑ دی تھی کہ وُہ اَور بھی چمک اُٹھی اور سر سے پاتک نُور ہی نور برسنے لگا۔

اگر ہے وہ بھی اسباب کی پابند۔ اور بعض دفعہ ایسے ہی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ گھڑیاں تیز یا سست ہو جاتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی گھڑی زیادہ خراب وقت دینے لگتی ہے۔ کسی پر کم اثر پڑتا ہے اور بعض تو مطلقاً اس اثر سے بچ نکلتی ہیں۔

جب یہ حالت ہو کہ گھڑیوں میں سے کچھ اچھی ہوں جو عادتاً عمدہ وقت دیا کریں اور کچھ بری بھی ہوں جنکی ہمیں ہمیشہ نگرانی کرنی پڑے اور ذرا سے موسم کے تغیر و تبدل اور ہوا و زمین کی برقی قوت کی کمی بیشی اور دیگر اسباب سے ہر ایک گھڑی کی چال میں کم و بیش فرق آجاتے تو یہ ضروری ہوا کہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار ہو جس سے ہم گھڑیوں کا وقت ٹھیک کر سکیں۔ اس غرض کے لئے بڑے بڑے شہروں میں دوپہر کے ٹھیک بارہ بجے توپ چلائی جاتی ہے۔ یا بہت سے گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔ اور لوگ اپنی گھڑیاں اس وقت ٹھیک کر لیتے ہیں کہیں کہیں دھوپ گھڑیاں بنتی ہیں اور لوگ اپنی گھڑیاں ان کے مطابق کر لیتے ہیں۔ مگر عام رواج یہی ہے کہ یا تو توپ سے گھڑی ملائی جاتی ہے اور یا لوگ خود ریلوے اسٹیشن پر جا کر ریل کی گھڑی سے اپنی گھڑی ملا لیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریل کی گھڑی اور توپ پر لوگ کیوں اعتبار کر لیتے ہیں اور انکی اپنی گھڑی جو کچھ کہ رہی ہو اس پر کیوں اعتبار نہیں کرتے اسکا جواب سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ لوگوں نے دیکھ لیا ہے کہ اچھی گھڑیاں عموماً توپ اور ریل کی گھڑی کے مطابق پائی جاتی ہیں۔ اور اگر سو دو سو بری گھڑیاں بھی دیکھی جائیں تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ توپ کا وقت ہی ٹھیک ہوگا کیونکہ بری گھڑیوں میں سے کوئی توپ کے آگے اور کوئی پیچھے ہوگی۔ اور ان سب کو اگر کسی ایک وقت پر متفق کرنا چاہو تو اتفاق توپ ہی کے وقت پر ہو سکیگا۔ اور حق بھی یہی ہے کہ ریل اور توپ کا وقت ایک رصدگاہ سے لیا جاتا ہے۔ جہاں بہت سی گھڑیاں عمدہ سے عمدہ رکھی رہتی ہیں۔ اور انکی کثرت رائے پر ریل کی گھڑی اور توپ کا وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ چونکہ گھڑیوں کی

گھڑیوں سے اخلاقی سبق

اِس زمانے میں گھڑیاں تو اس قدر عام ہو رہی ہیں کہ کوئی شخص اُن سے ناواقف ہوگا۔ بڑے بڑے شہروں میں گھنٹہ گھر بنے ہوئے ہیں جنکی گھڑیاں دن رات اپنی آہنی زبان سے اہل شہر کو بتاتی رہتی ہیں کہ لو ۵ گھڑوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی۔ بڑی بڑی عمارتوں پر گھڑیاں لگی ہیں۔ گھڑی فروشوں کی دکانیں ہیں کہ گھڑیوں سے لدی پڑی ہیں۔ بازار در بازار میں چلتے ہوئے اگر وقت دریافت کرنے کی ضرورت ہو تو پانچ قدم کی مسافت میں آپ کو ضرور ایک نہ ایک آدمی ایسا ملجائے گا جسکی جیب میں گھڑی ہوگی۔ بڑے بڑے شہروں میں تو ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوگا جس نے گھڑی کی شکل نہ دیکھی ہو۔ اور اتنی بات بھی ہر ایک جانتا ہے کہ گھڑی کو آٹھ پہر یا آٹھ دن میں ایک دفعہ چابی دی جاتی ہے۔ اسکے اندر بہت سے پہئے ہوتے ہیں جو چلتے رہتے ہیں۔ ان پہیوں کے ساتھ دو سوئیاں بھی حرکت کرتی ہیں۔ جو اپنی آہنی انگشت سے ہر وقت اشارہ کرتی رہتی ہیں کہ کتنے گھنٹے گذر چکے ہیں۔

جب گھڑیوں کی واقفیت اس قدر عام اور اُنکا رواج ایسا عالمگیر ہو تو ہمیں اُنکے متعلق کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاید آپ کی جیب میں اسوقت بھی کوئی گھڑی ہو اور آپکے دیگر احباب کے پاس بھی گھڑیاں ہونگی۔ تو آپ کو شاید کبھی خود یہ شکایت پیدا ہوئی ہوگی یا احباب میں سے کسی نے کبھی یہ شکایت کی ہوگی کہ میری گھڑی وقت ٹھیک نہیں دیتی۔ یا کسی نے کبھی یوں کہا ہوگا کہ آجکل میری گھڑی کچھ تیز (فاسٹ) چلنے لگی ہے۔ یا یہ کہ آج میری گھڑی پانچ منٹ سست (سلو) تھی۔ شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ گھڑی میں اسقدر ارادہ کہاں کہ کبھی تیز اور کبھی سست چلنے لگے۔ گو گھڑی میں علم و ارادہ نہیں

ہوجاتا ہے۔ پر اگر انہیں دُنیا کی وسیع رقبہ پر پھیلا دیا جائے تو پھر صرف اصُولِ ساخت پر اُنکا اتفاق رہ جائیگا۔ جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ کل دُنیا کی گھڑیاں آٹھ پہر کو چوبیس گھنٹے میں تقسیم کرتی ہیں۔

ان تمام امور پر غور کرنے سے آپ یہ دو نتایج نکال سکتے ہیں۔ (۱) یہ کہ ہر شخص کو جو گھڑی کا مالک ہو یہ اختیار ہے کہ گھڑی کو جس مُلک کے وقت کے برابر رکھنا چاہے رکھے۔ اگر وُہ چاہے تو جسوقت لنڈن میں دوپہر ہو اسوقت اس کی گھڑی بارہ بجائیگی۔ اور اگر وُہ چاہے تو سلطنت ترکی کی طرح جسوقت سُورج نکلے اسوقت ایک بجایا کریگی۔ (۲) لیکن گھڑی کے مالک کو یہ اختیار نہیں کہ وُہ اپنی گھڑی کو اس طرح چلائے کہ وُہ ہمیشہ آٹھ پہر کو دس گھنٹوں یا بیس گھنٹوں میں تقسیم کیا کرے۔ اگر مالک یہ کرنا چاہے تو وُہ اپنی گھڑی کو توڑ کر دھر دیگا۔ اور گھڑی کی زندگی ہفتوں یا دنوں تک محدود ہو جائیگی۔ ہاں گھڑی کا بنانے والا اگر چاہے تو وُہ گھڑی کے اصُولِ ساخت کو بدل سکتا ہے اور ایسی گھڑیاں بنا سکتا ہے جو آٹھ پہر کو صرف دس یا بیس گھنٹوں میں تقسیم کیا کریں۔

اب رہا یہ سوال کہ گھڑیوں کا اصُولِ ساخت ایسا کیوں رکھا جائے کہ وُہ دِن رات کو چوبیس گھنٹے پر تقسیم کریں۔ کیا اِس سے زیادہ اچھے وقت کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ اِس سے اچھی تقسیم وقت کی کیجا سکے۔ اور یہ سوال کرنے کا ہمیں حق بھی ہے۔ کیونکہ ہم بھی اِس لائق ہیں کہ گھڑی بنا سکیں۔ اور اس ضرورت کو بھی سمجھتے ہیں۔ جس کے لئے گھڑی بنائی گئی ہے۔ اور وقت کی طرز تقسیم کے بدلنے سے جو خُوبیاں یا خرابیاں پیدا ہونگی انکو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اور انکے انسداد پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن کیا گھڑی بھی یہ حق رکھتی ہے کہ وُہ ایسا سوال کرے۔ ہر ایک عقلمند کہدیگا کہ نہیں۔ کیونکہ گھڑی سمجھ نہیں سکتی کہ وُہ کس ضرورت کی دوا ہے۔ کیونکہ وُہ ضرورت خود گھڑی کو کبھی پیش نہیں آتی۔ گھڑی کے پیش نظر تو اپنی زحمت رہے گی کہ مجھے

کثرت رائے اس وقت کے حق میں ہوتی ہے۔ اس لئے منفرداً ہر ایک گھڑی کو اُسکے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں سو دو سو گھڑیوں کا اتفاق ایک وقت پر ہو جاتا ہے۔ کیوں نہیں سو دو سو گھڑیاں سو دو سو مختلف اوقات بتاتیں۔ اگر ایک نے ٹھیک ۱۲ بجائے ہُوئے ہوں تو دوسری کیوں دس نہیں بجاتی اور تیسری ایک کیوں نہیں بجا دیتی۔ یہ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ تمام گھڑیوں کا اصُولِ ساخت ایک ہے اس لئے لابُدّ ہے کہ سب کی طرز روش ایک ہو۔ گو ذاتی نقائص کے باعث ان میں خفیف سی بدروشی پیدا ہو جائے مگر اتفاق اُنکا اگر ہوگا تو اسی امر پر ہوگا جسکے لئے انہیں وضع کیا گیا ہے اور گھڑیوں میں سے اچھی گھڑی وُہی سمجھی جائیگی جو اپنے اصُول ساخت کی ہم آہنگ رہے اور اپنے مُوجد کے منشار کو پُورا کرے۔ جو گھڑی اِس طرزِ عمل سے ٹل جائیگی دُنیا خواہ مخواہ اسے مردُود کر دیگی۔ اور یہ عذر کوئی نہ سنیگا کہ شاید کل دُنیا کی گھڑیاں غلط ہوگئی ہوں اور یہ ایک گھڑی ٹھیک وقت دے رہی ہے۔

لیکن یہ بھی نہیں ہوتا کہ کل دُنیا کی گھڑیاں ایک ہی وقت پر اتفاق کر لیں۔ بلکہ ہر ملک میں دوپہر کا وقت جدا ہوتا ہے اس لئے ہر ملک کی گھڑیوں کا اتفاق اپنے ملک کی دوپہر پر ہوتا ہے۔ آجکل کے مدرسوں کا طالب علم یہ جانتا ہے کہ جسوقت انگلستان میں دوپہر کے بارہ بجتے ہیں اسوقت ہمارے مُلک میں تقریباً شام کے چھ بجتے ہیں۔ اور امریکہ میں اسوقت قریباً صبح کے چھ بجتے ہیں۔ تو گویا جس طرح انسانوں میں۔ ہر ملکے وہر رسمے۔ کا مسئلہ جاری ہے اسی طرح گھڑیوں میں ہے۔ اگر آجکل آپ یہ چاہیں کہ کل دُنیا کی گھڑیوں کو ایک خاص وقت پر متفق پائیں تو آپ کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی گر باوجود اس عدم اتفاق کے پھر بھی گھڑیوں کا اصُول ساخت ایک ہے اور وہ اس پر تو ضرور متفق ہیں۔ اگر وُہ ایک ہی آب وہوا میں رہتی ہوں تو اُنکا ذرا ذرا سی باتوں پر اتفاق

ضابطہ اخلاق کل دُنیا پر ایک ہے۔ اور امور کے حسن و قبح کی تمیز میں ہم سب متفق اللفظ ہیں۔ کیا ہندی اور کیا انگریز و حبشی سب ہی زنا۔ چوری۔ دغا۔ قتل۔ جھوٹ کو بُرا جانتے ہیں۔ اور سب ہی راستبازی۔ دیانتداری۔ سلامت روی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں مگر یہ اتفاق کیوں ہے۔ آجکل نئی روشنی والے تو یوں کہدینگے کہ یہ انسانی عقل عامہ کا حسن ہے۔ اور اس کے فیصلہ جات اصولاً کل دُنیا پر یکساں ہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیوں ایک ہیں۔ اسکا جواب سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ یہی انسان کی فطرت ہے اور بنانے والے نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ وُہ ان امور پر متفق رہیں۔ یا یُوں کہو کہ خدا نے ارادتاً کل انسانوں میں ایسی عقل رکھی ہے۔ اور جس طرح جو شخص گھڑیوں پر غور کرتا ہے وُہ گھڑیوں کو اس بات پر متفق دیکھتا ہے کہ سب دن رات کو چوبیس گھنٹہ میں تقسیم کرتی ہیں اور اُسے خواہ مخواہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ گھڑی بنانے والے کی اصلی غرض گھڑی بنانے سے یہی تھی کہ وُہ دن رات کو برابر چوبیس گھنٹہ میں تقسیم کیا کرے۔ اسی طرح جب ہم دیکھتے ہیں کہ سب آدمی اخلاقی امور میں متفق ہیں تو ہمیں خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ گو انسان کو پیدا کرنے میں اللہ میاں کی اور بھی کوئی غرض ہو مگر انسان کی پیدائش کی یہ غرض تو ضرور ہے کہ وُہ زنا چوری دغا قتل جھوٹ کو معیوب اور راستبازی دیانت اور سلامت روی کو مستحسن سمجھے اور دیگر امور اخلاقی کا پابند رہے

انسان اور گھڑیوں میں جو مماثلت ہے وُہ صرف اسی ایک اصُول پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جس طرح گھڑیوں میں اچھی گھڑیاں ہیں جو اپنے اصُول ساخت کی پابند ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں بھی اچھے انسان ہیں جو اپنی فطرت کے پابند ہیں۔ اور جس طرح گھڑیوں میں بُری چال کی گھڑیاں ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی بُرے چلن کے لوگ ہیں جو اپنی فطرت کے خلاف چلتے ہیں۔ اور بزور عادت بُری چیز کو اچھا یا اچھی چیز کو بُرا سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر یہی لوگ ہیں جنہیں بُری گھڑی کی طرح سوسائٹی مردود کر دیتی ہے اور جنہیں کبھی نہ کبھی

ناحق دن رات چولیں رگڑنی پڑتی ہیں۔ اسکو اپنی زحمت کے مقابلہ میں ہماری ضرورت کبھی نہ جچے گی۔ وُہ تو یہی کہے جائیگی کہ میرے بغیر بھی حضرت انسان کا کام چلتا تھا پھر مجھے اِس مدامی زحمت میں کیوں ڈالا۔ لیکن اگر گھڑی ایسا اعتراض کرے بھی تو کیا اسکی شنوائی ہوگی۔ کیا ہم اُسے بند کر کے رکھ دینگے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر وُہ بضد ہو کر ہمارے منشا کے خلاف کرنا چاہے تو خواہ مخواہ اس کی چولوں میں تیل اور بال کمانی کو تاؤ دیا جائیگا۔ پُرزے بُرش اور چاک سے رگڑے جائینگے اور اسے مجبور کیا جائیگا کہ ہمارے منشا کو پُورا کرے اور اپنے اصُول ساخت (جسے فطرت کہہ سکتے ہیں) کی پابند رہے۔ اور گھڑی بھی نسبتًا آرام سے زندگی بسر کرنا چاہتی ہے تو اسے بھی چاہیئے کہ چپ چاپ اپنے نوشتۂ تقدیر (کیونکہ نوشتۂ تقدیر فی الحقیقت فطرت یا اصُولِ ساخت کا نام ہے) پر قانع ہو کر اپنا فرض منصبی پُورا کرتی رہے۔ اور ساعی رہے کہ میری چال میرے اصُولِ ساخت کے مطابق ہو۔

ناظرین! گھڑیوں کی جو حالت مَیں نے عرض کی ہے۔ آپ بھی اس سے متفق ہونگے۔ انسان کی بھی ٹھیک یہی حالت ہے۔ کل دُنیا کے انسان ایک ہی اصُولِ ساخت پر بنے ہیں۔ اور اُن سب کی فطرت ایک ہے۔ گو آب و ہوا کے اختلاف کے باعث اُن میں جزوی اختلاف پیدا ہو گئے ہیں اور ہر ملک کی رسم علیحدہ ہو گئی ہے۔ مگر فطرت سب کی ایک ہے۔ جن اُمور کو ہم ہندوستان میں مستحسن سمجھتے ہیں۔ اکثر انہیں اُمور کو باوجود اِس بعد مسافت کے فرنگستان اور امریکہ اور آسٹریلیا میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اور جن باتوں کو ہم ہندی معیوب سمجھتے ہیں۔ انکو ہی دُنیا کے ہر طبقہ پر بُرا مانا جاتا ہے۔ اگرچہ آسٹریلیا کے لوگ بالکل وحشی و جاہل ہیں اور امریکہ و انگلستان کے سفید چہرہ لوگ بزعمِ خود مہذب ترین اقوام ہیں۔ اور ہم ہندی کیا از روئے رنگ کے اور کیا از روئے عمومیت تعلیم و صنعت کے اِن دونوں کے بین بین ہیں لیکن

سے دن پورے کرتا تھا اس لیے میں نے مار ڈالا اور اُسے مُصیبت سے چھڑا دیا۔ اگر آپ انصاف کریں تو یہ دلیل کچھ ایسی بودی نہیں۔ مہذب ترین اقوام کی یہ عام عادت ہے کہ اگر کسی کتے یا گھوڑے کے ایسی چوٹ لگ جائے کہ اُس کی صحت سے مایوسی ہو جائے تو بے تردد اس جاندار کو گولی مار دیتے ہیں۔ اگر پاگل نے اسی قانون کو ایک حیوان ناطق کے حق میں نافذ کر دیا تو اُسے حق بجانب سمجھنا چاہیے۔ مگر کوئی نہیں سمجھتا۔ یہ کیوں۔ محض اسی لیے کہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اسکے سوا اور کوئی وجہ وجہ پیش نہیں کیجا سکتی۔ کیونکہ حیوان مطلق اور حیوان ناطق دونوں ہی جاندار ہیں۔ اور دونو ذی حس ہیں۔ دونوں کو جان پیاری ہے دونوں موت سے ڈرتے ہیں۔ تو جب حیوان بیگناہ کو مُصیبت سے چھڑانے کے لیے مار ڈالنا مستحسن سمجھا جاتا ہے تو انسان بیگناہ کو مصیبت سے چھڑانے کے لیے مار ڈالنا کیوں معیوب سمجھا جائے۔ مگر باوجود اس منطق کے بے گناہ کا قتل معیوب ہی سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ خدا نے کل دُنیا کے انسانی دماغوں میں یہ مسئلہ مضمر کر دیا ہے کہ بیگناہ انسان کا قتل منع ہے۔ ہم اسیقدر جانتے ہیں کہ ہماری فطرت قتل کو بُری نگاہ سے دیکھتی ہے یہ ہم جان نہیں سکتے کہ مذکورہ بالا حالت میں انسان کا قتل فی الواقعہ اچھا ہے کہ بُرا ہے مگر ہمارا معیار اخلاق ہماری فطرت چونکہ اس کے خلاف فتویٰ دیتی ہے اس لیے اتفاق اسکے خلاف ہوتا ہے اور میاں پاگل کو اپنی ڈھائی اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے کے پاداش میں پاگل خانہ کی سیر کرنی پڑتی ہے۔ ان سب باتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ انسان کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ کل اسی کام کے لیے موزون بھی ہے۔ اس کے پُرزے ہی اُسے اسی کام کی طرف کھینچ کر بُلاتے ہیں۔ سب انسان اصُول اخلاق پر متفق ہیں اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وُہ اچھا انسان بنے اسکے لئے ضروری ہے کہ وُہ اپنی فطرت کا تتبع کرے۔ لیکن ڈاکٹر اب اس امر پر متفق ہوگئے ہیں کہ حیوانوں کا

تاؤ بھی دیا جائیگا۔ جس طرح بری گھڑی کا وقت کبھی سند نہیں سمجھا جاتا اسی طرح برے آدمی کا چلن کبھی سند نہیں ہوتا اور جمیع اقوام کا اس پر کبھی اتفاق نہیں ہوتا۔ گو برا شخص بجائے خود اپنی عادت یا اپنے رسم و رواج کو کیسا ہی مستحسن کیوں نہ سمجھے۔ یہ معیار جیسا کہ افراد کے واسطے درست ہے ویسا ہی اقوام کے لئے ہے۔ اگر آپ کسی ایک شخص کے اخلاق کی جانچ چاہتے ہیں تو سو دوسو آدمیوں کے اخلاق سے مقابلہ کرکے آپ صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کسی قوم کے اخلاق کی جانچ کرنا چاہیں تو آپ کو متعدد اقوام کے اخلاق سے مقابلہ کرکے دیکھنا ہوگا۔ پھر جدھر کثرت رائے ہو جائے اسی کے سامنے دوسری قوم کو سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔ اس موقعہ پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ایک پاگل سے کسی نے پوچھا کہ تم پاگل خانے میں کیونکر آ پہنچے۔ پاگل نے جواب دیا کہ بات تو کچھ نہ تھی۔ ایک امر پر جھگڑا تھا۔ میں اسے بجا سمجھتا تھا۔ اور باقی سب لوگ اسے بیجا کہتے تھے۔ چونکہ مخالفوں کی تعداد زیادہ تھی اور مجھ سے کم متفق تھے اس لئے وہ سب مجھے پکڑ کر یہاں بند کر گئے۔ ناظرین! دنیا کی یہی حالت ہو۔ میاں پاگل تو بجائے خود یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کا سر پھوڑنے میں کوئی عیب نہیں۔ اور عیب تو کیا بلکہ یہ بڑا ہی کار ثواب ہے۔ اور آپ لاکھ چاہیں کہ انکی سمجھ کا پھیر نکل جائے مگر نہ نکال سکینگے۔ جس طرح ایک صحیح حواس کے شخص کا یہ ایمان ہے اور اسے یقین واثق ہے کہ کسی بے گناہ کا سر پھوڑنا گناہ ہے۔ اسی طرح پاگل صاحب کو یہ یقین واثق ہے کہ بے گناہوں کو اگلے جہان بھیجدینا بڑا ہی ثواب کا کام ہے۔ مگر دنیا کبھی پاگل سے متفق نہیں ہوسکتی۔ اگر لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ تم اس پاگل سے کیوں اتفاق نہیں کرتے تو وہ بیسیوں وجوہات پیش کردینگے۔ مگر ہر دلیل کی بنیاد اسی یقین پر ہوگی کہ "بیگناہ کا قتل گناہ ہے"
اسی طرح پاگل بھی اگر وہ قطعاً مجنون نہ ہو تو اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سے دلائل پیش کرسکتا ہے۔ شاید وہ یہ کہدے کہ مقتول مفلس تھا ٹکڑوں کو ترستا تھا۔ بڑی مصیبت

نوچندی

میرٹھ کی نوچندی کا میلہ اور نمائش ہندوستان بھر کے مشہور میلوں میں ہے اور دور دور سے لوگ اس میلے کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور خوش ہو کر جاتے ہیں جب سرسری دیکھنے والوں کی یہ کیفیت ہے تو اہل میرٹھ کے دلوں کا تو کیا پوچھنا۔ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔ مگر جیسے میلے کی آمد کی انکو خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ ویسے ہی انکو اسکے خاتمہ کا رنج بھی زیادہ ہوتا ہے۔

سرآمد شعرا حضرت بیان یزدانی مرحوم کے ایک شاگرد رشید منشی طفیل حسین صاحب تعلّی کی ایک پسندیدہ نظم نوچندی کی تعریف میں ہمارے دوست شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی غازیپوری دہلی سے ارسال فرماتے ہیں۔ جس میں اس میلہ کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ اور دکھایا گیا ہے کہ ایک شاعر کے دل پر ایسے واقعات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم اس نظم کو بڑی خوشی سے درج کرتے ہیں۔ گو افسوس ہے۔ کہ اسکو مکمل نہیں چھاپ سکتے۔ لیکن جس قدر حصہ درج کیا جائیگا۔ اُس سے حضرت تعلّی کی قوتِ تحریر اور طبیعت کا بخوبی اندازہ ہو سکیگا:۔

ہائے نوچندی کا عالم کیا کہوں کیا کیا نہ تھا آٹھ دن تک تختۂ باغِ ارم ویرانہ تھا
خیمہ خیمہ مہرِ عالمتاب کا کاشانہ تھا ڈیرہ ڈیرہ الغرض اندر کا عشرت خانہ تھا
رنگ رلیاں سو بسو عیش و طرب شاہانہ تھا

دیتے تھے جاروب کش جاروب مانندِ صبا کیوڑا سقے چھڑکتے پھرتے تھے صبح و مسا
مست کرتی تھی سقوں کے کٹوروں کی صدا بجتے تھے شام و سحر عشرت کے باجے جابجا
ولولہ رندانہ تھا ہر زمزمہ مستانہ تھا

تھی دو رویہ رونقِ بازارِ خوبی آشکار ہر دکان پہ جلوہ گر اشیائے نادر بے شمار
آگے پیچھے گاہکوں کی آتی جاتی تھی قطار نقد لینے والے گویا کھائے بیٹھے تھے ادھار
کون سا سر تھا نہ سودے کا جسے سودا نہ تھا

اصولِ ساخت دیکھنے کے بغیر انسان کی ساخت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح انسان کی فطرت کو کماحقہٗ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کل دنیا کے لوگوں کے اخلاق و عادات کا مطالعہ کر کے صحیح نتیجے نکالے جائیں اور ایک حد تک حیوانی عادات کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ موقعہ ہر شخص کو حاصل نہیں۔ نہ کسی کو اتنی فرصت ہے نہ اتنی سہولت حاصل ہے کہ کل جانداروں کے اخلاق کا مطالعہ کرے۔ اور پھر انسانی عقل غلطی بھی کھاتی ہے۔ اس لئے اس ذات نے جو حیوانوں اور انسانوں کا بنانے والا ہے اور حیوانی انسانی فطرت کا موجد ہے خود ہی ایک ضابطۂ اخلاق طیار کر کے ہمیں عنایت کر دیا ہے جو لوگ غلطی سے محفوظ رہنا چاہیں وہ اس کی طرف توجہ کریں +

غلام نقشبند

غزل

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

سکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہئے
جنونِ وحشت و فصاد و نشتر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

خیالِ یار کا دل سے خفا ہوتا قیامت ہے
کسی کے عشق دل تے ناز پرور یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد انکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اسی پر تھا حسرت تجھے ترکِ محبت کا۔
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ہیں

حسرت (موہانی)

کرتی تھی بادِ صبا گلگشتِ گلشن جا بجا
پھول کھاتے تھے ہوا کھولے ہوئے بندِ قبا
جھومتے تھے سبز پودے جس طرح صوفی بجا
شوق سے آپس میں اِک اِک نخل ہم آغوش تھا
چشمِ نرگس نے کبھی ایسا چمن دیکھا نہ تھا

زینتِ صحنِ گلستاں حُسن تھا دربار کا
لال پردوں کی وہ زیبائش وہ سقف خوشنما
رفعت افلاک کرسی وہ ستوں باصد صفا
سرو و شمشاد و صنوبر تھے چمن میں جا بجا
جشنِ جمشیدی نے بھی ایسا مکاں پایا نہ تھا

پر نویں اپریل کو جب ہو گیا میلا اُجاڑ
بادِ صرصر کو بھی پھر جنگل میں چلنا تھا پہاڑ
پھر وہی ریتے کے تودے پھر وہی کانٹوں کے جھاڑ
آسماں نے وہ زمیں گلشن بنا کر دی اُجاڑ
آج وہ عبرت کدہ ہے کل جو عشرت خانہ تھا

کل جہاں آرائشِ قصد نمائش گاہ تھی
کل جہاں خورشید و ماہ کی چشم فرشِ راہ تھی
کل جہاں تاکید آئینِ بندیِ خرگاہ تھی
کل جہاں خیموں کی کثرت سے جگہ کوتاہ تھی
کل جہاں بن سر جھکائے چرخ چل سکتا نہ تھا

آج واں حیرت سے وا ہیں دیدۂ نقشِ قدم
آج واں ماتم سے ہر شاخِ شجر ہے دستِ غم
آج واں تن کر بگولے چلتے ہیں جائے خیم
آج واں میداں ہی میداں ہے تا دشتِ عدم
تھی بس اک دو دن کی بستی پھر وہی ویرانہ تھا

تھے جہاں طاؤس بکر نغمہ سنج و نغمہ زن
آج واں کرتے ہیں فریاد و فغاں زاغ و زغن
کل جہاں پھولا ہوا تھا عیش و عشرت کا چمن
آج ہے سُونی زمینِ سخت اور سُنسان بن
کھیل جو بگڑا نہ ہو بن کر کوئی ایسا نہ تھا

کل جہاں کیسی تھی رنگا رنگ لیمپوں کی چمک
آج واں روشن نظر آتے ہیں سب ذرّے تلک
کل جہاں ہوتی تھی خیرہ چشمِ خورشیدِ فلک
آج واں حیرت سے رہ جاتا ہے نظارہ بھچک
اس چمن سے رنگِ عبرت فرضِ ہر فرزانہ تھا

اے تعلّی اب وہ گلچھرے وہ خود بسندی کہاں
وہ دلوں کے ولولے وہ آرزو مندی کہاں
وہ صباح و شام آرائش کی پابندی کہاں
اب وہ نوچندی کہاں یارو وہ نوچندی کہاں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

سیر کرتے تھے سمندوں پر وہاں کے شاہسوار　　　سبزۂ خط کی طرح سبزے پہ کوئی گلعذار
زیبِ مشکی کوئی جیسے ابر میں برق آشکار　　　طرفہ طرفہ رنگ کے تھے کیسے کیسے راہوار
ابلقِ شام و سحر کا رنگ جم سکتا نہ تھا

ناچتی تھیں شامیانوں میں پریچہرہ رنڈیاں　　　صدر میں بیٹھے تھے خوش قد پہنے زریں بنڈیاں
جابجا لعل و جواہر کی کھلی تھیں منڈیاں　　　پھول سے تن - ہاتھ میں پھولوں کی نازک ڈنڈیاں
پھول ہر ایک ایک شکلِ بلبلِ مستانہ تھا

پارسی کرتے تھے تھیٹر میں تماشا رات بھر　　　کر رکھا تھا روشنی سے رات کو رشکِ سحر
تھا جمالِ پارسی سے پارسائی کو خطر　　　ناچنا گانا غرائب تھا عجائب ناچ گھر
کیا تماشا گاہِ عالم میں وہ حیرت خانہ تھا

گہ دکھایا پردہ کے پردہ میں کوہِ کوہکن　　　گہ بہائے اشک ساں پیشِ نظر نہرِ لبن
غیرتِ پرویز بن بیٹھا کوئی استادِ فن　　　صورتِ شیریں بن آیا گہ کوئی شیریں دہن
ہاتھ میں تیشہ سنبھالے کوئی فرہادانہ تھا

وصفِ نوچندی کہیں سوسن کے تھا وردِ زباں　　　دیدۂ نرگس کسی جا پر تھا نظارہ کناں
تھا جماتا لہلہا کر رنگ اپنا ارغواں　　　اور اڑاتی تھی مزے کیا کیا بہارِ زعفراں
لالہ کے پھولوں سے صحنِ باغ آتشخانہ تھا

وہ زلیخائے شبِ مہتاب کا کرنا سفر　　　یوسفِ خور کا چہِ مشرق سے ہونا جلوہ گر
وہ نسیمِ صبحدم کا چلنے پر کسنا کمر　　　جھلملا جانا چراغِ شام کا وقتِ سحر
رنگِ روئے شمع پرّاں ہمرہِ پروانہ تھا

چلنا مستانہ نسیمِ صبح کا وہ جھوم جھوم　　　شوق سے وہ بے دھڑک غنچوں کے منہ کو لینا چوم
نغمہ سنجانِ گلستاں کا وہ گردِ گل ہجوم　　　وہ طیورِ بوستاں میں صبح کی آمد کی دھوم
کیا سہانا وہ سماں - عالم وہ کیا مستانہ تھا

پنجے میں جب عدو کے جہانگیر پھنس گیا
اور حکمِ قتلِ نور جہاں صاف لکھ چکا

تو ہی تھا جس نے نور جہاں کو بچا لیا
اُس دم بلا کو ٹالنا تیرا ہی کام تھا

زنجیرِ عشق سے جو ہوں دو دل بندھے ہوئے
گر فرق اُن میں آئے کسی اتفاق سے

ایسے دلوں کی صلح کرانا ہے تیرا کام
بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانا ہے تیرا کام

معشوق کی جو آنکھ کو کرتا ہے تو پُر آب
عاشق کی بدگمانی کا ہے بہترین جواب

بھر لاتے آنکھ میں تجھے جب کوئی مدعا
سمجھے نہ کس کا دل تجھے اک وعدہ وفا

ہوتا ہے قصرِ دل میں جو وارد خیالِ یار
دل اُس پہ تجھکو کرتا ہے مثلِ گہر نثار

تو چشمِ دل ہے۔ آمدِ دلبر کی سن خبر
کرتا نظر ہے آنکھ کی کھڑکی سے جھانک کر

وہ آنکھ جس میں ہوتا ہے تو جلوہ گر ذرا
انساں کی حسرتوں کا ہے جامِ جہاں نما

قطرہ ہے پر تعمق دریا نما ہے تو
پیمانہ بحرِ روح کی گہرائی کا ہے تو

اے اشک! تیرے وصف یہ سب ٹھیک ہیں مگر
نیرنگ کو بھی کاش دکھائے تو کچھ اثر

نیرنگ

خیالِ یار

آنکھ کا تجھ کو۔ خیالِ یار! تارا ہیں کہوں
اپنا دلبر اپنا جانی اپنا پیارا ہیں کہوں

جان و دل کی تاب طاقت اور سہارا ہیں کہوں
دردِ اُلفت کا علاج اور غم کا چارہ ہیں کہوں

تو اگر دل میں نہ ہو تو یہ خذف ہے دل نہیں
اپنے پہلو ہی میں رکھنے کے یہ پھر قابل نہیں

جانِ جاں سب ہے تو ہو تجھ پہ صدقے میری جانِ زار
گوشۂ تنہائی میں تو ہی ہے ہمراہِ غمگسار

ایک آنسو سے دو دو باتیں

اے اشک! تو عجیب ہے، طرفہ ہیں تیرے کام! — رکھوں نہ کیوں بلاغتِ خاموش تیرا نام

جو بے زباں ہے درد سے اُسکی زباں ہے تو — جو قابلِ بیاں نہیں اُسکا بیاں ہے تو

ہو جوشِ دل نے جس کی زباں کو جکڑ دیا — کون اُسکی معذرت میں ہو گویا ترے سوا

عاشق کے دل میں جتنے ہیں ارماں بھرے ہوئے — تیرے سوا ہے کون جو دلبر سے کہہ سکے

جب دیکھتی ہے رُوح کوئی رازِ کائنات — یا رنگِ بے ثباتیِ ہنگامۂ حیات

اُس کیفیت کو کہہ نہیں سکتی کبھی زباں — تیری ہی لب سے ہوتے ہیں جذبے وہ سب بیاں

جس کو پناہ دہر میں ملتی نہیں کہیں — ہوتا ہے تیرے در پہ وہ آکر جبیں گزیں

دُنیا میں جنکا کوئی نہیں غمگسار ہے — تو ایسے بیکسوں کا دل و جاں سے یار ہے

فریاد جس غریب کی سُنتا نہیں کوئی — اُس کے اپیل کی تو عدالت ہے آخری

افشائے رازِ عشق کا کھٹکا سا ہے تجھے — سازش ہے تیری آہ سے اور رنگِ زرد سے

ہمدردی نام کا رکھیں صدف جو نام — تو اُس صدف کا گوہرِ یکتا ہے لا کلام

چھا جائے دل پہ جب کوئی غم ابر کی صفت — ایک تو ہے تجھے دل سے جو کرتا ہے تعزیت

ہوتا ہے سنگِ راہِ وفا باصفا بھی تو — بنتا ہے کبھی برقِ اہلِ ریا بھی تو

وہ نیک لوگ ہوتے ہیں جو راہیِ فنا — تو بہترین تحفہ ہے ایسوں کی موت کا

دردِ محبّت

کیوں پسندِ طبع ہے بیتابیٔ اُلفت مجھے　　دردِ فرقت سے ہوا کرتی ہے کیوں راحت مجھے
درد اور پھر دردِ اُلفت کی خلش کو دیکھنا　　اور دلِ بیتاب حسرت کی روش کو دیکھنا
کون ہے دُنیا میں جو تکلیف کا مشتاق ہو　　راحت و آرام سے یا جسکو رہنا شاق ہو
سب کو ہے آرام۔ تجھ کو بیقراری ہی پسند　　اے دلِ مضطر تری کیسے نرالی ہے پسند!

دل جو محوِ لذّتِ دردِ فراقِ یار تھا　　اِس سوالِ خام کو سُنکر مرے کہنے لگا
وقت تھا جب میں بھی وقفِ راحت و آرام تھا　　غم سے نفرت تھی مجھے اور عیش سے بس کام تھا
اسے رہتا تھا مجھی میں تو تصوّر یار کا　　اور میرا ہی لقب تو مسکنِ آرام تھا
چشمِ حسرت لیتی تھی پابوسِ جاناں کی مزے　　اور حاصل تھے مجھے آغاز ارماں کے مزے
لطفِ آغازِ محبّت کا بیاں کیا کیجئے　　چشمِ نم کو اور اپنی خونفشاں کیا کیجئے

یاد ایامیکہ لطفِ یار با ما یار بُود　　لذّتِ آغازِ اُلفت مونس و غمخوار بُود
یاد ایامیکہ جانم محوِ لطفِ شوق بُود　　ویں دلِ ناکام مفتونِ نگاہِ یار بُود
یاد ایامیکہ چشمِ اشکبارِ شوق بُود　　با خیالِ روئے جاناں گریہا بسیار بُود
یاد ایامیکہ کامِ حسرتِ مشتاق را　　دامنش غیرت فزائے بادِ عنبر بار بُود

اُس زمانِ عیش میں مجھ کو نہ تھی پروائے غم　　یہ ثواب کر کے کیا ہے ہجر نے شیدائے غم
ہجرِ جاناں میں نہیں ہے مونسِ حسرت کوئی　　اِک فقط دردِ محبّت ہے نشانی یار کی

آ ٹھہر تو قلبِ مضطر میں مرے بن کر قرار آ مرے آئینۂ دل میں تو بن تصویرِ یار

ہو مرے پہلو میں بن کر داغِ حسرت تو مقیم

تو جدا دل سے نہ ہو۔ ہو جائے دل چاہے دو نیم

ناوکِ مژگاں کا سینے میں نہیں زخمِ کہن ہے نہ ہجراں میں کسی کے زیست پُر رنج و محن

مَیں نہ مثلِ قیسِ دیوانہ۔ نہ مثلِ کوہکن ہُوں سرِ کہسار پر مصروفِ محنت تیشہ زن

یاد ہے دل میں تری اور سر میں ہے سودا ترا

آ مرے مونس مبارک ہو مجھے آنا تیرا

مَیں خرامِ ناز و غمزہ کا تماشائی نہیں بوسۂ لب ہائے رنگیں کا تمنائی نہیں

چشمِ مست و گیسوئے پیچاں کا سودائی نہیں اور میں مفتون و فدائے نازِ رعنائی نہیں

پر خدا جانے مجھے کیا تو نے جادو کر دیا

ہے سمائے جاتی میرے دل میں تیری ہر ادا

مجھ کو خوش لگتی نہیں سروِ چمن کے لہلہے رنگِ گل دلکش نہ اچھے بلبلوں کے چہچہے

خوش کنِ دل آبِ جو ہے اور نہیں مینا و مے ہے نوائے چنگ بھاتی نے مجھے آوازِ نے

ہیچ ہے سب کچھ نظر میں اور تو سب سے عزیز

بلکہ تو محبوب سے بھی ہے مجھے بڑھ کر عزیز

گر تری صورت نہ دیکھوں جان نکلتی ہے مری گدگدی کرتی مرے دل میں تمنا ہے تری

تو نہ ہو گر تو وبالِ جان ہو مجھ کو زندگی اور نہ ہو پیدا مرے جینے کی پھر صورت کوئی

خاطرِ رنجور کا میرے ہے تو ہی مدعا

اور تو ہی مفہوم میری ہستی موہوم کا

نورالدین عنبر

خوبیِ چرخ کو گلشن کی زمیں بھولی تھی
عکس تھا سرخ گلوں کا جو شفق پھولی تھی

ہو رہا تھا پھولوں میں ہر نخلِ چمن یوں محسوس — جس طرح زیورِ گل پہنے کھڑی ہوتی عروس
جلوۂ بادِ بہاری تھا کہ دولہا کا جلوس — کہیں بلبل کے ترانے کہیں رقصِ طاؤس
ہر طرف نغمہ سرا مرغِ خوش آواز بھی تھے
جمع رقاص بھی تھے۔ سوز بھی تھے۔ ساز بھی تھے

پھول تھے بادِ گلستاں کے کنول تھے روشن — گل پہ شبنم کے وہ قطرے کہ خجل درِ عدن
بو وہ غنچوں کی دلاویز وہ حسنِ گلشن — جب صبا آ کے چلی بس گیا سب صحنِ چمن
دلِ گلچیں کو ہر اک گل کی تری کھینچے تھی
عطر پھولوں کا نسیمِ سحری کھینچے تھی

نور چھنتا تھا زمیں پر جو فلک سے ہر بار — جلوہ گر نخل تھے پر ضو صفتِ اختر بار
اوس گرتی تھی کہ تھی بادِ سحر گوہر بار — زلف پر پیچ و خمِ سنبلِ تر عنبر بار
سرد ہو ہو کے ہوائیں جو قریب آتی تھیں
باچھیں غنچوں کی مسرت سے کھلی جاتی تھیں

وجد میں جھوم رہے تھے چمنستاں کے نہال — سب بنے نکھرے ہوئے خوبانِ چمن کا تھا یہ حال
فاختہ سرو پر قمری تھی صنوبر پہ نہال — گل و بلبل میں دمِ صبح جو ہوتا تھا وصال
تھا یہ کھٹکا کہ نہ آگاہ ہو اس سے نرگس
آڑ کر لیتے تھے پتے کہ نہ دیکھے نرگس

درد دل کو کچھ تعلق ہے خیال یار سے ۔۔۔ اس لئے بیتابیٔ الفت پسند طبع ہے
ہجر میں کرتا ہوں ۔ غم کی میہمانی ہی سہی ۔۔۔ گر نہیں ہے یار تو اُس کی نشانی ہی سہی

یادگار اوست با غم آشنا یہا کنم
یا بہ رنجش شبہائے جدا ئیہا کنم

حسرت (موہانی)

کلامِ نفیس

یادگار انیس میر نفیس مرحوم کے نام سے کون واقف نہیں ۔ میر نفیس کے انتقال سے ملک مرثیہ گوئی کا تاجدار جہان سے اُٹھ گیا ۔ جس خوبی سے اس لائق باپ کے لائق بیٹے نے حضرت انیس کے نام کو زندہ رکھا اور روشن کیا ۔ اسی کا حصہ تھا ۔ جن لوگوں نے میدان سخن کے اس شیر کو گرجتے سُنا ہے ۔ وہ لکھنؤ میں موجود ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ میر نفیس کا کلام انکی زبان مبارک سے سُننا جس کسی کو نصیب ہوا ہے ۔ وہ عمر بھر اس لطف کو نہیں بھول سکتا ۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ انکے کلام کے ایسے حصے جو شائع نہیں ہوئے اور جو انکے متبرک جزدانوں میں اب تک محفوظ ہیں ۔ ناظرین مخزن کے لئے حاصل کریں ۔ میر علی محمد صاحب عارف نے جو میر نفیس مرحوم کے نواسے ہیں اور خود ایک بلند پایہ شاعر اور مرثیہ گو ہیں ۔ ہمارے عنایت فرما مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی وساطت سے وقتاً فوقتاً ہمیں کلام نفیس سے مستفید فرمانے کی اُمید دلائی ہے ۔ جس کے لئے تہ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے ۔ دو بند جو انہوں نے بھیجے ہیں ۔ خوشی سے درج رسالہ کئے جاتے ہیں :-

تماشائے قدرت

برگ سبز اپنی دکھاتے تھے چمک ایک طرف ۔۔۔ سبزہ و لالۂ تر کی وہ لہک ایک طرف
وہ گلستاں میں شگوفوں کی مہک ایک طرف ۔۔۔ بیچ میں نہر کے پانی کی جھلک ایک طرف

آفتاب

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

(غالب) (غ-م)

لبِ شیریں تک انکے آئی بات — بنگئی قند کی مٹھائی بات

کھیل زلفوں کو ہے الجھ پڑنا — اُن کی آنکھوں کی ہے لڑائی بات

نہ کسیکو کڑی کہی ہم نے — نہ کسیکی کڑی اُٹھائی بات

تازگی فکر کی کبھی نہ گئی — جب سنائی نئی سنائی بات

کہ گئے تم کنایہ میں کیا کیا — نہ کسی نے تمہاری پائی بات

تم جو گویا ہوئے تو پھول جھڑے — غنچہ سے منہہ میں رنگ لائی بات

یہ صدا آتی ہے خموشی سے — منہہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

تیرے شیریں کلام کو سنکر
پھر نہ آتش کسیکی بھائی بات

(حاجی علی خاں) (آتش)

کیونکر اُن پر پڑے نہ سب کی آنکھ — قد قیامت کا ہے غضب کی آنکھ

کیا تلون مزاج یار میں ہے — صبح کو پھر نہ تھی وہ شب کی آنکھ

کچکول

ہندوستان

اَے حصارِ عافیت اَے کشورِ ہندوستاں — زیب دیتا ہے اگر کہئے تجھے سارا جہاں
اِک طرف کھینچی ہے قدرت نے تری دیوار کوہ — موجزن ہو ایک جانب تیرے بحرِ بیکراں
چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وُہ عالم برف کا — ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا نشاں
بحر میں ہوتا ہے اِک شورِ قیامت آشکار — جبکہ اُس میں آکے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں
خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کا فکر — دستِ گلچیں نارسا و نخلِ دولت گلفشاں
تو نے فارغ کر دیا ہے فتح ملکِ غیر سے — پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیر انشاں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب عہدِ خزاں سے رخنہ اندازِ بہار

(غ - م - لاہوری) (حالی)

اَولاد

دولت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر — راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بہتر
لذّت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر — نکہت کوئی بُوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی رُوح یہی رُوح یہی ہے

(غ - م - لاہوری) (میر انیس)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا — یہ وُہ ہے لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

(سید مودود احمد) (غالب)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وُہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

(" ") (" ")

کفن کے واسطے کافی ہے دامنِ صحرا — بجائے شمع جلے گا یہ داغ دِل اپنا

ہماری قبر پہ کیا کام چادرِ گل کا — بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزارِ مرا

کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

(محمد بشیر الحق بیدل) (شاہ اکبر صاحب - اکبر داناپوری)

نہ پہ چڑھے یہ گریۂ چشمِ پُر آب سے — ٹکرائے آبگینۂ انجم حباب سے

(شاہ اکبر صاحب اکبر داناپوری)

دل بچے کس طرح حسینوں سے — ملکے سب چھین چھان لیتے ہیں

یہ بنا اوج خاکساری سے — کہ قدم آسمان بنتے ہیں

ہر گلوری پہ چھیڑ ہے اُن کی — ہم پہ رخصت کا پان لیتے ہیں

(امیر مینائی لکھنوی)

حشر کو مانتا ہوں بے دیکھے — ہے یہ ہنگامہ اس کی محفل کا

سدِّ راہ گرچہ تھی صعوبتِ راہ — نہ اُٹھا اشتیاق منزل کا

تھی غضب طرزِ پرسشِ ہمدرد — لب پہ آیا ہے مُدّعا دِل کا

(اقبال) (امراؤ مرزا انور دہلوی)

ہر آن آنِ دگر کا ہوا ہیں عاشق زار — وُہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

(مومن)

چمن نے سبز پوشی کی گھٹا نے کی سیہ پوشی — زمیں نے خاک اڑائی مجھ پہ رو دیا آسماں برسوں

شکستہ چند قبریں ہیں شرف اک ہو کا عالم ہے — میں رہتا ہوں وہاں مردہ نہیں آتا جہاں برسوں

(شرف لکھنوی)

مجھ سے قاتل کی شکل دکھلائی　　دشمنِ جان و دل تھی کب کی آنکھ

یار پیشِ نظر نظر آیا

کھل گیا پردہ بند جب کی آنکھ

(حامد علی خاں)　　(آتش)

آنکھیں نہیں ہیں چہرہ پہ تیرے فقیر کے　　دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

(آتش)

سکھائی کس نے چوری چشمِ تر اشکوں کے لڑکوں کو　　بھوئے یہ چور ایسے آنکھ کا کاجل چراتے ہیں

(معلن)

(داغ)　　(ظفر)

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے　　او شوخ چشم پھونک دے برقِ نگاہ سے

کس شان سے چلی ہے سواری حضور کی　　فتنے پکارتے ہیں ذرا ہٹ کے راہ سے

جھرمٹ میں بجلیوں کے ہے دل آہ آہ سے　　کیا ہو گیا یہ گر کے تمہاری نگاہ سے

دل لوٹتا ہے اُسنے جو دیکھا ہے چاہ سے　　ظالم نے تیر مارے ہیں سیدھی نگاہ سے

(معلن)　　(جلیل)

کیسے تجھ کو بھاوت ہے اور کیسے تو سُکھ پاوت ہے　　یہ پھلواری درد ہمیں کچھ اور سماں دکھلاوت ہے

کلیاں بن میں سوچت ہیں جو پھول کوئی کُملاوت ہے　　جو دن وا کو بیت گیو ہے وا دن ہم کو آوت ہے

(محمد بشیر انصاری)　　(میر درد)

سامنے آنے کا گر حکم نہ دیکھ ہو حجاب　　میری آنکھوں میں نظر بن کے سمائے کوئی

بے نشاں ہو کے ہوا شہرۂ آفاق عنقا　　نام دنیا میں ہو گر خود کو مٹائے کوئی

(سید احمد حمید تجت)

دیکھا دمِ کشتن رخِ قاتل کا نظارہ　　کیا آج مرے وقت میں کام آ گئیں آنکھیں

ہاں تم مری الفت سے مکر جاؤ مکر جاؤ　　کیا ہو گا اگر شرم سے شرما گئیں آنکھیں

کیوں باغ میں نرگس کے تلے مر گئے ارشد　　معلوم نہیں کس کی پسند آ گئیں آنکھیں

(ارشد گورگانی)

اس نزاکت پر ہمارے قتل کا دعویٰ ہے خوش
دیکھئے بیچے خبر وہ ہاتھ سے خنجر گرا

نکلی بسم اللہ اُسی کافر کے مُنہ سے بیدھڑک
آج اس انداز سے یہ عاشق مضطر گرا

چلے کیوں اے داغ اتنی پی گئے فرمایئے
سر پکڑ کر اب جو ہے فریاد میرا سر گرا

نفیس اے دل نہ کر تو اُس کی مژگاں کے اشارے کا
بھروسا کیا ارے نادان تنکے کے سہارے کا

جگر ٹوٹے ہی جاتا ہے تو دل تڑپے ہی جاتا ہے
یہ سینہ ہے الٰہی یا کوئی معدن ہے پارے کا

ہمیشہ فیض ہے دریا دلوں سے خاکساروں کو
کہ موج بحر تر کرتی ہے کیا کیا لب کنارے کا

گزر جائیگی ہر صورت کروں کیوں داغ اندیشہ
مرے مولا کو ہر دم فکر ہے میرے گزارے کا

کب وہاں مجھ سے زبوں حال کا ارماں نکلا
داورِ حشر بھی اچھوں ہی کا خواہاں نکلا

ہم بھی دیکھیں تو کہاں تک ہے تری ہمراہی
قدم اپنا بھی اب اے گردشِ دوراں نکلا

کبھی کب عندلیبِ سوختہ دل کی لگی تجھ سے
چراغِ گل کو کیا پھونکا جو اے بادِ خزاں پھونکا

ہمارے دل کے ہوتے طورِ سینا کو جلانا تھا
تری برقِ تجلی نے کسے پھونکا کہاں پھونکا

فلک نے کینہ لیا تو نے ظلم میں نے وفا
وہی ازل میں ملا جس کو جو پسند آیا

الٰہی اُس بتِ مغرور سے یہ سنوا دے
نیاز مند ہوا میں نیاز مند ہوا

مری زباں نہ تھکی رات کٹ گئی ساری
کھلا جو شکووں کا دفتر تو پھر نہ بند ہوا

اے عشق سن نہ لے کہیں فرہاد یہ صدا
تیشہ پکارتا ہے کہ میں کوہکن ہوا

ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہوا

حسن وہ جادو ہے آپس میں بھی رشک آجاتی ہے | تو رہے دل میں یہ کب آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے

(رفیق)

گیا جو تیرے کوچے میں وہ با چشم پر آب آیا | حرم سے جیسے لے آتے ہیں زائر آب زمزم کا
نگاہِ شوق کو پہچانتے ہیں شوخ نگاہ | وہ آنکھ لاؤں کہاں سے جو اعتبار رہے

(درد) (احسان شاہجہان پوری)

مر گئے ہم تو وضعداری میں | دوستی کے نباہ نے مارا
دیکھ اے داغ اہل دُنیا کو | ہوسِ عز و جاہ نے مارا

بے جستجو ملے گا نہ اے دل سراغ دوست | تو کچھ تو قصد کر تری ہمت کو کیا ہوا
موہوم کر دے جو دہان و میانِ دوست | کیا جانے وہم صانع قدرت کو کیا ہوا

ہم اب سے لینگے بوسہ گل تیرے سامنے | کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا
اے داغ بے قصور ہوئے قتل عشق میں | کوئی برائی ہم نے نہیں کی بھلا ہوا

گر ذوق سیر ہے کچھ تو دیکھو میرے دل کو | یہ ہی ہے اک نمونہ جامِ جہاں نما کا

اُنکی خاموشی میں تو عالم ہے اک تصویر کا | اور جب کی بات تھا بندہ گیا تقریر کا
عشق اس رعنا جواں کا داغ کرتا ہے ستم | نام ہے بدنام ناحق آسمانِ پیر کا

تڑپ پھر اے دلِ ناداں کہ غیر کہتے ہیں | خیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا
ملی جو یار کی شوخی سے اسکی بے چینی | تمام رات دلِ مضطرب کو پیار کیا
بھلا بھلا کے جتایا ہے انکو رازِ نہاں | چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا

قیمت فی بوتل دو روپیہ (عہ)

قیمت فی درجن بیس روپیہ (صہ)

ماء اللحم انگوری

یورپ میں ذہن پر اثر ڈالنے کے لئے تصویرات نہایت مفید ذریعہ
سمجھی گئی ہیں۔ گذشتہ صدی کی آخری چوتھائی
میں ملک ہندوستان نے جنوب سے شمال تک ہمارے
ماء اللحم انگوری کے مفید اثرات کا تجربہ کیا ہے اس صدی
کے آغاز میں ہمارے ماء اللحم کا مفید ہونا ایک امر مسلمہ ہو گیا ہے
اگر کوئی شخص ایک

مقوی دل و دماغ

مصفی خون

اگر آپ ہماری ہدایات کے موافق مناسب مقدار میں ماء اللحم کا
استعمال کریں تو آپ دنوں میں ڈنڈیل جوان بن سکتے ہیں
اور ان جوانوں میں سے کسی کے ساتھ جسمانی۔ دماغی اور
اعصابی طاقت میں مقابلہ کر سکتے ہیں۔ منگاؤ۔ اور آزماؤ۔

حکیم غلام نبی زبدۃ الحکماء (اعوان منزل) موچی دروازہ۔ لاہور

منتوں سے بھی نہ وہ حورِ شمائل آیا — کس جگہ آنکھ لڑی ہائے کہاں دل آیا
ہم نہ کہتے تھے نہ کر عشق پشیماں ہوگا — جو کیا تو نے وہ آگے ترے اے دل آیا
مرقدِ قیس پر اب تک بھی تو خارِ صحرا — انگلیوں سے یہ بتاتے ہیں وہ محمل آیا

بات کیا چاہئے جب مفت کی حجت ٹھہری — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا
جال اس زلف پریشاں نے بچھایا اے دل — لے سنبھل پھر یہ نہ کہنا کہ خبردار نہ تھا

آپ کی برہم مزاجی کا ٹھکانا ہی نہیں — یہ تو مجھ کمبخت کا حال پریشاں ہو گیا
کس کا طرہ کس کا گیسو کس کی کاکل کس کی زلف — سب بلائیں ہو گئیں جب دل پریشاں ہو گیا
بوسہ لیکر دل دیا ہے اور پھر نالاں ہیں داغ — کوئی جانے مفت میں حضرت کا نقصاں ہو گیا

نگاہِ شوق پہ الزام بیقراری کا — تمہاری برقِ تجلی کو اضطراب تھا
ہزار پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں — اسے حجاب تھا موسیٰ کو تو حجاب تھا

حشر میں سر سے گذر جائے گا طوفاں جس کا — وہ ہماری ہی خجالت کا پسینا ہوگا
خلد میں پھر کسی کافر ہی کا دل بہلے گا — گر نہ معشوق و مے و ساغر و مینا ہوگا
چین دیتے نہیں وہ داغ کسی طرح مجھے — میں جو مرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ جینا ہوگا

شبِ غم بھی گذر ہی جائے گی — نہ رہے گا نہ ایک حال رہا
دل ہمارا وہ چیز ہے جس پر — لبِ معشوق پر سوال رہا

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی۔ اے
مخزن
کشمیر
لاہور
دہلی
لکھنؤ
کانپور
الہ آباد
بنارس
کلکتہ
بمبئی
حیدرآباد دکن
بنگلور
مدراس
مضامین اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ
مضامین نثر
عورتوں میں ہمدردی۔ ایڈیٹر ۔۔۔۔ ۱
کام کی بات قاری سرفراز حسین (دہلوی) ۱۱
ایک چاندنی رات کا نظارہ۔ آفتاب احمد ۔۔۔۔ ۱۴
طالب علی خاں عیشی سید فضیل الحسن حسرت موہانی ۱۷
بچوں کی تعلیم و تربیت شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۲۲
امریکہ کی آزادی۔ عبدالرشید چشتی بی۔ اے ۳۱
مضامین نظم
خواب ناز میرزا نیرنگ بی۔ اے ۳۵
رات کا سماں۔ علمدار حسین (از سنور۔ ریاست پٹیالہ)۔ ۳۶
دہقان کی داستان منشی سراج الدین احمد ۴۲
کلام آزاد۔ ۔۔۔۔ ۴۵
کچکول ۔۔۔۔ ۴۷
نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
خادم التعلیم ۔۔۔ عبدالعزیز کے اہتمام سے چھپ

بزمِ سخن

عورتوں میں ہمدردی

عورتوں کو خُدانے بالطبع نرم دِل پیدا کیا ہے۔ اور نرم دلی کا یہ تقاضا ہے کہ جہاں کسی کو ذرا پریشاں حال دیکھا۔ رقت پیدا ہوگئی اور خواہ مخواہ دِل یہی چاہنے لگا کہ ہوسکے تو اس سے کچھ ہمدردی کی جائے۔ ہمارے مُلک میں گو تعلیمِ نسواں کی کمی کے سبب عورتوں میں بھی ہمدردی کی نظیریں ایک وسیع پیمانے پر عموماً نایاب ہیں۔ مگر اپنے اپنے محدود حلقے میں عورت ہمدردی کا ایک ذخیرہ ہے۔ کسی ہمسائہ کی عورت کو کوئی صدمہ پہنچ جائے۔ یہ فوراً اُس کی دلجوئی پر آمادہ ہوتی ہیں۔ مردوں سے کہہ کر مدد دلواتی ہیں اور زبانی بھی ہر وقت اپنی غمزدہ بہن کی دلدہی کرتی رہتی ہیں۔ ایک دُوسری کے سامنے اس سادگی اور صفائی سے اپنے دکھڑے کہہ سکتی ہے۔ کہ مردوں میں اِس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ جس تحمل بُردباری اور سچّی ہمدردی کے ساتھ ایک عورت پہروں دُوسری عورت کے دُکھ سُکھ کی کہانی سُنتی ہے۔ اِسے دیکھ کر طبع انسانی کے متعلق اچھی رائے پیدا ہو جاتی ہے یہ میلان جس کے سیدھے سادے اور بلا تصنّع ظہور ہندوستان کی مستورات میں کم وبیش نظر آتے ہیں۔ مغربی دُنیا کی تعلیم یافتہ عورتوں میں بہت نفیس رنگ میں اور وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے۔ اور اس وقت اہلِ فرنگ کے لئے مایۂ ناز ہے۔ بعض اعلیٰ درجہ کی پڑھی لکھی اور خاندانی خاتونیں ایسی ہیں جو ہمدردیٔ نسواں اور اپنی جماعت کی خدمت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم فرض اور بہت بڑا مقصد جانتی ہیں۔ مگر اُن خاتونوں کو چھوڑ کر بھی

اشتہارات

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے کے وسط میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر بلا محصول ۳ؕ

" دوم درجہ دیسی کاغذ پر " ۲ؕ

محصولڈاک دونوں صورتوں میں ۶/

مقامی خریداروں کو محصولڈاک معاف

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پی ایل

کی اجازت آنی چاہئے۔ مابعد کا حساب نہیں۔ نمونہ کے

پرچے کے لئے ۴ آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ پہلی ششماہی

کی جلدیں سب بک چکیں۔ اس لئے انکے لئے درخواستیں

ناممکن التعمیل ہیں۔ ششماہی حال بھی دو اور رسالے

نکل کر ختم ہو جائیگی۔ نئی درخواستیں یا ماہ جنوری سے

ہونی چاہئیں یا اپریل سے جب تیسری ششماہی

شروع ہوگی +

شیخ عبدالقادر مالک و ایڈیٹر

آبزرور (لاہور)

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام

کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانیکا یہی ایک ذریعہ ہے

ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ یورپین افسر

اس کے خریداروں میں ہیں۔ اور جو باتیں اس اخبار میں درج

ہوں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں ترتیب مضامین یہ ہے:

صفحہ اوّل (تار کی خبریں۔ کوئی دلچسپ مختصر کہانی یا مضمون

جو عموماً یورپین مضمون نگاروں کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔

اُردو اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے معاصرین کی رائے

کے خلاصے) صفحہ دوم (لیڈنگ آرٹیکل) صفحہ سوم (ایڈیٹوریل

نوٹ) صفحہ چہارم (ضروری ملکی خبریں اور خطوط وغیرہ)

صفحہ پنجم (اسلامی دنیا کی خبریں۔ ممالک غربی و

شمالی کی خبریں وغیرہ) صفحہ ششم (منتخبات)

قیمت سالانہ بارہ روپیہ ؏ روپیہ۔

غلام رسول بی۔ اے مینیجر

کایستھ سماچار ۔ یہ ماہوار میگزین انگریزی میں الہ آباد سے بزیر ایڈیٹری مسٹر ایس سنہا بیرسٹر

ایٹ لا۔ بڑی آب و تاب اور قابلیت سے شائع ہوتا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ

اس میں بیشتر حصہ ایسے مضامین کا ہوتا ہے جو عام پسند ہوں اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمونوں سے

اکثر وقت بیتے ہیں۔ اس پر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے۔ مگر پیشگی (مینیجر سماچار۔ الہ آباد)

آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہو۔ کہ مغربی دُنیا میں اُنکی بہنیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کیسی روشن خیال ہیں۔ یہ میم صاحبہ جن کے خط کا ترجمہ ہم درج کیا چاہتے ہیں۔ امریکہ کے اُس حصّہ کی ہیں۔ جو کینیڈا کہلاتا ہے۔ اور اُسی سلطنت کے زیر سایہ ہے۔ جس کا ہندوستان میں راج ہے۔ کینیڈا ہر چند کہ ترقّی میں امریکہ کے آزاد اور جمہوری سلطنت والے حصّے سے کم ہے۔ جسے ریاستہائے متحدّہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم نہایت مہذّب و ترقّی یافتہ ہے جسکا کافی ثبوت اِس خط میں ملیگا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوگا۔ کہ وہاں معمولی متوسط الحال خاتونوں کی تربیت کیسی ہے اور خیالات کس قسم کے ہیں:۔

کوچۂ ارون ۔ نمبر ۱۱۲

وسٹ ماؤنٹ

کینیڈا ۔ ۱۵۔ اگست سنہ ۱۹۰۱ء

میری مکرّمہ

تسلیم۔ آپ کا خط مورخہ ۱۵۔ جولائی مجھے آج ہی ملا۔ اور مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ کیسی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میرے پچھلے خط سے اور اُس مرقع سے جو میں نے اُس کے ساتھ بھیجا تھا۔ مسرّت ہوئی۔ اِس وقت شمالی امریکہ کا یہ حال ہے۔ کہ ملک بھر میں خیالات کا رجُوع مذہب کی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اور ہم اس میلان کو سُورج کی روشنی کہتے ہیں۔ اسی لئے یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے۔ کہ جس کسی کو کچھ خوشی حاصل ہو۔ وُہ کسی دوسرے بھائی یا بہن کو اُس کا حصّہ دے۔ یہاں ایک انجمن اسی غرض سے قائم ہوئی ہے۔ گو مَیں ابھی اُس میں شریک نہیں ہوں۔ تاہم جو کام مجھے دِل سے پسند ہے۔ وُہ یہ ہے کہ اخبارات اور رسالے جو مجھے ہاتھ لگیں میں دُوسری بہنوں کو دکھاتی رہوں۔ اور جو دوسری بہنوں کی نظر سے گذریں وُہ مجھے دکھا دیا کریں۔ میری ہمسائی کو جو اخبارات آتے ہیں

جنھوں نے اِس قسم کی ہمدردی میں شہرتِ خاص حاصل کی ہے - ہزاروں نیک نیت اور خداپرست خاتونیں ایسی ہیں جو اپنے مقدور کے موافق کوشش کر رہی ہیں - کہ اُن کی ذات سے اُن کی بہنوں کو نفع ہو - اور چُپکے چُپکے غیر معلوم طور پر بغیر اس کے کہ طالب شہرت ہوں - اِس کام کو ایک فرضِ مذہبی جان کر کئے جاتی ہیں - کوئی اپنے گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی ہمسائی کے ہاں چلی جاتی ہے اور اگر اُس کو انجیل پڑھنے کا شوق یا ملکہ نہیں ہے تو اُس کو انجیل سُناتی ہے - یا اُس کی لڑکیوں کو انجیل پڑھاتی ہے - یا سینا پرونا سکھاتی ہے - کوئی ایسے غُربا کے گھر میں چلی جاتی ہے - جنھیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں میسر ہوتا - اور انہیں کچھ کمانے کو دیتی ہے - اور عورتوں کو محنت مزدوری کے ایسے طریقے بتاتی ہے - جس سے وُہ گھر کے مالک کی کمائی میں کچھ اضافہ کر سکیں - کوئی اُن مُصیبت زدہ مکانات میں جاتی ہے - جہاں صاحبِ خانہ اپنی کمائی شراب کی نذر کر چکا ہو اور زن و فرزند فاقہ مستی میں پڑے ہُوئے صدمات کی وجہ سے ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں - کہ خُدا کی ہستی سے بھی اِنکاری ہیں - اُن کی مُصیبت کو گھٹانا - اُنکو مدد پہنچانا - اُنکے گھر کی صفائی کی کوشش کرنا اور ایسے ایسے اَور دشوار کام یہ نیک بخت اپنے ذمّہ لیتی ہے اور سرانجام کرتی ہے - غرض اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہر ایک کچھ نہ کچھ مفید کام کر رہی ہے اور ایسے طریق سے کہ دُنیا کی آفرین سے کچھ غرض نہیں - بلکہ اپنے اعتقاد کے موافق اپنے خُدا سے اجر کی خواستگار ہے - اِس طبقہ میں بعض ایسی خاتونیں بھی ہیں - جو اپنے ہاں بیٹھی بیٹھی دوسرے ممالک کی عورتوں پر اپنے خیالات کے مطابق نیک اثر ڈالنا چاہتی ہیں اور جن کی یہ خواہش ہے کہ اُن کی بہنیں جو دُنیا کے دُوسرے حصّوں میں آباد ہیں - اُن نعمتوں کا جو اُنہیں حاصل ہیں - حصّہ پالیں - اِس خیال کی ایک خاتون کا خط جو ایک ہندوستانی خاتون کے نام انگریزی میں لکھا ہوا ہے - ہمیں اتفاق سے ہاتھ لگا ہے - اور ہم اُسکا ترجمہ اپنے ملک کی مستورات کے فائدہ کے لئے کئے دیتے ہیں - تاکہ اُن کی

آبا و اجداد مدتوں سے تعلیم یافتہ تھے۔ اور ہمارے بڑے اُس زمانہ میں وحشی تھے۔ البتہ اتنی بات
ہے کہ اب تہذیب یہاں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ وسٹ ماؤنٹ۔ کیوبک میں۔ جو یہاں کا
سب سے پرانا صوبہ ہے۔ نمونہ کے طور پر پیش کئے جانے کے قابل قصبہ گنا جاتا ہے۔ اگرچہ
مانٹریل کے ایک طرح ماتحت ہے۔ اور اس کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہاں ہمارا اپنا انتظام
ہے۔ ہم مقامی عہدہ دار خود منتخب کرتے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ اصحاب ہیں۔ جن کا مقصد اعلیٰ
یہ ہے کہ مقام وسٹ ماؤنٹ پُر امن اور خوشحال مقام ہو۔ یہ قصبہ ایک خوبصورت پہاڑی
پر واقع ہے۔ مکانات جن کی شکل و صورت سے مکینوں کی خوشحالی برس رہی ہے۔
اس پر واقع ہیں۔ پرانے اور بڑے بڑے درخت اُن پر سایہ کئے ہوئے ہیں اور انکے
گرد رفاہ عام کے لئے زمینیں ہیں۔ جن کو نہایت کوشش سے خوشنما حالت میں رکھا جاتا
ہے۔ یہاں بجلی کے ذریعہ چلنے والی گاڑیوں کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ ہر پانچ منٹ کے
بعد ایک نفیس گاڑی آپ کو مل سکتی ہے۔ اور پانچ سنٹ (ڈھائی آنہ) دے کر آپ
سارے مانٹریل کی جس کا رقبہ دس میل ہے سیر کر سکتے ہیں۔ مقام وسٹ ماؤنٹ میں
جس کی آبادی نو ہزار ہے۔ کوئی ایسی دوکان نہیں جہاں شراب بک سکے۔ اور اس
سبب سے یہاں مخمور آدمی بہت کم نظر آتے ہیں۔ چھ سال کے عرصہ میں مجھے صرف
دو آدمیوں کو نشہ کی حالت میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور وہ بھی شراب مانٹریل
سے جا کر لائے تھے۔ یہاں اتوار کو ہر دوکان بند ہوتی ہے۔ اور لوگ پوری طرح اتوار
مناتے ہیں۔ ہر شخص اچھے اچھے کپڑے پہن کر گرجے کو جاتا ہے۔ یا گلگشت چمن کرتا ہے۔
یا پہاڑ کے قدرتی نظاروں کا لطف اٹھانے کو گھر سے نکل پڑتا ہے۔ ہر طرف سے آرام
اور استراحت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں سات گرجے تین بڑے بڑے مدرسے
اور ایک کتب خانہ عام ہے۔ جہاں سے اِس قصبہ کا ہر باشندہ۔ زن و مرد۔ دو کتابیں
ایک وقت میں مستعار لے سکتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ممبری کا کوئی چندہ ادا کرے۔ ایک

وہ پڑھ کر مجھے دیدیتی ہے۔ میں اپنے اُسے دیدیتی ہوں۔ پھر جو فارغ ہو جائیں۔ اُن کو
میں بذریعۂ ڈاک کسی رشتہ دار یا سہیلی کے پاس بھیجدیتی ہوں۔ اور وہ پڑھ کر کسی اور تک
پہنچا دیتی ہے۔ جب میں چھوٹی سی تھی اور بورڈنگ سکول میں پڑھتی تھی۔ تو میرے خاندان
کی ایک بزرگ عورت نے میرے پاس ایک روزانہ اخبار بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ مجھے
یہ تحفہ دل سے پسند ہوا تھا۔ اور میں اس احسان کو عمر بھر نہ بھولوں گی۔ بارہ سال ہوئے
کہ وہ مرحومہ انتقال کر گئی۔ اور خدا جانے اُسے اب معلوم ہے یا نہیں کہ اس کی یاد یہاں
کیسی تازہ ہے۔ جب میری شادی ہوگئی تو میرے خاوند کے ایک دوست نے جسے
میں نے کبھی نہیں دیکھا اور جو اب وفات پاگیا ہے۔ سالہا سال تک مجھے ایک بیش قیمت
ماہوار رسالہ بھیجکر ممنون کیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس رسالے کے پڑھنے نے مجھ پر اور میرے
بال بچوں کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا۔ آپ کا خاوند چونکہ باخبر اور پڑھا لکھا آدمی ہے
وہ آپ کو بتا سکیگا کہ اس زمانہ میں اخبارات کے ہاتھ میں کتنی بڑی طاقت ہے۔ جسے چاہے
وہ بھلائی کے لئے کام میں لائیں۔ چاہے برائی کے لئے۔ میں آج پھر آپ کو دو اخبار
بھیجتی ہوں۔ ایک وہی مرقع تصویرات ہے اور دوسرا خاص عورات کے لئے ہے۔ جو مقام
ٹارنٹو سے شائع ہوتا ہے۔ ٹارنٹو مثل اوٹاوہ کے قدیم باشندگان امریکہ کی زبان سے
لیا گیا ہے۔ یہ نام نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور شاعر
"لانگ فیلو" کی نظم میں یہ نام اکثر آتے ہیں۔ کیا آپ نے "لانگ فیلو" کا کچھ کلام پڑھا ہے؟
کیا پاکیزہ کلام ہے۔ اگر آپ نے نہ پڑھا ہو تو میں آپ کو اُس کی کلیات کی ایک جلد بھیجدونگی۔
کیونکہ اہل امریکہ کو اس شاعر کے وجود پر ناز ہے اور ہم سب چاہتے ہیں کہ اس کی شہرت
دور دور پھیلے۔ اس ملک میں ہمارا علم ادب ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ مگر یہ بھی معلوم
رہے۔ کہ اس ملک ہی کی ابھی کتنی عمر ہے۔ ہمیں یہاں آباد ہوئے صرف چند سو سال
ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان ہزارہا سال سے آباد ہے۔ علاوہ بریں تمہارے

تھا۔ کہ کہیں میرا خاوند تو آپ کی تحریر کو نہ دیکھ لیگا۔ اِس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کو جتا دوں کہ میرا خاوند میرے خطوط سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ اُس کو مجھ پر ایسا اعتبار ہے کہ وُہ اپنے کاغذات اور خطوط بھی مجھے رکھنے کو دے چھوڑتا ہے۔ وُہ نہایت دانشمند اور دیانت دار آدمی ہے اور متانت اس کی طبیعت میں بہت ہے۔ میری طبیعت ویسی متین نہیں۔ اور میں زندہ دِل اور خندہ پیشانی واقع ہوئی ہوں۔ اور یہی بات اُسے پسند ہے۔ جب وُہ دن بھر کا کام کر کے تھکا ماندہ گھر میں آتا ہے۔ تو وُہ چاہتا ہے کہ کوئی باتوں سے اُس کا دل بہلا دے۔ اور یہ کام میں کرتی ہوں۔ میں فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھ کر دنیا کے حالات معلوم کرتی رہتی ہوں تاکہ اپنے شوہر سے اور اپنے لڑکوں سے اُن حالات کے متعلق آسانی سے گفتگو کر سکوں۔ میرے دو جوان لڑکے ہیں۔ جو اس وقت مجھ سے دو ہزار کوس پر برٹش کولمبیا میں ہیں۔ میں انکو مفصل خط لکھ کر اپنے دل کو خوش کرتی ہوں اور وُہ مجھے اپنی حالت کی نسبت مفصل اطلاع دیتے رہتے ہیں۔ مجھے اپنے لڑکوں پر فخر و ناز ہے اور میں یقین کرتی ہوں کہ اگر آپ صاحب اولاد ہیں۔ تو مجھے معذور سمجھیں گی۔ میرے بچے نہ شراب پیتے ہیں نہ تمباکو۔ میرے شوہر نے اُن کی تربیت ایسی کی ہے کہ یہ خوب ذہن نشین کر دیا ہے کہ انکی زندگی نہایت پاکیزہ ہونی چاہیے۔ میرا بڑا لڑکا صیغہ معدنیات کا انجنیر بننے کی تیاری کر رہا ہے۔ اور تین سال تک انجنیری کے مدرسہ میں تعلیم پا چکا ہے۔ ابھی تین سال اُس کی پڑھائی کے باقی ہیں۔ کیونکہ اُس نے رنہ انصاب اختیار کیا ہے۔ دُوسرا لڑکا ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ دونو برٹش کولمبیا کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اور ہر قسم کی آسائش وہاں موجُود ہے۔ وہاں بھی اتوار کو بالکل کام نہیں ہوتا اور ریڈنگ روم بھی موجُود ہے۔ مگر افسوس ہے کہ شراب کا بہت رواج ہے۔ اور اکثر لوگ سخت شرابی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ انکی آمدنی بے حساب ہے اور اسی طرح بے حساب خرچ ہے

ریڈنگ روم (کمرہ جس میں اخبارات وغیرہ رفاہ عام کے لیے رکھے ہوتے ہیں) ہے جس میں گیس یا بجلی کی روشنی ہے۔ اور جسے جاڑوں میں گرم ہوا بہم پہنچا کر خوب گرم رکھا جاتا ہے اس میں ایک تعلیم یافتہ خاتون ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جس کا فرض ہے۔ کہ بلالحاظ مذہب وملت و قوم ہر باشندہ وسٹ ماؤنٹ کی وہاں خاطر تواضع کرے۔ اور انکو کتب خانہ کے اراکین سمجھے۔ اس قصبہ میں ایک عمدہ اور بڑا ہال بھی ہے۔ جو بڑے بڑے جلسوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور اس کے ساتھ ورزش کا کمرہ اور غسلخانے اور حمام ہیں۔ جاڑے کے موسم کے لئے ایک حوض مکان کے اندر تیار کیا گیا ہے۔ اور گرما کے واسطے ایک بہت بڑا تالاب کھلی ہوا میں ہے۔ جسکے محافظ معقول اور معتبر آدمی ہیں۔ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ اوقات نہانے اور تیرنا سیکھنے کو مقرر کرتے ہیں۔ بچوں کو تیرنا بتاکید سکھایا جاتا ہے۔ کتب خانہ اور ہال کے قریب ایک کھلی زمین نوجوانوں کی انواع واقسام کی کھیل کود اور تفریح کے واسطے مہیا رہتی ہے۔ ایک چھوٹی سی جھیل بھی موجود ہے جس میں بچے اپنی چھوٹی چھوٹی کھلونوں کی سی کشتیاں چلاتے ہیں۔ رات کو اس پرفضا مقام میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے اور ہمیں ہمارے خاوند وہاں سیر کے لئے لے جاتے ہیں۔ یا ہم ایک طرف بیٹھ کر بچوں کی کھیل کود کا تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ میرے خاوند کو یہ فضا خاصکر بہت پسند ہے۔ اور وہ مجھے اکثر وہاں لے جاتا ہے۔ صحت کی حفاظت کے لئے ایک انتظام ہمارے ہاں کا بہت اچھا ہے۔ ہمیں تاکیدی حکم ہے کہ اپنے اپنے صحن اور گلی کوچے صاف اور ستھرے رکھیں۔ ایک ملازم پولیس اس کام کی نگرانی کے لئے گشت کرتا رہتا ہے۔ اور ہفتہ میں دو دفعہ تمام کوڑا کرکٹ ایک بڑی بھٹی میں ڈالکر جلا دیا جاتا ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکی تھی کہ مجھے چٹھیوں کے صندوق میں ڈاک کے ہرکارہ کے چٹھیاں ڈالنے کی آواز آئی۔ جس سے مجھے آپ کی چٹھی کا ایک فقرہ یاد آیا۔ آپنے پوچھا

ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاستہائے متحدہ کے بعض پریسیڈنٹ نہایت اچھے اچھے آدمی
ہوئے ہیں۔ جن کا چلن بہت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ مگر ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم کینیڈا میں زیر سایۂ
برطانیہ ہی اچھے ہیں۔ اور اس لئے ہم اپنے بچوں کو بھی سکھاتے ہیں کہ برطانیہ کے وفادار
رہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ میں عیوب اور نقائص ہیں۔ اور کبھی کبھی اس سے سخت
غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ برطانیہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے اور آخر کار
خدا اس کو عیوب سے بری کر کے اس کے ذریعہ تمام دنیا میں اپنی حکومت پھیلائیگا۔

میں حیران ہوں کہ میرا قلم مجھے کہاں سے کہاں لئے جاتا ہے۔ اور میں نے اس
خط کو کس قدر لمبا کر دیا ہے۔ تاہم میں امید کرتی ہوں کہ یہ باعث ماندگی نہیں ہوئی۔
میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے ایک لمبی چٹھی لکھیں۔ اپنی بابت آپ جو کچھ مجھے بتائیں۔
میرے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح ہماری دوستی مضبوط ہوگی اور جانبین
کی خوشی کا ذریعہ اور فائدہ کا موجب ہوگی۔

آپ کو یہاں کی "مجلس خواتین" کا بھی حال معلوم ہو؟ میرا خیال ہے کہ ابھی ہندوستان
میں کوئی ایسی مجلس قائم نہیں ہوئی۔ یہاں کی مجلس لیڈی ابرڈین نے قائم کی ہے۔ ہر مذہب
وملت کی عورتیں اس میں شامل ہیں۔ اور کینیڈا بھر میں اس کی شاخیں ہیں۔ ان میں
عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ مجالس منعقد کرتی ہیں۔ مضامین پڑھتی ہیں۔ تمدنی معاملات
پر بحث کرتی ہیں۔ اور ان تمام امور پر جو دنیا میں عورتوں اور بچوں کی حالت کو بہتر
بنا سکیں بحث ہوتی ہے۔ اس مجلس کا یہاں بڑا اثر ہے۔ کیونکہ بہت سی اعلیٰ طبقہ کی
خاتونیں اس میں شامل ہیں اور خود اپنے شوہروں کو جو بڑے مدبران ملک میں ہیں اسکی
حالت پر توجہ دلاتے ہیں۔ میں ان جلسوں میں جانا پسند کرتی ہوں۔ اگرچہ میں باقاعدہ
ممبر نہیں۔ لیڈی ابرڈین کے ذریعہ ملک کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اس نے ہماری عورتوں

کرتے ہیں۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔

اب میں آپ کو اپنی لڑکیوں کا حال سناتی ہوں۔ میری تین لڑکیاں ہیں اور تینوں لڑکوں سے چھوٹی ہیں۔ جب یہ پیدا ہوئیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک میں لڑکیاں ماؤں کے لیے بہت آرام دہ ہوتی ہیں اور میرا شوہر بھی لڑکیوں کو بہت پیار کرتا ہے۔ سب سے بڑی کا نام اینی ہے۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہے اور اب تک مدرسہ میں پڑھتی ہے۔ دوسری میری ہے۔ جس کی عمر سولہ سال ہے اور تیسری کا نام مارگریٹ ہے۔ جو آٹھ سال کی ہے۔ اب کے برس دونوں بڑی لڑکیاں ایک ٹورنٹو کے مدرسہ میں داخل ہونگی۔ جسے پچاس سال ہوئے ایک فرانسیسی خاتون نے ایک جھونپڑے میں شروع کیا تھا۔ لیکن جو اب ترقی کرتے کرتے کینیڈا کے بہترین مدرسوں میں گنا جاتا ہے۔ میرے دونوں لڑکے بھی کچھ عرصہ تک مدرسہ میں پڑھ چکے ہیں۔ اس مدرسہ میں بچوں کو کوئی نہ کوئی دستکاری سکھنا لازمی ہے۔ خواہ کوئی کیسا ہی امیر کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ کام ضرور سیکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے مجھ سے کینیڈا کے قدرتی منظروں کی چند تصویریں مانگی ہیں میں اگلی ڈاک میں ضرور بھیجوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ کینیڈا بھی اب بڑے ممالک میں شمار ہونے لگا ہے۔ خصوصاً جب سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں بیش قیمت کانیں ہیں۔ اسکی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ والے جو اپنے آپ کو "امریکن" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ساتھ ملالیں۔ مگر ہم اپنے پرانے وطن انگلستان کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے قدیمی جھنڈے کے زیر سایہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم اپنے فوائد کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور انگلستان جیسے باضابطہ ملک کے محدود اختیارات والے بادشاہ کی رعایا ہونے کو پریسیڈنٹ کے رعایا ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جمہوری ریاستوں میں پریسیڈنٹ اپنی میعاد مقررہ کے لئے ایک قسم کا زار ہوتا

کام کی بات

جو لوگ فی الحقیقت تعلیم یافتہ ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگیاں سنوار لی ہیں انہیں تو بھلا ایسی باتوں کی کیا ضرورت ہے جیسی اس چھوٹے سے مضمون میں پیش کی جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو میری طرح نہ تعلیم سے پورے طور پر بہرہ مند ہیں۔ اور نہ جن کو دن رات لائق آدمیوں کی صحبت میسر ہے جس سے تقلیداً ہی اُن کی زندگیاں کسی ٹھیک ڈگر پر پڑ جائیں۔ یہ تو کون صلاح دیگا کہ ان صاحبوں کو اپنی لیاقتیں نہ بڑھانی چاہئیں۔ یا تہذیب و شائستگی میں ترقی کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ مگر میں جس بات کو اس نصیحت سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح یہ مشق بہم پہونچانی چاہئے۔ جو قابلیت وہ رکھتے ہیں۔ اُس کو سب سے بہتر طور پر استعمال کریں۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ کسی کو کچھ اچھا کام کرتے ہوئے دیکھا یا کسی نے کسی بات میں شہرت حاصل کی۔ بس ان کے دل میں بھی جھرجھری پیدا ہوئی اور اُسی کام کا رُخ کیا۔ اس میں یدِ طُولیٰ حاصل کرنے کے لئے فطرتاً وضع ہوئے نہ تھے۔ کوّا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تھوڑا بہت وقت ضائع کیا۔ اپنی اُس قابلیت پر ظلم کیا۔ جس کو سب سے بہتر طور پر استعمال کرنے سے سُرخرو ہوتے اور آخر کو گمنامی کے دریا میں ڈوب گئے۔ یہ دریافت کرنا کہ مجھ میں کونسی ایسی قابلیت ہے جس سے میں کوئی مفید اور قابلِ وقعت کام کر سکتا ہوں۔ مشکل بھی ہے اور آسان بھی ہے۔ مشکل تو یوں ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے معاملہ میں کوئی زبردست رائے قائم کرنے سے جھجکتا ہے اور ڈانواڈول رہتا ہے۔ آسان اسلئے ہے کہ اپنے آپ کو جاننے کا ایک لگا بندھا فن ہے۔ تل کی اوجھل پہاڑ ہے۔ ذرا غور و فکر کے بعد جہاں پردہ اُٹھا

کیا تھا۔ کہ اُن لوگوں کو جو خود عمدہ کتابیں خرید نہیں سکتے یا اُن تک دسترس نہیں رکھتے عُمدہ کتابیں پہنچ جایا کریں۔ یہ فی الواقع بہت مفید کام ہے۔ اور مجھے اس پر فخر ہے۔ جو عورت کوئی بڑا کام کرے میں اُسے اپنی ساری جماعت کے لئے باعث فخر خیال کرتی ہوں۔ اور گو میں اس کے پایہ کو نہ پہنچ سکوں۔ میں دِل سے اُس کی تعریف کرتی ہوں سچ یہ ہے کہ میں طبقۂ نسوان میں پیدا ہونا باعثِ افتخار سمجھتی ہوں۔ اور ہمیشہ خُدا کا شکر کرتی ہوں کہ اُس نے مجھے عورت بنایا۔ خُدا نے تمام دُنیا کو پیدا کرنے کے بعد آدم کو بنایا اور پھر سب کے بعد آدم سے عورت کو پیدا کیا۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں خُدا نے ہمارے لئے اعزاز خاص پنہاں رکھا ہے۔ میں اکثر مذاق کے طور پر اپنے شوہر سے کہتی ہوں کہ خُدا نے عورت کو آدمی کے پہلو سے پیدا کیا۔ تاکہ وُہ اُس کا ساتھ دے۔ سر سے پیدا نہ کیا۔ کہ آدمی پر حکومت کرتی۔ پانوں سے پیدا نہ کیا کہ وُہ اُس کا حاکم ہوتا۔ بلکہ اُسکا رفیق اور ہمسر بنایا۔ اس پر میرا خاوند مسکرا کر جواب دیتا ہے۔ اگر تم عورتوں کا بس چلے تو تم سب حکومت پسند ہو۔ وہ اِس طرح چپکے چپکے چٹکیاں لینے میں بہت طاق ہے اور گو بظاہر خاموش ہے۔ اسکے طبیعت میں بہت کچھ ظرافت پائی ہے۔ میں نے آپ کا خط اُسے پڑھ کر سُنایا تھا۔ اور وُہ اس سے ایسا ہی خوش ہُوا جیسے میں۔ شائد ہماری عادات آپ کو ایسی عجیب معلوم ہوں جیسی آپ کی ہمیں۔ مگر ہمیں ایک دُوسرے کی رسُوم ورواج کا ضرور لحاظ کرنا چاہیئے۔ میں کوشش کرونگی کہ آپ کو خطوط اُن ہدایات کے موافق لکھوں جو آپ مجھے لکھیں۔ اور اگر مجھ سے نادانستہ کوئی اور غلطی ہو تو مجھے ضرور بتا دینا۔ اور اگر چاہیں کہ میں ہی آپ کے خطوط پڑھا کروں اور اپنے خاوند کو نہ سناؤں تو میں اس پر کاربند ہونے کو بھی حاضر ہوں۔ ہماری تربیت کا یہ جزو اعظم ہے کہ دُوسروں کے عقائد اور خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ میں نہایت خوش ہونگی۔ اگر آپ مجھے خدمات لائقہ سے مطلع فرماویں۔ یہ میں کسی طرح آپ کی خوشی کے

کے بیل کی طرح زندگی بسر کر کے ختم ہو جاؤں۔ کیا باوجود ان سب کے میری زندگی میں کوئی جُز ایسا نہیں ہے جس سے میں اعلیٰ کام لے سکتا ہوں۔ اگر اندھی تقلید کا بندہ ہوں تو سب سے پہلے تو بیوی ہی سے جوتی بیزار رہے۔ بچے وبالِ جان ہو جائیں۔ دین ایمان سب کو استعفا۔ دوست آشنا سب وُہ ڈال ڈال ہم پات پات۔ کیونکہ جب تک تمدن درجہ اوّل کا نہ ہو۔ بیوی ہر طرح فسٹ کلاس نہ ہوں۔ مسجد رشکِ گورنمنٹ ہوس نہ ہو۔ دوست احباب ملٹن و شکسپیئر نہ ہوں۔ تب تک زندگی دشوار ہے۔ سب چیزیں اڑینچ کھڑینچ ایک یک سے بیزار۔ نہ رزق نہ موت۔

ان باتوں سے تو مجھ جیسے آدمی کا کام نہیں نکل سکتا۔ کرنے کی بات یہ ہے کہ ان سب کو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے دے کر مجموعی زندگی میں کوئی خوش اسلوبی پیدا کرنی چاہیے اور جو سب سے [illegible] کام اپنی حالتوں میں ممکن ہو کر گذرنا چاہیے۔

شیخی نہ سمجھیے ایمان سے کہتا ہوں۔ کہ جب سے یہ اصول سمجھ میں آیا ہے۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا ہوں۔ ع زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز پر عمل ہے۔ ہم ناقص الحال آدمی ہر چیز کو اپنی طبیعت کے موافق نہیں بنا سکتے اور نہ بہت سی چیزوں میں کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی ہوس چھوڑ دینی چاہیے اور خواہ مخواہ چاروں طرف ہاتھ نہ مارنا چاہیے۔ ہم لوگوں کو خود غور و خوض کر کے یا سمجھدار آدمیوں سے مشورہ کر کے کم از کم ایک چیز اپنے حسب حال ایسی معین کرنی چاہیے جس میں ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اور پھر اندھے بہرے فرشتہ کی طرح اسکے پیچھے پڑ جانا چاہیے۔ دس برس کے بعد کچھ نہ کچھ نتیجہ ظاہر ہو ہی جائیگا۔ یہ کوئی ضرور نہیں کہ ہماری جولانگاہ علم و فضل ہی ہو۔ عبادت۔ خدمت خلق اللہ۔ پاکیزگی کا نمونہ امور خانہ داری میں اصلاح۔ قوائے جسمانی کا تحفظ۔ غرض کوئی نہ کوئی شق ضرور ایسی ہو جس میں ہم دو چار برس کی دلچسپی اور کوشش کے بعد کوئی خاص لطف اور رنگینی پیدا کر لیں۔ ہماری زندگی قابل قدر ہو جائے اور ہم بنی نوع انسان پر ایک بوجھ نہ رہیں +

سرفراز حسین (دہلوی)

اور روز روشن کی طرح معلوم ہونے لگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں - پھر نہ اندھی تقلید کی ضرورت نہ خواہ مخواہ کی کسر نفسی اور دوسروں کی دست نگری کی احتیاج - اب فرض کیجیے کہ کسی کی ستر اسّی روپیہ کی تو تنخواہ ہے - بیوی ہیں کہ گھر کے دھندے صبح سے شام تک کروا لو بچے پلوا لو - نور نامہ اور راہ نجات پڑھوا لو - دیوان فقیر کی ایک آدھ مناجات سن لو - مگر کانفرنس کا ایک حرف نہیں سمجھتیں - انہیں قومی کاموں سے دلچسپی ہو اور وہ پوچھتی ہیں کہ کن دھندوں میں مصروف رہتے ہو - میاں مخزن پڑھ رہے ہیں - اور وہ ماما سے اس قدر نازک بات فرما رہی ہیں - کہ بوا یہ بھی تیری قسمت کی بات ہے کہ کسی دن سالن میں نمک تیز ہو جاتا ہے - اب کوئی صاحب جو ان سے فرمائیں کہ کیوں آپ نے اپنی بیوی کو پڑھا لکھا کر شائستہ نہ بنایا اور انکے خیالات میں اصلاح نہ کی تو بنائیے کیا جواب دیں - خود کیا لکھا پڑھا تھا جو انہیں پڑھاتے - خود کہاں کے مہذب تھے - جو انہیں شائستہ کرتے - آگے چلیئے - آدھی درجن بچے ہیں - ہر بچہ پر ایک ایک نوکر تو رکھا جا ہی نہیں سکتا - کوئی چاؤں چاؤں کرتا ہے - کوئی ٹہوں ٹہوں - کسی کو کھانسی ہے - کسی کو زکام - ایک کو بخار ہے تو دوسرے کو اسہال آتے ہیں - ماما کے ہاتھ چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک بچے کو مس صاحب کے پاس اسپتال بھیجا - دفتر کا وقت آچلا تھا - بیچاری بیوی رحم کر کے روٹی پکانے بیٹھ گئیں کہ گود کے بچے نے پیشاب کر دیا - اب کپڑے پاک کرے کہ روٹی پکائے -

بیوی کو تو خیر ہم نے شائستہ نہ کیا تھا - اب بچوں کو زہر دیدیں ؟ لوگوں کی شرما شرمی مسجد میں جانا شروع کیا - غسلخانہ کی صفائی اور وضو کی نالی کی آبداری قابل داد ہے - ذرا تصور شرط ہے - کیوں حضرت یہ بھی میرا ہی قصور ہے - عزیز اقارب دوست آشنا - سب ناقص التعلیم - ناقص التربیت - یہ حدود اربعہ بھلا کیونکر تبدیل ہو سکتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا میں اسی لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ ان حوالی میں لشتم پشتم ٹوکوا

کنارے پر جا پہنچا جہاں ایک شکاری* درخت سے بندھی ہوئی تھی کشتی کھول اُس میں سوار ہو لیا اور کھیتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ جھیل کے کنارے کنارے قدرت نے غیر معمولی دریا دلی سے قسم قسم کے پھُول لگائے ہیں۔ جنکی خوشبُو سے دماغ معطر ہوا جاتا ہے۔ بادِ صر صر کبھی ان سے اڑ کر چلتی ہے۔ کبھی پانی پر جا کر لہروں کی البیلی چال کی تعریف میں زبان تر کرتی ہے۔ خشکی پر عالیشان عمارتیں بنی ہیں اور پانی پر چند کشتیاں بھی سجی سجائی کھڑی ہیں۔ جا بجا شمعیں روشن ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ بعض بعض مکین درِ اہلِ کشتی جاگتے ہیں۔ لیکن قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جلتی بتیاں چھوڑ کر سو گئے ہیں۔ پانی میں قدرت کا کچھ اور ہی تماشا دکھائی دیتا ہے۔ سونے کے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے محل کانپتے ہوئے ستونوں پر استادہ ہیں۔ سبزانِ شمشاد قامت آبِ رواں کی چادر اوڑھے کھڑے ہیں۔ تارے متحرک پانی میں گھٹتے بڑھتے ہیں۔ اور چراغان کی کیفیت پیش نظر کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر اس نوجوان کو ایسا محوِ حیرت کر دیا کہ وہ اپنی خودی کو بھُول گیا۔ چپّو گود میں رکھ کر نگاہ کے گھوڑے دُور اور نزدیک دوڑانے لگا۔ ناگاہ قریب ہی پانی میں اُس کو ایک شخص متین صُورت نظر پڑا۔ اس نوجوان نے اس سے مخاطب ہو کر پُوچھا کہ "اس آبادی کا کیا نام ہے۔ یہ مرتفع محلات اور مشرف بارہ دریاں کن لوگوں کی رہائش کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اور یہ باغات اور چمنستان کن کی تفرج گاہیں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس پُر فضا مقام کی سیر کروں۔ تو مجھ کو اپنے ساتھ لے چل اور ذرا کی ذرا سیر کرا لا۔" اس شخص نے جواب دیا "دیکھو نیچے ہرگز قدم نہ رکھنا۔ ورنہ یہاں گل بلی مچ جائیگی۔ میں مثل نقش برآب دم کی دم میں معدوم کر دیا جاؤنگا اور تم بھی خطرہ میں پڑ جاؤ گے۔ یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ بھلا کسی غیر شخص کا تو کیا مذکور ہے۔ تم

* چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں۔

ایک چاندنی رات کا نظارہ

(بہارِ کشمیر میں)

رات کا ایک بجا ہے لوگ اپنے اپنے گھروں میں پڑے بے غل و غش سوتے ہیں چرند چراگاہوں میں گردن جھکائے آنکھیں مُوندے آرام کر رہے ہیں۔ پرند شاخوں پر پروں میں سر دئے ہوئے بسیرا لیتے ہیں۔ کیا انسان کیا حیوان ہر ایک گہری نیند لے رہا ہے اور اپنے حال سے بے خبر ہے۔ آسمان پر ماہتاب مع انجم کی سپاہ کے نکلا ہُوا ہے اور خلقِ خدا کا پاسبان ہے۔ تاروں کی فوج میں بعض سوار ہیں بعض پیادہ لیکن سب اپنے اپنے قرینے سے استادہ ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ لب ہلا سکے اگر کوئی حکم بھی سُنایا جاتا ہے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر طرف پہنچایا جاتا ہے۔ جانبِ مشرق ایک باغ ہے دائیں بائیں سیب۔ ناشپاتی۔ گلاس* کے تختے ہیں۔ سبزانِ چمن نُور کی چادر اوڑھے۔ کرن پھُول جھُمکے پہنے۔ بُندے لٹکائے۔ شرماتے لجاتے عجیب انداز سے کھڑے ہیں۔ وسط میں ایک وسیع مکان ہے جس کے دریچے ہَوا کی آمد و رفت کے لئے کھُلے ہیں۔ اندر شمعیں روشن ہیں۔ اور ہر قسم کا سامانِ آسائش اور آرائش موجود ہے۔ قدِ آدم آئینے دیواروں پر آویزاں ہیں اِنکے پیچھے دو نوں جوان ٹہلتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ یکایک اس مکان کا دروازہ کھُلا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے باتیں کرتے باہر نکلے۔ دس ایک قدم آگے چلکر ٹھہر گئے اور پھر ایک دوسرے سے رخصت ہُوئے۔ صاحبِ خانہ واپس پھرا اور دُوسرا نوجوان سیٹی میں وقت کی راگنی نکالتا۔ چھڑی ہلاتا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر میں ایک جھیل کے

* آلوچہ کی قسم کا ایک پھل ہوتا ہے۔ دیکھنے میں سُرخ اور ذائقہ میں شیریں۔

طالب علی خان عیشی

شعرائے دورِ چہارم میں سے جو فیضِ سخن مصحفی سے جاری ہوا اُس کی کوئی دُوسری مثال نہیں ملتی اور کیوں نہ ہو۔ کمال سخندانی و کہنہ مشقی نے انہیں اس مرتبہ پر پہنچا دیا تھا کہ طالب کمال شاعری اُن سے مستفید ہونے کو اپنا فخر سمجھتا تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش و مظفر علیخاں اسیر کے اسمائے مُبارک سے کون واقف نہیں یہ حضرات انہیں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ کرامت علیخاں شہیدی و منور خاں غافل کے کلام نے بھی شہرت عام حاصل کی ہے۔

ان مشاہیر شعرا کے علاوہ شاگردانِ مصحفی میں اور بھی چند لوگ ایسے گذر گئے ہیں جنکا کلام شائع نہیں ہُوا اور اس لئے اُنھوں نے زیادہ شہرت نہ پائی۔ لیکن یہ گمنامی اُن کے نقصِ سخن کے باعث سے نہیں ہے۔ بلکہ اتفاقاتِ عجیب کا نتیجہ ہے۔

میر حیدر علی گرم ۔ نور الاسلام منتظر۔ محمد علی تنہا۔ طالب علیخاں عیشی ۔ انہیں لوگوں میں سے ہیں ۔

اس وقت پیش نظر عیشی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہُوں ۔

طالب علی خاں نام اور عیشی تخلص تھا ریختہ میں مصحفی اور فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ باوجود سکونتِ لکھنؤ شاگردی مصحفی نے طرزِ میشی و بلائے خشک کلامی سے بچا لیا ہے اور جابجا انکے کلام میں زبانِ میر و مصحفی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں

نالہ سوزندہ اثر ہے دُعا ہی سو ناقبول | کیا جانے آگیا تھا وُہ نامہرباں کہاں
تصور میں مرے کس شوخ کی رنگیں ادائی ہے | کہ رنگِ اشکہائے چشم خوں پالا حنائی ہے
جہاں میں خفتگانِ خاک کی کیا خوب گذرے ہے | نہ فرقِ بادشاہی ہے نہ تمیز گدائی ہے

وُہیں بیٹھے رہو۔ مَیں تم کو اس جگہ کا مختصر حال سُنائے دیتا ہُوں۔ لو سُنو۔ اس مقام کو
خموشستان کہتے ہیں۔ یہاں کی آبادی لاکھوں ہی پر پہنچتی ہے۔ یہ لوگ مختلف وقتوں
میں ہر نواح سے آ آ کر آباد ہُوئے ہیں۔ سینکڑوں بچّے ہیں جو گنگا جمنی فرش پر بیٹھے کھیلتے
ہیں۔ ہزاروں نوجوان مرادوں اور آرزوں کو آغوش میں لیے چین کرتے ہیں۔ یہاں
ایک بستی سورما سپاہیوں کی ہے جن کی تلوار کی چمک نے کبھی تمہارے مُلک میں بجلی
کوندا دی تھی۔ جن کے تیر و تفنگ نے کسی زمانہ میں پہاڑوں کے سینے چھلنی کر دئے
تھے اور جنگی بندوقوں کی گرج نے ایک وقت میں گھاٹیوں کو گونجا دیا تھا۔ لیکن جب سے
یہ لوگ یہاں آئے ہیں اِنکے اسلحہ بیکاری کے باعث زنگ خوردہ پڑے ہیں۔ کیونکہ یہاں
کے نظم و نسق میں تلوار اور قلم کو دخل نہیں۔ ایک معتدبہ حصّہ ملّاحوں کا ہے جن پر ہمیشہ آفاتِ
زمانہ کی بوچھاڑ رہی اور کوئی ایسی بادِ مخالف نہیں چلی جس نے انکو بیڑے کی تباہی کی دھمکی
نہ دی ہو۔ اخیر تنگ ہو کر یہ بھی اس امن میں چلے آئے اور مُدّت کی کشمکش کے بعد اب
تہل بیڑے سے بیٹھے ہیں +

بات ختم کرنے کے بعد اس شخص نے اجازت چاہی اور اپنی جگہ سے ہلا۔ ہمارے نوجوان
نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر ٹھہرائے۔ پانی ہلا اور وُہ غائب۔ پھر تو یہ ہوش میں آیا اور اپنے تخیّل پر خود
ہی تعجب کرنے لگا۔ کشتی تیز تیز چلانی شروع کی۔ اور نیم ساعت کے بعد اُس کو اپنے مکان
کے محاذ کنارے پر جا لگایا۔ کشتی درخت کے ساتھ رسّی سے باندھ دی اور آپ قریب کے
ٹیلے کی طرف چلا جہاں ایک پُختہ مکان بنا ہُوا تھا۔ کمرے روشن تھے اور دروازہ نیم
کشادہ تھا۔ دروازہ پر پہنچکر بند کرنے سے پیشتر اس نوجوان نے سامنے کے میدان اور
جھیل پر ایک وداعی نظر ڈالی۔ پھر اندر جا کر چراغ گل کیا اور سو رہا۔ صبح جو آنکھ کھُلی
تو سُورج کا عمل پایا۔ فقط

آفتاب احمد

یہ اشعار خوبیٔ ترکیب میں اپنا آپ ہی جواب ہیں۔

خوبیٔ شعر میں نزاکتِ مضمون و لطافت الفاظ کو بہت بڑا دخل ہے اور اساتذۂ کامل کے کلام میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ وہ جس قسم کا مضمون ادا کرتے ہیں اُسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مرزا اصغر علی خاں نسیم کی ایک غزل ہے دامن تک۔ گلشن تک۔ اُس میں اپنے کو بلبل پابند قرار دیکر شکوۂ محرومی یُوں کرتے ہیں۔

چمن میں فصل گل آئی ہے میں کُنجِ قفس میں ہوں　　مُبارکباد مجھ کو ڈھونڈھ جاتی ہے نشیمن تک

روز ابر میں انتہائے شوق مے نوشی کو یُوں ظاہر کرتے ہیں۔

برستا ہے جو ابر تر تمنائیں ٹپکتی ہیں　　ڈبو دے آبِ مے میں آج ساقی مجھ کو گردن تک

شوق مے کے متعلق نسیم کے الفاظ رنگین و لطیف نے کس قیامت کی بیساختگی و رسیدگی پیدا کر دی ہے۔ خصوصاً مصرعۂ ثانی سے جو بات نکلتی ہے اُس کی کیفیت بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

ہاں تو غرض یہ ہے کہ عیشی کے کلام میں بھی یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اکثر پائی جاتی ہیں۔ اپنے جوش وحشت میں کہتے ہیں۔

یہی وحشت ہے تو اک دن لگا کر آگ گلشن میں　　پڑے ہونگے لپیٹے مُنہ کسی صحرا کی دامن میں

دامنِ صحرا کی ترکیب کو کیا خوب نباہا ہے۔ کہتے ہیں ؎

جلایا زمزمہ نے اسکے دل ہم دردمند و نکا　　لگا دی آتشِ گل کو تی بلبل کے نشیمن میں

بد دعا بھی دی ہے تو کس مزے کی۔

جوش بہار کی جنوں انگیزیوں کی یُوں تصویر کھینچتے ہیں۔

کون پابندِ جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا　　اِس برس ننگِ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

نازک مزاجی محبوب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فرشِ گل پر گر قدم رکھتا ہے وُہ نازک مزاج　　پانوں اپنے پونچھتا ہے چادرِ مہتاب سے

اساتذۂ دہلی خصوصاً خاندانِ غالب و مومن میں فارسی ترکیبوں کا استعمال اکثر ہے اور بڑی خوبی سے ہے اور علاوہ اسکے کہیں کہیں بجائے اصل فارسی ترکیبوں کے انکے ترجمے اُردو میں اس دلاویزی کے ساتھ کئے گئے ہیں کہ قدردانانِ سخن ہی کا دل جانتا ہے اور یہ بات شعرائے لکھنؤ میں بہت کم پائی جاتی ہے لیکن عیشی کا کلام اس قسم کی خوبیہائے لطیف سے لبریز نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہُوا سرمایۂ صد الاماں ناسور سینے کا　　　　بنا صبحِ قیامت مرہم کافور سینے کا

کبھی صیاد چھیڑے ہاتھ گا ہے باغباں والے　　　　چمن میں کیا سمجھ کر کوئی طرح آشیاں ڈالے

شور افگندن کا ترجمہ کرتے ہیں۔

نہ چھیڑا ہو باغباں گل کو مبادا آہ و نالے سے　　　　چمن میں شورِ محشر بلبل آتش زباں ڈالے

ہجوم نو قوالی کم نہیں تسخیر عیشی کو　　　　کوئی کیونکر نکل سکتا ہے کو زنجیر گراں ہوئے

اُسے آتے جو دیکھا بلبلوں نے سیرِ گلشن کو　　　　کئے سو شکر کے سجدے جھکا کر گل کی گردن کو

جنوں نے پائے وحشت آشنا باہر نکالا جب　　　　مرے دامن سے ٹکرا موعود محشر کے دامن کو

پائے وحشت آشنا کی ترکیب ملاحظہ ہو۔ میر حسن مرحوم صاحب مثنوی نے بھی اسی کے برابر کا مضمون کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

شب وصلِ صنم ہے آج اے ہمدم کسو ڈھب سے　　　　گریبانِ سحر کو ٹانک دیجو دامنِ شب سے

گریباں گیر گردوں ہو غبارِ راہ محرومی　　　　کسی کی خاک سر جھٹکا کسی ظالم نے دامن کو

نقاب یار جب خلوت سرائے ناز میں اُٹھا　　　　بنایا عکسِ رُخ نے برگِ گل ذراتِ روزن کو

نہ دیکھا نازنینانِ چمن کا سانحہ عیشی　　　　جہاں سے اُٹھ گیا میں چھوڑ کر آباد گلشن کو

اور کہتے ہیں۔

ہستی کا جو اپنے مجھے مختار بناتے | سو بار مٹاتا اسے سو بار بناتے

نے کبھی روئے نہ پٹکا سر کو کا ہو سنگ پر | مفت اپنا خون ہوا جرم شکست رنگ پر

ہم نے عیشی سے جو پوچھا دل پر خون کا حال | اک صراحی مے گلگوں کی بھری دکھلائی

اس قسم کے صدہا اشعار ہیں جنکے اسباب دلپذیری محتاج بیان نہیں ہیں۔

عیشی کے کلام میں اگر کچھ نقص ہے تو یہ ہے کہ اُن کی اکثر غزلیں صرف خوبی ترکیب زور پر قائم ہیں۔ ورنہ بلندیٔ مضامین کے لحاظ سے اُنکا پایہ بہت پست ہے۔ علاوہ بریں کہیں کہیں تعقید لفظی بھی اعتدال سے زیادہ ہے اور ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ التزام لطافت الفاظ و ترکیب فارسی نے اکثر مقامات پر اُن کے کلام میں یکسانی پیدا کر دی ہے اور اس لئے اگر ایسے مقامات کے اشعار متفرق طور پر پڑھے جائیں تو انتہا سے زائد پر لطف ہوتے ہیں لیکن اُنکے سلسلہ وار پڑھنے میں وہی نقص یکسانی اُن کی خوبیوں کو باوجود موجودگی نظر سے چھپا دیتا ہے۔ اور یہی ایک بات ہے جس سے ہم انہیں اوّل درجہ کے اُستادوں میں شمار نہیں کر سکتے کیونکہ اساتذہ کے کلام میں ہر قسم کے مذاق کے لئے سامان دلچسپی موجود ہوتا ہے اور اس لئے اُس میں اس قسم کے عیوب کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً مرزا غالب یا خواجہ آتش کا کلام۔ غرضکہ بحیثیت مجموعی عیشی کا کلام بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور اُنکا دیوان جو کہ کمیاب ہے اس قابل ہے کہ شائقین سخن اس کے ملاحظہ سے محظوظ ہوں۔ آخر میں اُنکے دیوان سے چند منتخب غزلیں ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

مقبول گوش گل بھی سیر افغاں نہ ٹھہرا | ہمرتبہ عنادل میں خستہ جاں نہ ٹھہرا

تھا بسکہ بے تعلق مانند نکہت گل | دوش نسیم پر بھی میں کچھ گراں نہ ٹھہرا

بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہے کیونکہ اُنکا ہر فعل خود غرضی اور بیجا خودداری کے اصُولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اُنکے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد تک محدود ہوتا ہے اور وُہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بحیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پُوری پُوری آگاہی ہو اور وُہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے۔ مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔ اِس قسم کا کامل انسان بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی بچے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جاوے کیونکہ یہ کمال اخلاق تعلیم و تربیت ہی کے وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصُول کو مدنظر نہیں رکھتے وُہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں جس کا نتیجہ تمام افراد سوسائٹی کے لئے انتہا درجہ کا مضر ہوتا ہے۔

اس مضمون کی تحریر سے ہماری یہ غرض ہے کہ علمی اصُولوں کے رُو سے بچپن کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ بچوں میں کون کون سے قوائے کا ظہور پہلے ہوتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کس طرح ہونی چاہئے۔ ہم ایک ایسا طریق پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو محض خیالی ہی نہیں ہے بلکہ ایک قابل عمل طریق ہے۔ جس سے بچوں کی تعلیم کے لئے ایسے آسان اور صریح اصُول ہاتھ آجاتے ہیں۔ جنکو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ سکتا ہے اور انکے نتائج سے مستفید ہو سکتا ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ناظرین ان سے فائدہ اُٹھائینگے اور اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں ان اصُولوں کو ملحوظ خاطر رکھینگے۔ کیونکہ

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا مے رود دیوار کج

سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وُہ کون سے امور ہیں جو عالم طفلی کے ساتھ مختص

بچّوں کی تعلیم و تربیت

پڑھے ہوئے شاگرد کو پڑھانا ایک آسان کام ہے مگر انجان بچّوں کی تعلیم ایک ایسا دشوار امر ہے کہ ہمارے ملک کے معلّم اس کی دقتوں سے ابھی پورے طور پر آشنا نہیں۔ ہمارا پُرانا طریقۂ تعلیم چونکہ بچّوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا اسواسطے اس کا نتیجہ اُن کے حق میں نہائت مضر ثابت ہوتا ہے۔ اُن کے قوائے ذہنیہ برباد ہو جاتے ہیں اور انکے چہروں پر ذکاوت کی وُہ چمک نظر نہیں آتی جو اس بے فکری کی زندگی کے ساتھ مختص ہے۔ بڑی عمر میں یہ تعلیمی نقص اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔ روزمرّہ کے معاملات کا سمجھنا اور اُن کی پیچیدگیوں کو سلجھانا جو ایک عملی طبیعت کے آدمی کے لئے نہائت ضروری اوصاف ہیں اُن میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی ناکامیوں کا ایک افسوسناک سلسلہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے لئے انکا وجود محض معطّل ہو جاتا ہے۔

سچ پُوچھئے تو تمام قومی عروج کی جڑ بچّوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصُولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصہ میں تمام تمدّنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی کا ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اُس کے ظاہری حُسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اسکی خُوبیوں کے ثناخواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دُنیا کے لیے اسکا وجُود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یُونانی شاعر کہتا ہے اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اَوروں پر پڑ کر اُنکو دیانت داری اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیویں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دِن بدن وسیع ہونا چاہیے۔ تاکہ اِس کے قلب میں وُہ وسعت پیدا ہو جو رُوح کے آئینہ سے تعصّبات اور توہّمات کے زنگ کو دُور کر کے اسے مجلّا و مصفّا کر دیتی ہے۔ صدہا انسان ایسے ہیں جو دُنیا میں زندگی

وُہ بنیں زہر ہلاہل بہرِ ہر نخل و ثمر

ماہتابِ مہرباں کو بھی حسابِ جزر و مد　　جس سے میرے کام میں تھوڑی بہت پہنچے مدد
باوجود اس کے کہ نیچر میں نہیں ہیں ہیر پھیر　　بھول جاتا ہے کبھی قسمت کی دیکھو رد و کد

آسمانوں کی فضا سے اوس بھی گرتی نہیں
چرخِ گردندہ کی چرخی بھی کبھی پھرتی نہیں

مہرباں گر مہرِ انور ہو تو پھر ٹھنڈی ہوا　　صورتِ ژالہ بنا دیتی ہے اِک اِک اجزا
گر ہُوا بھی رحم پر ہو پھر گلا ہے وقت کا　　بارشِ بے وقت بیڑا غرق کرتی ہے مرا

دیکھو کھیتوں میں سرے کھلیاں ہیں ڈوبے پڑے
جس سے بھوسہ بہ گیا دانے گلے خوشے سڑے

دورِ دوراں کے تلوّن سے جو ہمت ہار کر　　میں نے باندھا نہر[۵۱] شاہی کی طرف رختِ سفر
تا کہیں ہو تشنہ کامی کی مصیبت سے مفر　　اور ملے دریا کا پانی مجھ کو شاید پیٹ بھر

پر وہاں بھی تھا سراب اور مُدعا مفقود تھا
جس زمیں پر میں گیا وہاں آسماں موجود تھا

تھا یقیں مجھ کو کہ تھی میری ہی ملکیت زمیں　　روک میرے ہل کو تھی میرے سوا شائد کہیں
تھا فقط سرکار کا (وہ بھی بشرح کمتریں)　　میری محنت اور پیداوار سے حق مبیں

شرحِ نذرانہ نے ثابت کر دیا مجھ پر مگر
کالنی[۵۲] میں ہے خداوندِ دگر عالم دگر

میں سمجھتا تھا کہ ہے سرکار کو میرا خیال　　بہتری میری ہی تھی منظور تا حدِ کمال
میری خاطر ہی ہوا اجرائے ایکٹ[۵۳] انتقال　　تا کہ ساہوکار کا سر سے ٹلے میرے وبال

---

[۵۱] نہر چناب جو سرکار نے جاری فرمائی ہے ۱۲　[۵۲] کالونی نئی آبادی - نئی بستی ۱۲　[۵۳] ایکٹ انتقالِ اراضی جو پچھلے سال پنجاب میں نافذ ہوا ۱۲

ہیں نہ کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ رکھا جاوے اور ان سے بااحسن وجوہ فائدہ
اُٹھانے کی کوشش کی جاوے -

(۱) اس ضمن میں پہلی بات جو ہر مطالعہ کرنے والے کو صاف دکھائی دیتی ہے یہ ہے
کہ بچّوں میں ایک قسم کی اضطراری حرکت کا میلان ہوتا ہے جو نہ صرف انسان کے ساتھ
خاص ہے بلکہ ہر حیوان میں پائی جاتی ہے - دیکھئے بلّی کا بچّہ کیا مزے سے خود بخود
کھیلتا ہے - چھوٹے کتّے کی زنجیر کھولدو تو اضطراری حرکت کی خوشی میں پھولا نہیں سماتا -

بین صاحب جو اُنیسویں صدی کے مشہور حکما میں سے ہیں - اس اضطراری جوش
کو بچّے کے نشو و نما کے لئے بڑا ضروری جزو خیال کرتے ہیں - کیونکہ اس حالت اضطرار
میں اسکے اعضا حرکت میں آنے کے لیے کسی بیرونی محرک کے محتاج نہیں ہوتے -
بچّوں میں اعصابی قوّت کی ایک زائد مقدار ہوتی ہے - جو کسی نہ کسی راہ سے صرف ہو کر
اُن کی خوشی کا موجب ٹھہرتی ہے - اگرچہ بسا اوقات ان کے ماں باپ کو اس سے تکلیف
بھی اُٹھانی پڑتی ہے - بعض دفعہ اعصابی قوّت کی یہ زائد مقدار رونے چلّانے میں صرف
ہو جاتی ہے بعض دفعہ بے تحاشا ہنسنے اور کھیلنے کودنے میں - پس جو لوگ بچّوں کے
رونے سے تنگ آتے ہیں اُن کو یاد رہے کہ یہ بھی اُن کے جسمانی اور روحانی نمو کے
لئے [illegible] کی اور ذہنی [illegible]
ہیں [illegible] ان کے ایک [illegible] کہ بچے [illegible] حرکت میں [illegible]
وجہ [illegible] خارجی اشیاء کا رفتہ رفتہ علم [illegible] حاصل [illegible] حقیقت [illegible] کہ بچہ ایک
منفعل ہستی نہیں بلکہ سراپا ایک متحرک ہستی ہے - جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی
عقلی فائدہ اُٹھانا چاہیے مثلاً اینٹوں کے گھر بنانا - [illegible] میں [illegible] پڑنا - گانا وغیرہ
وہ زائد اعصابی قوت جو رونے اور بیجا شور کرنے میں صرف ہوتی ہے - ایک باقاعدہ
شور یا راگ میں آسانی سے منتقل ہو سکتی ہے اور وہ قوّت جو ضرر رساں اشیاء کے چھونے

کھیت اپنی لہلہاتی کھیتیوں کو دیکھ کر — سبز باغ امید کے آنے لگے مجھ کو نظر
قہقہا میں نے لگایا گردش افلاک پر — بے تحاشا منہ سے نکلا نعرہ فتح و ظفر

خیر مقدم ساقیا برخیز و در دہ جام را
شاد باش خاک بر سر کن غم ایام را

سماں ہوا کہ قبل از وقت میں یہ سب باغ — صبح ہونے تک جلا کرتا ہے کوئی ہی چراغ
پر نہ سمجھا گنگوں سے واقف ہے کوئی ابلغ — چند روزہ ہی ہوا کرتے ہیں اکثر سبز باغ

کامیابی و ناکامی ہیں دونوں ہم ردیف
اور ہمیشہ ہیں بہار و خزاں باہم حریف

پہلے خود سرکار نے بانٹے تھے کچھ تخم پنبہ — منڈیں بے وقت یا بروقت کہیں اس پر مزید
چھوٹی پسالے کو میری قسمت کی کلید — جس کی اک مٹھی میں بیم اور دوسری میں تھی امید

جب کہ نادرشاہی تھے تختے سب گئے فورا الٹ
وہ رضامندی سے جیسے ہوتی قسمت کی کایا پلٹ

کھیت پر پھر میرے پٹواری ہوا رونق فزا — تھی لسن کی طرح جس کی ستمگر ہر ادا
ایک طرف تو آب ضائع[1] کا تقاضا تھا مجھے — اور خرابہ[2] کا خیال اپنی طرف تھا کھینچتا

اس فرشتے کے ہیں ہاتھوں کو نہ کچھ گرد جو سمجھ
تھی قلم کی جس کی حرکت جنبش کلک قضا

کوئی افسر گانوں میں کرتا ہے آکر گھوڑ گھا — کوئی کر جاتا ہے مجھ سے ظاہری دار و مدار
دودھ گھی کا ہے کوئی قیمت دکھا کر خواستگار — اور کسی صاحب کو قیمت کی رسیدیں ہیں بکار

[1] (آب ضائع) اگر اچانک کسی کاشتکار سے کھال ٹوٹ کر پانی ادھر ادھر ہو جائے تو اس جرم کا نام آب ضائع ہے اور اس پر کاشتکاران مستوجب جرمانہ ہوتے ہیں ۱۲ [2] (خرابہ) جس کھیت میں کسی وجہ سے پیداوار نہ ہو اس کو خرابہ کہتے ہیں اور اس کا لگان پٹواری اور ضلعدار کی رپورٹ پر معاف ہو جاتا ہے ۱۲

اس سے آگے کیا سُناوے ایک دہقانِ غریب — داستاں ہے گو طویل اور قصہ گو سارا عجیب
کس طرح جاؤں کبھی حکّام والا کے قریب — اُنکو دیکھوں یا سُناؤں یہ کہاں میرے نصیب

لکھنے والوں نے مری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا
تھا وہ برتر از رسائی اے آہِ نارسا

سراج الدّین احمد

کلامِ آزاد

گو ہمارے رسالہ میں چند غزلیں مولانا محمد حسین آزاد دہلوی سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کے کلام سے نمونہ کے طور پر مع ایک تمہیدی مضمون کے ہدیہ ناظرین ہو چکی ہیں۔ اب کچھ اور کلام اُنکا ہاتھ لگا ہے۔ اُسے آج تبرکاً درج کرتے ہیں:-

جہازِ عمرِ رواں پہ سوار بیٹھے ہیں — سوارِ خاک ہیں۔ بے اختیار بیٹھے ہیں
چمن میں اٹکے ہوئے ہیں جو دامنِ گل سے — وہ دل میں بلبلِ شیدا کے خار بیٹھے ہیں
ہزار شہید ہیں بے قتل و دشنہ جو سوتے — کہ جو وبال تھا سر سے اُتار بیٹھے ہیں
کمالِ عشق تو یہ ہے کہ جو بظاہر حال — بگاڑ بیٹھے ہیں یہاں وہ سنوار بیٹھے ہیں
کمانِ ابروے جاناں کے دل سے ہوں قربان — کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں
نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا وہ صید افگن — دلوں کو ہاتھوں پہ رکھے شکار بیٹھے ہیں
عمامہ شیخ کا چھوڑینگے کیا بھلا وہ رند — جو اپنی پگڑی کو پہلے اُتار بیٹھے ہیں

تمتّع عشق میں ہم کیا اُٹھائینگے آزاد
کہ نقدِ دل کو تو پہلے ہی ہار بیٹھے ہیں

تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

یہاں ہوں جنکے پٹواری امین اور ضلعدار ۔ خوان پر ہوں جنکے تحصیل اور پولیس کے چوبدار
اور جنہیں لانی پڑیں ساری ضروریات ادہار ۔ قسمتیں اُن کی لگا دے چوگنی دوکاندار

بھول کیسے جائیں یہ کمبخت ایسی اوفتاد
رُوحِ نعمت[51] خانِ عالی کو کریں کیونکر نہ یاد

آنچہ برمن مے رود گر بر شتر رفتے زغم ۔ مے زدندے کافراں در جنت الماوے علم
دل مرا ہر چند تھا آماجگاہِ تیرِ غم ۔ پر جفا کو میں وفا سمجھا ستم کو میں کرم

گر ز دستِ زلف مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوئے شما بر من جفائے رفت رفت

کھیت کچھ پہلے ہی پانی کی کمی سے خشک تھا ۔ دورہ والوں کے طویلوں میں بھی کچھ جا کر کھپا
کمیوں[52] کا حق ادا کرنا بھی اپنا فرض تھا ۔ سر پہ چڑھ کر اہلکاروں نے بھی فصلانہ[53] لیا

قرضِ ساہوکار اور برداشت دوکاندار
ایک میں ہوں اور میری جان کے خواہاں ہزار

کہ گئی کھیتی کی پیداوار جب یوں خیرباد ۔ مالیے کو آ گیا مذکور بے نیکو نہاد
گھر ہوا قرق اور ہوئی نیلام ساری جائداد ۔ اب ملنگوں کی طرح بیٹھا کروں مولا کو یاد

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

---

[51] نعمت خان عالی نے وقائع گول کنڈہ میں ایک قصیدہ شہر آشوب لکھا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔
صدائے ہاتمی از خانۂ برخاست پرسیدم ۔ چہ شد گفتند وارد گشت دریں خانہ مہمانے
[52] گاؤں کے کمین لوگ۔ [53] اہلکاران نہر جو ششماہی نذرانہ زمینداروں سے لیتے ہیں فصلانہ کہلاتا ہے۔

جہاں کو چاہے اگر زیرِ سکّہ کر لینا
تو نقش سیکھ لے زر سے سرِ جگر لینا

معاملہ بھی ہے کیا صاف دین و دُنیا کا
ادھر کے ہاتھ سے دینا ہی اور ادھر لینا

وبالِ جہل کا ہے جھیلنا بہت مُشکل
بلائے سخت کا آساں ہے جان پر لینا

ہے قطرہ اشک کا دیکر یہ کہتی مردمِ چشم
کہ لو یہ نوکِ مژہ میں پرو گہر لینا

لگا دے تخمِ کرم کشتگاہِ دُنیا میں
جو دانہ دانہ سے ہو دانۂ گہر لینا

وُہ مرد ہو کہ ہٹے میداں سے کیونکہ منہ کو کھلا
سمجھتے منہ پہ جو معیوب ہیں سپر لینا

خُدا کے واسطے آوارہ پھر نہ پیکِ خیال
کہ ہے تجھی سے مجھے کارنامہ بر لینا

خیالِ دولتِ دُنیا کو دیکھ دل میں نہ جا
کہ چاہتا ہے یہ مہمان بن کے گھر لینا

گزارِ تیغِ اجل کا ہے فکر کیا آزاد
[illegible] دم کی بات ہے جب چاہو جب گزر لینا

کچکول

[illegible] کی ساری زندگی
زندگی سی زندگی ہے یہ ہماری زندگی

[illegible] فرصت [illegible]
ہائے کہلاتی ہو کیوں بے اختیاری زندگی

[illegible]
[illegible] سے تھی یہی غفلت شعاری زندگی

[illegible] زندگی کا کیا [illegible]
[illegible] زندگی ہے بے قراری زندگی

[illegible] زیست بھی [illegible]
[illegible] یاری زندگی

[illegible] چھیڑ [illegible] دل کی
[illegible] بہاری زندگی

[illegible] کے لئے سامان نہیں
[illegible] مجھ پر [illegible] زندگی

اگر تھی وہ تیغ آزمانے کے قابل | دیا کیوں نہ دل زخم کھانے کے قابل
تمہاری جفائیں ہماری وفائیں | یہ قصے بھی ہونگے سنانے کے قابل
سلام عشق کو کیجیے اور بیٹھ رہیے | یہ پتھر نہیں ہے اٹھانے کے قابل
دبستان الفت میں ہیں طفل مکتب | زمانے کے عالم زمانے کے قابل
ملیں کیا کسی سے کہ الفت نے چھوڑا | نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل
کیا سرخرو روسیاہی نے ہم کو | یہ منہ ورنہ کب تھا دکھانے کے قابل
ہٹے گرد باد اپنی تربت سے کیونکر | یہ جا ہے اسی شامیانے کے قابل

در اشک کو یوں لٹاؤ نہ آزاد
کہ موتی یہی ہیں خزانے کے قابل

کیا لطف ہو جو منہ سے کہے [illegible] دل | مثل حباب [illegible] بیٹھ جائے دل
[illegible] | [illegible] دل
نالاں [illegible] دل | [illegible] دل
دل ہے [illegible] | اب دل میں [illegible] سینہ میں جائے دل
جو کچھ نہ دیکھنا [illegible] | اور آگے دیکھیے ابھی کیا کیا دکھائے دل
آندھی نغمات [illegible] | اڑتے پھرینگے مثل شرر پارہ ہائے دل

[illegible] دیکھنا
[illegible] جائے دل

[illegible] | [illegible] یہاں آکے بے خبر لینا
[illegible] | تڑپ رہا ہوں بڑی دیر سے خبر لینا

اشتہارات

بھارت پرتاپ

سناتن دھرم کا یہ باتصویر ماہواری رسالہ
جھجر (پنجاب) سے نکلتا ہے۔ ۲۰×۲۶
قطیع پر چھتیس صفحہ اس کا حجم ہے۔
مضامین مذہبی اور اخلاقی لائق
مضمون نگاروں کے قلم سے نظم و
نثر میں درج ہوتے ہیں۔ نظم میں
عموماً ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد
صاحب اُفق کا کلام ہوتا ہے۔ ماہِ
حال سے دوسری جلد شروع
ہوتی ہے۔ درخواستیں جلد بھیجنی
چاہئیں ۔

المشتہر

بشمبر دیال شرما

دیوانِ حبیب

جناب سید کاظم صاحب حبیب کنتوری
یادگارِ ناسخ مرحوم کے کلام معجز نظام
کا مجموعہ جو حیدرآباد مطبع شمسی میں طبع
ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔
اس قابل ہے کہ شائقینِ سخن اسے
حرزِ جاں بنائیں۔ اور اپنے کتب خانوں
کی رونق اس کتاب سے بڑھائیں۔
اس میں غزل کا رنگ بدل دیا گیا ہے۔
اور غزل سے وہ کام لیا گیا ہے۔
جس کی ضروریاتِ زمانہ و ملک و قوم
متقاضی ہیں۔ اس پر زبان ٹکسالی
اور بندشیں استادانِ لکھنؤ کو یاد
دلاتی ہیں۔ قیمت فی جلد (عا) دو روپیہ
مصنف سے معرفتِ راقم طلب کیا جائے۔

المشتہر

مینجر مطبع شمسی حیدرآباد دکن

اِس سینے کی تو ٹھنڈک ہو اِن آنکھوں کا تو تارا ہو — کیا صورت بھولی بھولی ہو کیا مکھڑا پیارا پیارا ہے
ہاں یاد اگر ہو تیری ہو یاں دھیان اگر ہو تیرا ہو — دن رات خیال کی آنکھیں ہیں اس چہرے کا نظارہ ہے

جو سانس ہو سو ہو شعلہ صفت ہر وقت طپش ہر وقت جلن
یہ سینہ ہو یا دوزخ ہے یہ دل ہو یا انگارا ہے

(نیرنگ)

سنا ہے نام فقط پر نشاں نہیں معلوم — پتا میں کیا دوں مجھے خود مکاں نہیں معلوم
ہر اک کا عیب و ہنر صاف منہ پہ کہتی ہے — کریگی کیا مرے حق میں زباں نہیں معلوم
جہاں کی ہو سری مٹی وہیں مجھے پہنچا — وہ سرزمیں مجھے اے آسماں نہیں معلوم
وہ یاں کی رسم سے واقف ہو پوچھ بلبل سے — اگر تجھے روشِ گلستاں نہیں معلوم

(رند)

منصف وہ ہیں ہمارا اگر اختیار ہو — بلبل کا زخمِ دل رگِ گل سے رفو کریں
برسے فلک سے آگ جو پانی کی ہو تلاش — دوزخ ملے بہشت کی گر آرزو کریں

(؍؍)

حق تو یہ ہو کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا — اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں
شور و شر کرتے ہیں یہ ہستی دو روزہ پر — آسماں اہلِ زمیں سر پہ اٹھا لیتے ہیں

(؍؍)

کچھ وہ کھنچے کھنچے رہے کچھ ہم کھنچے کھنچے — اِس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

(عبد الرشید چشتی) — (نوازش علی خاں)

پلکیں ٹکنے میں اڑا ہوں ہاتھ سے صیاد کے — آنکھ میں ڈورا مری موجود ہے سوزن سمیت

(حکیم مرتضیٰ حسین) — (اشرف لکھنوی)

میں ضعف سے وہاں ہوں جہاں نازکی سے تو — کیا حسن اتفاق سے یک جا وطن ہوا

(محمد اقبال) — (ارشد دہلوی)

ہز [illegible] لارڈ کرزن صاحب بہادر بالقابہ کی بے نظیر اور
لاجواب کتاب کا ترجمہ - بامحاورہ اُردو میں -

اس کتاب کا جو سرزمین ایران کے نئے اور پرانے
حالات کا ذخیرہ ہی اور لارڈ صاحب موصوف کی سیاحی کا
نتیجہ ہی مسٹر ظفر علی خان صاحب بی - اے نے جو علیگڈھ کالج
کے گریجوایٹ ہیں - باجازت حضور ولئسرائے و گورنر جنرل
بہادر کشور ہند ترجمہ کرنا شروع کر دیا ہی - اور اس ترجمہ کو
جو موسوم بہ خیابان فارس ہی - ہز ہائینس حضور نظام والی دکن
کے نام نامی پر معنون کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی ہی
یہ بسیط کتاب چار جلدوں میں تمام ہوگی - پہلی جلد با تصویر
جسکے صفحے چار سو کے قریب ہونگے زیر طبع ہی اور مارچ ۱۹۰۲ء
کے اختتام تک تیار ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگی

قیمت نہایت اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ جلد کے ساتھ	قیمت دوم قسم کے کاغذ پر اچھی جلد کے ساتھ
پیشگی پندرہ روپیہ ۱۵ عہ	پیشگی آٹھ روپیہ ۸ عہ
مابعد بیس روپیہ ۲۰ عہ	مابعد دس روپیہ ۱۰ عہ

خریداروں کو پیشگی کی رعایت سے فائدہ اُٹھانے کے
لیے درخواستیں مع نقد قیمت بنام مترجم بھیجنی چاہئیں -

مشتہر

[illegible] چیف [illegible] دفتر

انگریزی زبان

چھ دلچسپ مضامین کا مجموعہ

جن میں

شیخ عبدالقادر بی - اے نے اُردو لٹریچر کی ترقی
کی ضرورت کی بابت بحث کرنے کے بعد شمس العلما
مولانا حافظ **نذیر احمد** صاحب دہلوی
شمس العلما مولوی **محمد حسین** صاحب آزاد
مولانا خواجہ **الطاف حسین** صاحب حالی
پنڈت **رتن ناتھ** صاحب سرشار
مولوی **عبدالحلیم** صاحب شرر کی تصنیفات
پر تنقیدیں لکھی ہیں - یہ وہ مضامین ہیں کہ جنکے
چھپنے پر ملک بھر کے انگریزی اور اُردو اخبارات
میں بہت قدر دانی کے ریویو لکھے گئے اور جنکو
ملک میں بہت کچھ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا
بہت جلدیں بک چکی ہیں تھوڑی سی باقی ہیں

قیمت فی جلد ۱۲ آنہ - درخواستیں بازر
نقد قیمت یا باجازت وی - پی بھیجی جائیں -

المشتہر

[illegible]

مضمون

شیکسپیر یا بیکن

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کے اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر فضل صاحب جو دیسی عیسائی اصحاب کی جماعت میں علم دوست اور باذوق ہونے کے اعتبار سے امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دلچسپ مضمون بھیجتے ہیں۔ جن لوگوں نے شیکسپیر کا نام سنا ہو۔ اور شاید ہی کوئی ہو جس نے نہیں سنا۔ اُنکے لیے اسکی تصانیف کا یہ نیا پہلو ایک لطف خاص رکھیگا۔

شیکسپیر انگلستان کا مشہور ڈرامانویس دُنیا بھر میں اوّل درجہ کا شاعر اور فطرت انسانی کے جذبات کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اُسکی شیریں بیانی اور وسعتِ نظر۔ اُس کی ایجاد اور سخن آفرینی لوگوں کو ہمیشہ حیرت میں ڈالتی رہی ہیں۔ جب اس کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وُہ بڑی عمر تک بالکل ناخواندہ تھا۔ اُسکے خاندانی تعلقات اور سوسائٹی میں کوئی اس قسم کی تاثیر نظر نہیں آتی۔ جس نے اُسکے ذہنی اور قلبی قوائے کو اس قدر نشوونما دیکر ایسے اعلےٰ عروج کو پہنچا دیا۔ وُہ ایک معمولی غریب اَن پڑھ آدمی کا بیٹا تھا۔ گانوں میں رہتا تھا اور جوانی کی عمر میں گانوں کے اوباشوں کی صحبت میں پڑکر ایک ہرن کی چوری کے سبب (اُس زمانہ میں دولتمندوں کے پاس اپنی اپنی چراگاہیں ہوتی تھیں جہاں شکار کرنا جُرم تھا۔ جیسے آجکل سرکاری جنگلات میں درخت کاٹنا جُرم سمجھا جاتا ہے) اپنے گھر سے بھاگ کر لندن میں پناہ گزین ہُوا۔ یہاں آکر تھوڑے عرصہ کے بعد اُس نے اپنے فن ڈرامانویسی سے لوگوں کو گرویدہ کرلیا۔ اور آخر کار ایسے رُتبہ کو پہنچا کہ آج دُنیا بھر اُس کے کمال کی قائل ہے۔ نکتہ رس لوگ ان حالات پر نظر کرکے ہمیشہ سے اس شبہہ میں تھے کہ اس عجیب شخص کے متعلق یا تو قدرت کا ایک بہت بڑا معجزہ صادر ہوا ہے

مخزن کا دوسرا سال

خدا کی عنایت سے مخزن اپنی عمر کا پہلا سال ختم کر چکا ہے۔ ایک مہینہ کی کسر ہے اپریل کا رسالہ نکلا اور مخزن نے دوسرے سال میں قدم رکھا۔ اس سال میں اسکی جو قدردانی ملک کے ذی رتبہ۔ باکمال اور بامذاق اصحاب نے کی ہے۔ اور اسکو رونق دینے والے جو کوششیں محض شوقِ سخن کی وجہ سے اور بغیر ایڈیٹر کے ساتھ سابقہ ملاقات اور تعارف ذاتی ہونیکے بعض بزرگوں نے کی ہیں انکا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے ہم آیندہ سال کی نسبت زیادہ توقعات رکھتے ہیں۔ بہ نسبت اُن امیدوں کے جنکے ساتھ ہم نے اس رسالہ کو جاری کیا تھا۔ گو یہ جتانا ہمارا فرض ہے کہ ہمیں پہلی اُمیدوں میں بھی کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس رسالہ کو روز بروز زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنائیں اور دیگر امور کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ اسکا حجم بھی بڑھا دیں۔ بہت بزرگوں نے یہ رائے دی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی رائے دی ہے کہ قیمت میں بھی اضافہ کر دیا جاوے۔ مگر سر دست قیمت بڑھانا نامناسب سمجھکر ہم اپنے قدردانوں کا شکریہ اس صورت میں ادا کرتے ہیں کہ اپریل آیندہ سے رسالہ میں آٹھ صفحہ اور بڑھا دئے جائیں گے اور قیمت وہی رہیگی جو اب ہے۔ گویا بہ صرف بجائے ۵۲ صفحہ کے ساٹھ صفحہ کا رسالہ شائع ہوا کریگا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ اس کے معاونین اور بہی خواہ اس عزم میں ہمارے معین و مددگار ہونگے اور جو زائد مصارف پڑینگے۔ انکی تلافی زیادہ خریداروں سے کر دینگے اگر ہر خریدار ایک خریدار اور مہیا کرنیکی کوشش کرے تو کچھ ایسی مشکل بات نہیں۔ ہم اس رسالہ کے ساتھ ایک ایک اشتہار بھیجتے ہیں۔ ناظرین اسے اپنے احباب کو دکھا کر انہیں خریدار بننے کا شوق دلائیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ شروع کے خریداروں میں سے جتنے صاحبان سال آیندہ میں خریدار رہنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اگلے مہینہ میں پیشگی چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں یا اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کا پرچہ وی پی کیا جانے کی اجازت بھیجدیں کیونکہ یہ گزشتہ سال کے عمل سے بھی واضح ہو چکا ہے کہ بلا پیشگی قیمت کے یہ رسالہ کسی صاحب کو نہیں بھیجا جاتا

شیخ عبدالقادر
مالک و ایڈیٹر

ابجد کے حروف کے شمار سے انہیں اُلٹ پلٹ کر خط فقط ہندسوں میں لکھا جاتا ہے۔ کبھی حروف تہجی کو دو سطروں میں بالمقابل لکھکر اُوپر کی سطر کے حروف کی جگہ نیچے کے حروف اور نیچے کے حروف کی جگہ اُوپر کے حروف استعمال کرتے ہیں۔ اور جس شخص کے پاس اس کی کُنجی ہوتی ہے وُہی اس کو پڑھ سکتا ہے۔ لارڈ بیکن نے بھی اَور طریقوں میں ایک طریق کا ذکر کیا ہے جس کو دوحرفہ طریق نامزد کرتے ہیں۔ یعنی حروف تہجی کا ہر ایک حرف (ا) اور (ب) کے پانچ دفعہ لکھنے سے بنتا ہے۔ جس میں (ا) اور (ب) کو مختلف حروف کے بنانے میں مختلف دفعہ اور مختلف موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً (ا) لکھنے کے لئے پانچ دفعہ (ا) لکھا جاتا ہے (ب) کے لئے چار دفعہ (ا) اور پھر (ب) علیٰ ہذا القیاس۔ اس کو اَور بھی مخفی بنانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ گویا (ا) کے لئے حروف نستعلیق استعمال ہوں اور (ب) کے لئے حروفِ نسخ۔ اِس طور سے خواہ کوئی خط یا مضمون لکھا جائے مگر محض حروف کے خاص خاص موقعوں پر نستعلیق یا نسخ لکھنے سے باطن میں جو چاہیں مراد رکھ سکتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے کو کچھ بھی پتہ نہ لگے۔ اسی قاعدہ کو مدِنظر رکھ کر لیڈی مذکور نے شیکسپیئر کے طبع اوّل کے نسخوں پر اُسکا امتحان کیا جس سے مصنّف کے خفیہ مطلب کا پتہ لگا لیا۔ اور اب وُہ دعوےٰ کرتی ہیں کہ نہ صرف تمام ناٹک اور نظمیں جو شیکسپیئر کے نام سے موسُوم ہیں بلکہ ملکہ الزبتھ کے زمانہ کی تمام مشہور تصانیف مثلاً سپنسر صاحب کے فیری کوئین گرین اور مارلو کے ڈرامے۔ برٹن کی "اناٹومی اوف ملنکولی" یعنے تشریح مالیخولیا (جسکا ظاہری مصنّف اس کتاب کے شائع ہونے کے وقت فقط دس سال کا تھا) وغیرہ تمام مشہور کتابوں کا مصنّف دراصل لارڈ بیکن ہی تھا۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیکن نے اس قسم کی قابلِ قدر تصانیف کو کس لئے اپنے نام سے شائع کرنا پسند نہیں کیا؟ کیوں اسے یہ ضرورت پڑی۔ کہ ایسی بیش قیمت کتابوں اور دیگر تحریرات کو دُوسرے اور نسبتاً ادنےٰ درجہ کے اشخاص کے نام سے شائع

یا کوئی اور راز سربستہ ہے۔ بعض دل چلے مدت سے اس بات کا کھوج لگانے میں مصروف تھے اور ادھر اُدھر نظر دوڑاتے تھے کہ کہیں کوئی سراغ ہاتھ لگے۔ جس سے اِس عجیب و غریب کمال کی قدرتی ذریعوں سے تشریح ہو سکے۔ یا اگر فی الحقیقت اس تمام لیاقت کا مالک کوئی اَور شخص ہی تو حقدار کو حق ملے۔ عرصہ سے اس امر پر بحث چلی آتی تھی۔ مختلف دعویدار کھڑے ہوتے تھے مگر کافی وجوہات نہ ملنے سے رد کئے جاتے تھے۔ جو جو مشہور شاعر اور انشا پرداز اُس زمانہ کے تھے ایک ایک کر کے سب کو آزمایا مگر کوئی آنکھ میں نہیں جچتا تھا۔ تعجب اس امر کا تھا کہ کس طرح ممکن ہی کہ ایسا عجیب و غریب آدمی اپنے زمانہ میں گمنام و نشان رہکر زندگی بسر کر گیا رفتہ رفتہ بعض لفظی اور خیالی توارادات کے سبب سے بعض نکتہ چینوں کی نظر سر فرانسس بیکن انگلستان کے مشہور فلاسفر اور موجودہ سائنس اور قیاسی طریق کے بانی پر پڑی۔ ظاہر میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایسے فلاسفر اور سنجیدہ مزاج شخص کو ناٹکوں خاصکر تمسخر آمیز نقلوں کے لکھنے والا سمجھنا اپنے آپ کو مسخرہ بنانا ہے۔ مگر جو اس مسئلہ کے طرفدار تھے وُہ کئی وجوہات پیش کرتے تھے۔ مخالفین بھی انکی تردید کے لئے تیار تھے۔ الغرض یہ چپقلش سالہا سال سے چلی آتی تھی لیکن حال ہی ہیں ایک لیڈی مسز گیلپ نامی نے اس جھگڑے کا خاتمہ کر دیا اور قدیم نسخوں کی طرز تحریر سے ثابت کر دیا کہ یہ درحقیقت لارڈ بیکن ہی کی کارستانیاں ہیں جو شیکسپیئر کی آڑ میں دنیا کو اپنا گرویدہ کر رہی ہیں۔ عجیب دل و دماغ کا آدمی ہے۔ نہ صرف فلسفہ اور علمی تحقیقات میں وُہ سب کا اُستاد اور نئی ذہنی دُنیا پیدا کرنیوالا بلکہ آجکل کی اعلیٰ شائستگی اور علمی دریافتوں کا مُوجد ٹھہرا۔ بلکہ لٹریچر کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصنیفات کا بھی جس کو دیکھ کر نہ صرف یوروپ بلکہ سارا زمانہ دنگ ہو رہا ہے سہرا اسی کے سر رہا۔ اس لیڈی نے بھی کمال کیا اُسے ایک اصُول خود لارڈ بیکن ہی کی ایک کتاب موسومہ "علم کی ترقی" (باب ۲ فصل ۱) سے ہاتھ آیا جہاں صاحب موصُوف خفیہ تحریروں پر بحث کرتے ہیں۔ اور اُن کے لکھنے کے مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے ناظرین بھی اِس قسم کے طریقوں سے واقف ہونگے۔ چنانچہ

کرے۔ اس کے لئے معقول وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ بیکن درحقیقت ملکہ الزبتھ کا فرزند تھا جو رابرٹ ڈڈلی ارل لیسٹر کے نطفہ سے پیدا ہوا تھا۔ ملکہ نے خفیہ طور پر ارل سے شادی کر لی۔ مگر وہ نہ چاہتی تھی کہ کسی کو عوام الناس کے سامنے اپنا شوہر تسلیم کرے۔ جس سے اس کی حکومت کا ایک دوسرا شریک پیدا ہو جائے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی لیڈی بیکن کے سپرد کیا گیا جو ملکہ کی رازدار تھی اور اس نے اس کو اپنے بچہ کے طور پر پرورش کیا۔ ملکہ کا ایک دوسرا لڑکا بھی تھا جو بعد ازاں ارل اوف سکس ہو گیا۔ بیکن نے بڑا ہو کر اس راز سے واقف ہو گیا۔ اور ملکہ کی حین حیات میں اسے کامل امید تھی کہ وہ آخر کار اسکو اپنا لڑکا تسلیم کر لیگی اور اس طور سے وہ اس کا ولیعہد ٹھہریگا۔ مگر اس کی یہ امید بر نہ آئی جس کی وجہ شائد زیادہ تر اسکے باپ کی بے اعتدالیاں تھیں جو آخر کار اس کی جان لینے کا باعث ہوئیں۔

یہی وجہ تھی کہ لارڈ بیکن اپنے راز کو مخفی رکھ کر اپنی اس قسم کی تصانیف کو دوسروں کے نام سے مشتہر کرتا رہا۔ جیسے آجکل ہمارے ملک میں ابھی تک سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی ناٹک لکھنا یا ایکٹر بننا ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ بیکن جو نہ صرف اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ بلکہ ایک دن تختِ انگلستان پر جلوس کرنے کی امید رکھتا تھا۔ بھلا کب اس امر کو گوارا کرتا تھا کہ وہ اس طور سے اپنی عزت کو داغ لگائے۔ وہ دل سے تو جانتا تھا کہ اس میں کچھ برائی نہیں اور اپنی طبیعت کی روانی سے بھی مجبور تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لوگ کبھی دن ان موتیوں کی قدر کرینگے۔ مگر اس کے اپنے زمانہ میں اس قسم کی امید رکھنا ناممکن تھا۔ اس لئے رائے عوام کا پاس اسے ہر طرح سے اس امر کو خفیہ رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔

خط مخفی کے علاوہ اور کئی ایک شہادتیں اس قسم کی پائی جاتی ہیں۔ جن سے بیکن کا حقیقتاً مصنف کتب شکسپیر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یا کم سے کم یہ کہ اور کوئی ہو تو ہو مگر شکسپیر انکا مصنف نہیں ہو سکتا۔ شکسپیر جیسا ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ۱۹ سال کی عمر تک بالکل ناخواندہ

دیا ہے۔ البتہ وہ اپنے اہل مقدمہ سے فیس لیتا تھا اور یہ اُس زمانہ کے دستور کے عین مطابق تھا۔ بلکہ وزرائے دولت بھی فیس ہی پر گذارہ کرتے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ شاہ جیمس کے وزیر اعظم کی تنخواہ کُل اسی پونڈ یعنے آجکل کی شرح کے بموجب کل بارہ سو روپیہ سالیانہ تھی جس پر وہ بادشاہانہ شان و شوکت سے بسر کرتا تھا۔ اُس زمانہ کی بلکہ اُس کے بعد کی صدیوں کی بھی قریبًا وہی حالت تھی جو ہمارے مُلک میں اسی صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت کی یا اب سے چند سال پہلے کے ہندوستانی راجواڑوں کے عُہدہ داروں کی تھی۔ جہاں بڑے بڑے عہدہ داروں کو پانچ پانچ دس دس روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے مگر اُنکے گھوڑوں کے زین ہزار ہا روپیوں کی مالیت کے ہوتے تھے۔ غرضکہ اس زمانہ کے انتظام حکومت کی بنا ہی لوٹ مار اور نوچ کھسوٹ پر تھی۔ لیکن ہم کو اِسوقت ان اُمور سے کچھ بحث نہیں۔ ہم فقط اس امر کی شہادت پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اِن مشہور ڈراموں کا مُصنّف دراصل کون ہے۔ اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب ان اصُولوں کو مدِ نظر رکھ کر شیکسپیر کے ڈراموں اور اُنکی تاریخ تحریر کا مطالعہ کرینگے۔ تو وُہ اُن پر ایک نئی روشنی پڑتے دیکھینگے اور اس قدر لُطف حاصل کرینگے جو شائد انہیں پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا ہوگا۔

اور اگر یہ بات سچ ہے تو کیا یہ ایک عجیب و غریب ثبوت اس امر کا نہیں کہ کس طرح تاریخ اس قسم کے رازوں کو چھپائے رکھتی ہے اور آخر کار جب وقت آتا ہے تو ایک شخص اُس راز کی مُہر کو عجیب و غریب طور سے توڑتا اور ایسے ایسے عجائبات دُنیا پر ظاہر کرتا ہے جو معصروں کے کبھی شائد خیال میں بھی نہ گذرے ہونگے۔ جو لوگ اس بات پر اپنی اُمیدیں باندھتے ہیں کہ جس طرح ہو سکے خواہ جائز و خواہ ناجائز ذریعوں سے اہل زمانہ کی نظر میں عزت و شہرت حاصل کریں۔ خبردار رہیں کہ اُنکا سارا بھید کسی نہ کسی دن ضرور کُھل جائیگا۔ اور جو لوگ اپنی زندگی اپنی قوم اور ملک کی سچی بہبُودی میں خرچ کرتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں اُن کی کوئی قدر

ہیں جنکا کوئی معقول جواب نہیں ملتا۔ اور آخر کار صاف ماننا پڑتا ہے کہ بیچارہ شیکسپیئر ایک معمولی دِل و دماغ کا آدمی تھا۔ جس کی لیاقت سے اِس قسم کی حیرت انگیز ایجادیں ایسی ہی دُور تھیں جیسے آسمان زمین سے دُور ہے۔

مگر اِس کے علاوہ اَور بھی شہادت موجُود ہے جس سے لارڈ بیکن کے مصنف ہونے کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بیکن کی تصنیفات میں ایک ایسی کتاب بھی پائی جاتی ہیں۔ جس میں بیکن نے چھ مختلف زبانوں میں سے تمثیلیں۔ چٹکلے۔ لطیفے اور دلچسپ اقتباسات جمع کئے تھے۔ اور یہ سب کسی نہ کسی صُورت میں ان ناٹکوں میں پائے جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بیکن نے اِن ناٹکوں میں سے ان فقرات کو اقتباس کیا تھا۔ اگر یہ سچ ہو تو اِس امر کا بھی جواب دینا پڑیگا کہ یہ اقتباسات بیکن کے کس مصرف کے تھے۔ کیونکہ اُس کی دیگر تصانیف میں انکا کچھ بھی اِستعمال نہیں ہوا۔ کیا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ بیکن جیسا فلاسفر اس قسم کے بیہودہ شغل میں اپنے بیش قیمت وقت کو ضائع کرتا۔

الغرض یہ تمام وجُوہات نہائت مضبُوط ہیں اور قطعی طور پر اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ فی الحقیقت بیکن ہی اُن درر شہوار کا جواب شیکسپیئر کے نام سے منسُوب کئے جاتے ہیں۔ اصلی مخزن تھا۔ اور وُہی دماغ جس نے فلسفے اور موجُودہ علوم کی بنا رکھی اپنی ایجاد پسند اور سخن آفرین طبیعت سے آیندہ نسلوں کے شغل اور تفریح کے لئے نظم کے موتی پرو رہا تھا۔

بیچارے بیکن کی خصلت پر رشوت ستانی کا ایک بدنما داغ چلا آتا ہے جس سے پوپ جیسے شاعر کو بھی یہ کہنے کا موقعہ ملا کہ وُہ بنی نوع انسان میں سب سے دانا اور نہائت روشن مگر نہائت کمینہ تھا۔ لیکن تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الزام درحقیقت درست نہیں۔ جس مقدمہ میں اُسے آخری عُمر میں پھنسا کر اُس کی تباہی کا بندوبست کیا گیا وُہ محض اُس کے دشمنوں کی کارستانی تھی۔ وُہ ہمیشہ اپنے آپ کو نہائت منصف مزاج حاکم ظاہر کرتا رہا اور ہمیشہ اس امر سے اِنکار کرتا رہا کہ اُس نے کبھی رشوت لیکر اپنے فیصلہ کو پلٹ

فنِ تنقید

کیا وجہ ہے کہ ہماری زباندانی کا ستارہ برجِ نحوست میں آن پڑا؟ کیا باعث کہ علمِ تاریخ کا ہنر ہم سے کھویا گیا؟ کیا سبب کہ حکمت و فلسفہ جہاں اب سے چھ سو سال پہلے تھے وہیں کے وہیں رہ گئے؟ اعلٰے تصانیف کا سلسلہ کیوں منقطع ہوگیا اور غیر معتبر بے مصرف اور بے ربط تالیفات پر ہمارے عالموں اور جاہلوں نے کیوں کمر باندہ لی؟

اس ترقیِ معکوس کے کئی باعث ہیں۔ لیکن اسوقت ہم صرف ایک باعث کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور وُہ فنِّ تنقید کی کمی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ مخزن کے گلشن میں فنِ تنقید کا غنچہ کھلا۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اسے سمومِ حوادث سے بچائیں۔ یہ تمنا ہو کہ اسکی مہک ہمارے علم ادب کے پژمردہ پھولوں کو دوبارہ تازگی بخشے۔ یہ آرزو ہے کہ اس کے طفیل ہماری زباندانی بھی لفظی مخصوں سے نکل کر اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے لگے۔ اور ہمارے عشق کے فسانوں کے دیوانے ہوش سنبھالکر علم و ہنر کی روشوں پر چلیں۔ مخزن ہمیں درِ تنقید دینے کا وعدہ کرتا ہے اور ہمیں اڈیٹر صاحب کی طبع سلیم کے اس بیش بہا تحفہ کے قبول کرنے میں کچھ سوچ در کار نہیں۔ ہاں فنِ تنقید کی نسبت کچھ اور کہنا مقصود ہے نکتہ چینی بُری تو بیشک ہے۔ لیکن ایسی تقریظ جو محض تعریف پر مشتمل ہو اس سے بدرجہا بدتر ہے۔ نکتہ چینی سے تو صرف مصنف کا دل دُکھایا جاتا ہے لیکن تقریظ سے غیر مفید اور ناقابلِ قدر کتابوں کی تعداد بڑھائی جاتی ہے۔ اور جو مطالعہ کتب کے شائق ہیں انکے قیمتی وقت کا خون کیا جاتا ہے۔ تنقید جیسے کہ اڈیٹر صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کیا تھا ایک کسوٹی ہے جسپر کہ کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے۔ لیکن اتنا کہنے سے فنِ تنقید کی ماہیت نہیں کھلی۔ اسکا اصول یہ ہے کہ انسان کو اس کی موجودہ حالت سے اعلٰی حالت

نہ کرے تو وہ یقین رکھیں کہ خدا تعالیٰ کے دفتر میں انکی نام خدمات درج ہیں اور وقت معینہ پر وہ نہ صرف اس سے فرحت پائیں گے بلکہ آئندہ نسلیں ان کی بوئی ہوئی فصل کاٹیں گی اور انکے نام پر فخر کیا کرینگی ۔

فضل

بئے کا گیت ۔ منشی ظفر علی خاں صاحب بی اے نے حال ہی میں ایک کتاب جس کا نام "جنگل" شائع کی ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف کپلنگ کی ایک مقبول تصنیف کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ اس میں جانوروں کی دلچسپ کہانیاں ہیں ۔ بئے کا ایک گیت انہوں نے اس کتاب میں لکھا ہے جسے ہم ذیل میں نمونۃً درج کرتے ہیں ۔ ۔

گویا بھی ہوں اور درزی بھی ہوں میں
یگانہ ہوں سینے میں گانے میں یکتا

مجھے ناز ہے اپنے میٹھے سروں پر
مجھے فخر ہے اپنی بخیہ گری کا

ہوا گونجتی ہے مرے چہچہوں سے
چمن [illegible] ہے میرے ترانوں کا چرچا

سیا چونچ سے میں نے اپنا نشیمن
نہ ادھڑے کا اس میرے بخیے کا ٹانکا

سنا کر لی میٹھی سی بچوں کو لوری
دل اپنے دلاروں کا [illegible] تو بہلا

جنہیں جن کا ڈر تھا وہ سب مر چکے ہیں
نہیں اب کسی کا رہا مجھ کو کھٹکا

وہ اژدر کہ پھنکار جس کی غضب تھی
بنے [illegible] نہنگ اجل کا نوالا

بچی جان جس کی بدولت ہماری
[illegible] چھٹکارا

ہیں شعلے کی مانند سرخ اسکی آنکھیں
ہیں واقف اس کے ہنر [illegible] صفا

پرندے ہیں ممنون احسان اس کے
ادا ان سے شکر اس کا پورا نہ ہوگا

بنائیں چنور دم کو سر کو کریں خم
بیاں بلبلیں پھر کریں وصف اس کا

قرونِ وسطیٰ

(۲)

(سلسلہ کے لئے دیکھو مخزن بابت ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء)

سلطنت روما کے قوانین جمہوری طرز کے تھے - کیونکہ یہ سلطنت مدتوں تک جمہوری رہ چکی تھی اور گو بعد میں جمہوریت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا تھا - بلکہ قیصر ہر طرح سے خود مختار ہوا کرتا تھا لیکن چونکہ اہل روما کے رگ و پے میں قانون دخیل ہو چکا تھا - اور تمام قوانین اور آئین سلطنت قلمبند کئے جا چکے تھے - اس لئے قیصر کے لئے یہ آسان امر نہ تھا کہ وہ محض اپنے حکم کو ملک کا قانون اور اپنی مرضی کو سلطنت کا آئین بنا دے - بلکہ اگر قانون و آئین کو قانون و آئین بھی سمجھے تو بھی اسے کم سے کم رواج عام تو سمجھنا پڑتا تھا - اور قیصر کو مجبوراً اپنے طرزِ عمل کو اس رواج کے تابع رکھنا پڑتا تھا - اس لئے گو سلطنت میں اب وہ خوبیاں باقی نہ تھیں جن کے باعث اُسے مقدس سلطنت کہا جا سکے - پھر بھی ایسا قانون اور ایسے آئین تو موجود تھے جو صدیوں کی دماغ سوزی اور آزادی رائے کا نتیجہ تھے *

رومۃ الکبریٰ خاص اور اس کے گرد نواح میں تو یہ خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ ایک طبقہ امرا قائم ہو گیا تھا جو بغایت متموّل اور کل قابلِ زراعت زمین کا مالک تھا اور دوسرا طبقہ غربا کا تھا جو محض مفلس اور بے برگ و نوا تھے - اور جنکی اوقات نہایت عسرت میں بسر ہوتی تھی - طبقۂ متوسطین جو قوم کے باعث قوت ہوا کرتے ہیں مفقود ہو گئے تھے لیکن یہ خرابیاں تو خاص رومہ تک محدود تھیں - باقی ساری سلطنت میں تا حال موروثی امرا کا کوئی طبقہ قائم نہ ہوا تھا - کیونکہ اہلِ روما کا یہ دستور تھا کہ وہ تمام صوبجات کے لئے گورنر روما سے مقرر کر کے بھیجا کرتے تھے - اور ہر گورنر کے لئے پانچ سے دس سال تک

پر پہنچایا جاوے۔ اِس لئے یہ سب علوم و فنون پر حاوی ہے کیونکہ غائت اُنکی بھی یہی ہے
کہ سلسلۂ ترقی بنی نوع کو اِس معراجِ کمال پر پہنچایا جاوے کہ دُنیا و مافیہا ایک بہشت کا نمونہ
بلکہ بہشت بنجاویں۔ نقاد کا فرض ہے کہ حضرتِ انسان کو عالمِ ملکوت تک پہنچانے کی تدابیر سوچے
مصوری میں مانی و بہزاد کا نام تو شہرۂ آفاق ہے۔ لیکن نقاد ان اُصُول مصوری یہ قرار
دیتے ہیں کہ مُصور تصویروں میں فطرت کے کرشمے دکھائے۔ نیچر کے اسرار سمجھائے۔
دقائقِ رُوحانی حل کرے۔ خدا کی خدائی کی شان بس ایک لکیر میں اس طرح بتا جائے
کہ سب کو اسکا فقیر بنا لے۔ ہمارے رسُوم و رواج کے خاکے یوں کھینچے کہ خود بخود انکی
اصلاح ہونی شروع ہو جاوے۔ اگر وُہ ایسا کرے تو ضرور ہے کہ آسمانی برکتیں اس کے
ہنر پر نثار ہوں۔ بُت تراشوں کی حکمت یہ ہے کہ آسمانی خیالات کے نقشے پتھر کی رگیں
کاٹ کر کھینچیں۔ صانع کا جلوہ ایک موہنی مُورت میں دکھاویں۔ نغمہ و سرود کے استادوں
کی خوبی یہ ہے کہ سُروں کی ترکیب ایسی رکھیں کہ کبھی تو عُقدۂ عشقِ ازلی حالتِ محویت میں
حل ہو جاوے۔ کبھی مسئلہ اخوت بنی نوع کا راز کھلجاوے۔ اُن جذبات و قویٰ کو طاقت
بخشیں جو منبعِ افعالِ حسنہ ہیں۔ اُن خواہشاتِ نفسانی کو روکیں جو منبعِ اعمالِ ذمیمہ
ہیں۔ اگر نقادِ سخن ہو تو ایسا کہ سخنوروں کو طبقات اعلےٰ کی طرف رہنمائی کرے اور ایک
ایسے جہان کا نقشہ کھینچ دکھاوے جو مکروہاتِ دُنیا سے پاک نقائص سے خالی اور نقائص
سے مُبرّا ہو۔ ہدائت کی مشعل ہاتھ میں لئے پکارتا جائے "ہاں بڑھے چلو"۔ یہی اصُول
باقی علوم و فنون کی تنقید پر صادق آتا ہے۔ غرضیکہ غایتِ فنِ تنقید ترقیِ بنی نوعِ
اِنسان ہے ✦

فضل حسین (بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا)

امیروں کو فوجداری اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے گویا اپنی جاگیر میں یہ امرا بجائے خود خود مختار بادشاہ ہوتے تھے۔ ان تمام عنایتوں کے عوض میں ان کے ذمہ صرف یہ خدمت ہوتی کہ جب بادشاہ کو جنگ کرنی ہو تو یہ جاگیردار اپنے کل کاشتکاروں کو ساتھ لیکر شاہی فوج میں شریک ہوں اور بادشاہ کی طرف سے جنگ کریں اور بادشاہ کو یہ حق حاصل ہوتا کہ جب کوئی جاگیردار مرجاوے تو اس کی جاگیر چاہے جسکے حوالے کر دے۔ جاگیردار کے لڑکے کا کوئی حق نہیں تھا۔

لیکن جب تک آزاد زمیندار یعنے ان اصل باشندوں کی جنہیں مالک زمین تسلیم کیا گیا تھا ایک معقول تعداد موجود رہی اُسوقت تک تو جاگیرداروں کو چنداں قوت حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ اگر کوئی جاگیردار سرکشی کرتا تو اسی کے ہمسایہ آزاد زمیندار بادشاہ کی طرف سے اُس کے ساتھ جنگ کرتے اور جاگیردار کو مجبورًا بادشاہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا اس لئے جب کوئی جاگیردار فوت ہوتا تو بادشاہ اپنے حسب مرضی اُس کی جاگیر کسی اور کو دے ڈالتا۔ یا اُس کے حصے کرکے لوگوں کو بانٹ دیتا۔

لیکن یہ انسانی جبلت میں داخل ہے کہ ہر طاقتور کمزوروں کا مال دبانا چاہتا ہے۔ ان جاگیرداروں نے بھی اسی کلیہ کے بموجب بیچارے آزاد زمینداروں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ اور بتدریج ان لوگوں کی زمینوں پر قابض ہونے لگے۔ بادشاہوں نے اس پولٹیکل خطرے کو نہ سمجھا اور آزاد زمینداروں کی کچھ مدد نہ کی۔ حتیٰ کہ بتدریج کل سلطنت کی زمین سوائے اراضیات نزول کے ان جاگیرداروں کے قبضہ میں آگئی۔ اور اس طرح متوسطین لوگوں کا وجود جو ہمیشہ ان جاگیرداروں کے مقابلہ میں بادشاہ کا معاون ہوا کرتا سلطنت کے طبقہ سے مفقود ہوگیا۔

اب کُل سلطنت کی اراضی دو حصص میں تقسیم ہوگئی۔ ایک تو اراضیات نزول جو بادشاہ کی ذاتی ملکیت ہوتیں اور جنکے کاشتکار خاص بادشاہی فوج ہوا کرتے۔ دوسرے

کی میعاد مقرر ہوا کرتی تھی جسکے بعد اُسے روما کو واپس آنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہو کہ اہل روما کے سوا اور کسی کو اتنی قدرت حاصل نہیں ہوتی تھی کہ وہ غصب سلطنت کا خیال بھی کر سکے۔

لیکن جب مذکورہ بالا جرمنی الاصل اقوام مثلاً فرینک وغیرہ نے سلطنت حاصل کی تو گو اُنہوں نے اہل روما کے بہت سے قوانین کو جاری رہنے دیا۔ مگر آئین سلطنت کو نئے ڈھنگ پر ڈالا۔ اول تو یہ رسم اُنہوں نے جاری کی کہ جب کوئی بادشاہ مرتا تو اسکی سلطنت اسکے تمام لڑکوں میں تقسیم ہوجایا کرتی خاندان کارولنجین اور مارووجین دونوں میں یہ رسم برابر جاری رہی ہے۔ اور اسی سے یورپ کی تاریخ میں بہت سی پیچیدگیاں پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ سلطنت فرینک صرف متعدد دفعہ ایک بادشاہ کے زیر نگین رہی ہے ورنہ بسا اوقات ایک سلطنت میں تین تین بادشاہ ہوتے رہے ہیں جو مختلف مقامات پر سلطنت کیا کرتے تھے۔ اور جب اُن میں سے کوئی ایک لاولد مرجاتا تو اس کی سلطنت بطور وراثت باقی دو میں تقسیم ہوجایا کرتی۔ اور تاحال یورپ میں یہ توریث باقی ہے۔

دوسرا دستور ان قوموں نے یہ جاری کیا تھا کہ جس قدر مُلک یہ فتح کرتے۔ اُسکی تھوڑی سی زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دیتے۔ یہ باشندے اس زمین کے مالک ہوا کرتے۔ اور اُس کے بیع و شرا کا انہیں کلی حق حاصل ہوتا۔ باقی زمین میں سے کچھ حصہ تو بادشاہ کی ملکیت یا نزول سرکار قرار پاتا۔ اور اس نزول کی آمد سے بادشاہ کے ذاتی اور دربار کے اخراجات چلتے۔ باقی کل زمین کو بادشاہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کیا کرتا۔ اور انکو زمین کی وسعت کے مطابق ارل۔ کونٹ وغیرہ کے خطاب دیئے جاتے۔ اس طرح پر سلطنت کی چپہ چپہ زمین ان حصہ داران سلطنت کے قبضہ میں ہوا کرتی۔ اس زمین پر ان لوگوں کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا۔ یہ اپنی مرضی کے مطابق اُسے کاشتکاروں میں تقسیم کرتے اور جسقدر محاصل چاہتے ان سے وصول کیا کرتے۔ اپنے کاشتکاروں پر ان

اس پر طرہ یہ کہ اسی زمانے میں ایک نئی بلا پیدا ہو گئی۔ قسمت میں لکھا ہوا تھا کہ جس طرح سلطنت رومتہ الکبریٰ وحشیوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی ہے۔ اسی طرح اس جرمنی قوم کی سلطنت کا شیرازہ بھی وحشیوں کے ہاتھ سے بگڑے۔ یہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سلطنت روما کی شمالی حد دریائے ڈینوب و دریائے رائن تھے۔ ان دونوں کے جنوب و مغرب کو سلطنت روما تھی۔ اور شمال کی طرف کی کل زمین خانہ بدوش قوموں کے قبضے میں تھی۔ مگر شارلیمین اعظم نے اپنے شمالی حدود کو بڑھا لیا تھا۔ اور بجائے رائن کے اس کی سلطنت کی شمالی حد دریائے الب اور ایڈر۔ مقرر ہو گئی تھی۔ ڈینوب و الب کے پرے تاحال خانہ بدوش قومیں آباد تھیں۔ مگر یہ قومیں جرمنی الاصل نہ تھیں بلکہ یہ قوم سلیو اور قوم نارمن کی مختلف شاخیں تھیں جو مختلف مقامات پر حسب ذیل ڈیرے ڈالے پڑی تھیں۔

(۱) قوم سرب اور بلغاری اُن مقامات پر آباد ہو گئے تھے۔ جہاں اب سرویا اور بلغاریا کی ریاستیں قائم ہیں۔ چونکہ یہ ملک سلطنت رومہ مشرقی یعنے سلطنت قسطنطنیہ کے ماتحت تھے۔ اور یہاں کے لوگ مہذب تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے بھی مہذبوں کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ اور خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک حد تک شہروں میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ مگر اسکے علاوہ ذیل کی تمام قومیں تاحال خانہ بدوش تھیں۔ اور ان میں سلطنت کا تاحال کوئی ڈھنگ نہ تھا۔

(۲) دریائے نیپر اور والگا کے درمیان قوم جازر آباد تھی۔

(۳) جازر کے شمال مشرق میں قوم سفید بلغاری۔ بشکر وغیرہ آباد تھیں۔

(۴) بحیرہ اسود کے کنارے دریائے نیپر و ڈینوب کے درمیان قوم مدجار (مغ) آباد تھی۔ یہ قوم اب ملک ہنگری میں آباد ہے۔

(۵) آسٹریا و ہنگری میں قوم آوار رہتی تھی۔

جاگیرداروں کی زمین جنکے کاشتکار جاگیرداروں کی فوج ہوتے۔ اراضیات نزول اسقدر تو ہوتی تھیں کہ فرداً فرداً ہر جاگیردار پہ بادشاہ کا پلڑا بھاری رہے۔ مگر اُن کی یہ وسعت تھی کہ مشکل تھا کہ اگر دو چار جاگیردار مل کر بادشاہ کے مقابلہ میں آجائیں تو بادشاہ اُنکا مقابلہ کر سکے۔ اور ان جاگیرداروں نے بھی اپنے ذاتی اغراض کو حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں کے خلاف جتھے کرنے شروع کر دیئے۔ اِس طرح پر ان جاگیرداروں سے بادشاہوں کی کور دبنے لگی۔ اور بادشاہ مجبوراً انکا کہنا ماننے لگے۔ ان جاگیرداروں نے یہانتک طاقت حاصل کر لی کہ جب شارلیمین اعظم کا پڑپوتا چارلس جسیم قیصر ہوا تو جاگیرداروں نے بھرے دربار میں اس سے یہ کہلوالیا کہ میں کسی موروثی حق کے باعث نہیں بلکہ محض اُمرا کے منتخب کرنے کے باعث بادشاہ ہوا ہوں۔

دل میں گھربار کے پیکان کئے بیٹھے ہیں
مجھ پہ قبضہ میرے مہمان کئے بیٹھے ہیں

غرض یہ جاگیردار جنہیں بادشاہوں نے جاگیریں عطا کر کے امیر بنایا تھا ایسے مقتدر ہوگئے کہ بادشاہ تخت سلطنت کے لئے انکے دست نگر ہونے لگے اس طرح پر اہل یورپ کی اس رائے کی ابتدا ہوئی کہ بادشاہ محض قوم کی رضا سے بادشاہ ہوتا ہے۔

ایک تو یہ جاگیردار اس طرح پر بڑے قوی ہوگئے۔ دوم ان میں سے بہتوں کے شاہی خاندان سے رشتے ناطے بھی تھے۔ اور بہت سے شاہی خاندان کے لوگ بھی گھٹ گھٹا کر محض جاگیردار رہ گئے تھے۔ جاگیرداروں میں سے وُہ لوگ عموماً زیادہ قوی ہوتے تھے جنکی بادشاہ سے قرابت ہوا کرتی تھی۔ ایک تو جاگیرداروں کا گھن سلطنت کو ایسا لگ گیا تھا کہ بادشاہ دن بدن کمزور ہوئے جاتے تھے۔ اور سلطنت کی یک جہتی بالکل معدوم ہوگئی تھی۔ کسی بیرونی دشمن کے مقابلہ میں سلطنت کی تمام طاقت کا خرچ کرنا محال ہوگیا تھا۔

(۱) اہل نارمن نے ملک سویڈن - ناروے - ڈنمارک - تینوں کو آباد کیا - اور تینوں ملکوں کی ایک سلطنت قائم کی - ورنہ دسویں صدی عیسوی سے پہلے یہ خانہ بدوش تھے - اور اپنے بیڑوں میں بیٹھ کر - فرانس - ہالینڈ - بلجیم - انگلینڈ - ہسپانیہ - اٹلی - کے ساحل بحر پر لوٹ مار کرنے کو آیا کرتے تھے - غرض اُنکا سب سے پہلا مشہور بادشاہ اولاف ہوا - جس نے ۹۶۳ء سے ۱۰۰۰ء تک سلطنت کی ہے -

(۲) سلطنت پولینڈ قائم ہوئی - اسکا پہلا مشہور بادشاہ بولس لاس تھا جس نے ۹۹۱ء سے ۱۰۲۵ء تک سلطنت کی ہے - یہ سلطنت اب معدوم ہو چکی ہے اور اس کا ملک سلطنت رُوس و جرمنی نے باہم تقسیم کر لیا ہے -

(۳) قوم نارمن (جسے ڈین بھی کہتے ہیں) کا ایک لوٹیرا ردبرک اپنے ساتھیوں سمیت ۹۶۲ء میں شہر نوو گورڈ واقعہ ملک رُوس میں آکر آباد ہو گیا - اور وہیں کا ہو رہا - جہاں اسے سرداری مل گئی - اور اس طرح یہ موجودہ سلطنت رُوس کی بنیاد پڑی -

(۴) اسی زمانہ میں سلطنت پرشیا کی بُنیاد پڑی -

یہ سب قومیں زمانہ کے اثر سے مجبور ہو کر آباد ہو گئی تھیں - اور مہذب لوگوں کی طرح انہوں نے بھی شہر آباد کرنے شروع کر دیئے تھے - مگر چونکہ انکو کسی مہذب قوم سے صحبت نہیں رہی تھی - یہی وجہ ہو کہ انکی تہذیب تاحال اوپری ہے - اور ان کی وحشت پورے طور پر نہیں گئی -

یہ شمالی یورپ کا جھگڑا تو ایک جملہ معترضہ تھا - اب ہم پھر سلطنت فرینک کا قصہ شروع کرتے ہیں -

چارلس سیم کے وقت میں سلطنت کا رُعب و داب تو اس حد تک گھٹا کہ امرا و جاگیر دار بادشاہ کو خیال تلے نہ لاتے تھے - ہر جاگیردار اپنی ریاست میں خود مختار بادشاہ کا حکم رکھتا تھا - اور اس طرح پر سلطنت کی مجموعی طاقت پریشان ہو گئی تھی اور اُدھر یہ مصیبت آئی -

(۶) ۴ و ۵ کے شمال جرمنی میں اقوام سلیونک آباد تھیں۔

(۷) ۶ کے مشرق اور بوہیمیا کے شمال میں قوم سرب اور ولٹز آباد تھیں۔

(۸) بحیرہ بالٹک کے کنارے قوم ونڈ آباد تھی۔

(۹) ملک ناروے میں قوم نارمن آباد تھی۔

نمبر ۲ سے نمبر ۹ تک کل اقوام شارلیمین اعظم کے زمانہ تک خانہ بدوش تھیں۔ ان میں سے صرف قوم نارمن نے تاخت و تاراج شروع کی اور آئندہ یورپ کی تاریخ میں صرف اسی قوم کا دکھڑا رونا ہے۔ اور باقی سلیو شاخ کی جسقدر قومیں مذکور ہوئی ہیں۔ انہوں نے دسویں صدی عیسوی تک بہت تھوڑی نقل و حرکت کی۔ اور چونکہ انکے بعد وسط ایشیا سے اور قوموں کا ریلا نہیں آیا۔ اس لئے یہ اس بات پر مجبور نہیں ہوئے کہ جرمنی الاصل اقوام کی سلطنت (یعنے سلطنت فرینک واقعہ فرانس و جرمنی یا سلطنت وسی گاتھ واقعہ سپانیہ۔ سلطنت لمبارڈ واقعہ اٹلی) پر حملہ کریں جس طرح جرمنی الاصل اقوام نے مجبور ہو کر سلطنت روما کا رخ کر دیا تھا۔ بلکہ یہ سلیو اقوام اپنے اپنے مقامات پر دسویں صدی عیسوی تک ٹکی رہیں۔ باہم ضرور انکی جنگیں ہوتی ہونگی۔ مگر مہذب اقوام کو ان سے واسطہ نہیں پڑا۔ آخر زمانہ نے انکو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ اور ان خانہ بدوشوں نے خود بخود مستقل رہائش شروع کی۔ بتدریج گانوں بسنے شروع ہوئے۔ جب گانوں بسنے لگے تو ہر گانوں کا ایک سردار بھی مقرر ہونے لگا۔ اور جس طرح وحشیوں کی عادت ہے۔ ایک گانوں کے لوگ لوٹ مار کی ہوس میں اردگرد کے گانو پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔ جب کبھی ایک گانو والوں نے اردگرد کے دو چار گانوں کو زیر کر لیا تو غالب گانو کا سردار چار پانچ گانوں کا سردار ہو گیا۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے بادشاہ بننے لگے۔ الغرض دسویں صدی عیسوی میں شمالی یوروپ میں مفصلہ ذیل ریاستیں قائم ہوئیں جنمیں سے کچھ بڑھ کر اب سلطنتیں بن گئی ہیں اور کچھ نابود ہو گئی ہیں۔

نامزد کیا جائے۔ یُوں ملک فرانس کی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اور یہ ملک سلطنت فرینک سے بالکل جُدا ہو گیا۔ اوڈو نے ۸۸۸ء سے ۸۹۹ء تک سلطنت کی۔ مگر بائی خاندان اوڈو کے بھائی کے پوتے ہف کپٹ کو سمجھا جاتا ہے۔ جس نے ۹۸۷ء سے ۹۹۶ء تک سلطنت کی ہے۔

مشرقی حصہ سلطنت فرینک (یعنی جرمنی۔ آسٹریا۔ اٹلی شمالی) میں مفصلہ ذیل امرا بڑے بااقتدار ہو گئے تھے۔ کیونکہ شاہی خاندان سے اُنہیں قرابت بھی تھی۔

(۱) شمال میں اوٹو اوف سکسنی۔

(۲) کوہ ایلپس کے شمال میں ریاست الیمانیہ۔

(۳) نمبر ۱ و ۲ کے درمیان ریاست فرینکونیا۔ جس کا رئیس کون راڈ تھا۔ شارلیمین اعظم کے مرنے پر حسبِ دستور اس کی سلطنت تقسیم ہوئی تو جرمنی کی ریاستیں شارلیمین کے پوتے لوئی جرمن کے حصہ میں آئی تھیں۔ جب اس کی اولاد کا خاتمہ ۹۱۱ء میں ہو گیا۔ تو جرمنی کے امرائے کون راڈ مذکور کو بادشاہ نامزد کیا۔ جس نے ۹۱۱ء سے ۹۱۸ء تک سلطنت کی۔ اس کی مرگ پر اُنہوں نے اوٹو مذکور کے بیٹے ہنری اوف سکسنی کو بادشاہ مقرر کیا اس نے ۹۱۸ء سے ۹۳۶ء تک سلطنت کی۔ اس کے ماتحت سوائے پرشیا کے آسٹریا اور جرمنی کی کل ریاستیں تھیں۔ مگر اٹلی کا شمالی حصہ جسکے باعث قیصر کا خطاب ملتا تھا اُن کے قبضہ میں نہ تھا اسی لئے یہ قیصر نہیں کہلایا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے اوٹو اول نے اٹلی کے شمالی حصہ کو پھر فتح کیا اور قیصر کہلایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جرمنی و آسٹریا کے شہنشاہ قیصر کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد جرمنی کی سلطنت مُدتوں تک اسی صورت میں قائم رہی۔ مگر ۱۸۰۶ء میں نپولین نے جرمنی کی سلطنت کا شیرازہ بگاڑ دیا۔ اس کے بعد جرمنی کی کل ریاستیں باہم متحد رہیں۔ زیادہ اقتدار خاندان آسٹریا کو حاصل رہا۔ ۱۸۶۶ء میں ریاست پرشیا نے بڑی قوت حاصل کر لی۔ خاندان آسٹریا کو شکست دیکر اتحادِ جرمنی سے خارج کر دیا اور جرمنی

کہ قوم نارمن نے سلطنت پر حملے شروع کئے۔ پہلے وُہ ساحل بحر کے شہروں کو لُوٹ کر لے گئے۔ پھر آئے تو دریاؤں کے راستے ملک کے اندر بھی گھُس آئے۔ اور اندرونی لب دریا کے شہروں کو بھی لوٹا۔ اِس طرح پر ملک کا کوئی حصّہ انکی تاراج سے محفوظ نہ رہا۔ موجُودہ فرانس کا ہر حصہ ان ظالموں نے خون سے لال کر دیا۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ مجھ میں ان لوگوں کو دفعہ کرنے کی طاقت نہیں تو اُس نے ایک شخص موسُوم بہ رابرٹ کو پیرس کا علاقہ دیا اور اُسے وہاں کا ڈیوک بنایا۔ یہ شخص بڑا بہادر اور لڑاکا تھا اُس نے اہل نارمن سے پیرس کو بچانے میں بڑی بہادری دکھائی۔ مگر یہ نارمن تو بلائے آسمانی تھے۔ سارا ملک ان سے کون بچا سکتا تھا۔ آخر اسی قوم کے ایک شخص رولو کو ایک علاقہ دیا گیا۔ تاکہ وُہ اپنی قوم ہاں آباد کرے۔ اور آہن بہ آہن توان کرد نرم کے مصداق اِسی قوم سے باقی نارمن لوٹیروں کو نیچا دکھایا جائے۔ اس طرح پر رولو ڈیوک اوف نارمنڈی مقرر ہوا۔ یوں بتدریج ملک فرانس میں امرائے ذیل بڑے طاقت ور ہو گئے۔

(۱) رولو ڈیوک اوف نارمنڈی۔ جس شخص کی اولاد میں سے ایک شخص ولیم نے انگلستان فتح کیا تھا۔

(۲) رابرٹ ڈیوک اوف پیرس۔

(۳) باسو ڈیوک اوف برگنڈی اور پراونس۔ یہ شخص تو ایک حساب خود مختار ہی ہو گیا تھا اور کچھ عرصہ تک اُس کی اولاد نے سلطنت بھی کی۔

(۴) کونٹ اوف فلینڈرز۔

یہ امرا تو ملک فرانس میں ہو گئے۔ طاقتور۔ اُدھر بادشاہ کمزور ہو گیا۔ اور اُس کے جانشین اور بھی نکمے نکلے۔ امرا نے انتخاب شاہ کی رسم توڈال ہی دی تھی۔ اب فرانس کے امرا نے باہم مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ رابرٹ ڈیوک اوف پیرس بہادر آدمی ہے۔ اِس میں سکت ہو کہ اہل نارمن کا مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اس کے لڑکے اوڈو کو ملک فرانس کا بادشاہ

سلطنت کی۔

جب روم تباہ ہوا تھا۔ تو اٹلی کا شمالی حصہ اکثر شاہان جرمنی کے زیر نگین رہتا۔ مغربی حصہ پر پوپ رومہ حکومت کیا کرتا اور اہل فرانس اس کے ممد رہا کرتے۔ باقی کل اٹلی میں قوم لمبارڈو کی نسل کے امرا جابجا خود مختار تھے۔ ان میں سے مشہور ریاستیں یہ تھیں ٹسکنی۔ پارما موڈینا۔ نیپلز۔ اور کچھ حصہ اٹلی کا (جسے سوائے کہتے تھے) جزیرہ سارڈینیا کے ماتحت تھا۔ ۱۸۴۸ء میں شاہ سارڈینیا نے ارادہ کیا کہ اپنے ہمسایہ اہل آسٹریا کو اٹلی میں سے نکال دے۔ وہ خود تو ناکام رہا۔ مگر اُس کے لڑکے وکٹر امینول نے اپنا مقبوضہ سوائے فرانس کے حوالے کر کے انکی مدد سے اہل اسٹریا کو اٹلی سے نکال کر اُس کے شمالی حصہ (لمبارڈی) پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۰ء میں ٹسکنی۔ پارما۔ موڈینا اور ریاست پوپ خود بخود سلطنت لمبارڈی کے ساتھ شریک ہو گئی۔ اور ریاست نیپلز اور جزیرہ سسلی بزور شمشیر فتح کیا گیا۔ یوں سلطنت اٹلی نے وہ صورت اختیار کی جو اس وقت دیکھی جاتی ہے۔

ملک ہسپانیہ کی نسبت پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سلطنت روما سے قوم ونڈال نے یہ ملک چھینا۔ قوم ونڈال سے قوم وسی گاتھ نے۔ قوم وسی گاتھ کا دارالسلطنت شہر ٹولوسی تھا۔ اسی خاندان کے پاس ۷۱۰ء تک ہسپانیہ کی سلطنت رہی ۷۱۱ء میں اہل عرب نے ہسپانیہ پر قبضہ پایا اور ۱۴۹۱ء تک وہاں قابض رہے۔

جن دنوں میں مسلمان ہسپانیہ پر قابض تھے تو اُس کے شمالی پہاڑی اضلاع میں حسب ذیل ریاستیں قائم ہوئیں۔

(۱) آسٹوریاس ۷۱۸ء میں قائم ہوئی۔

(۲) اویڈو ۷۳۰ء میں قائم ہوئی۔

(۳) لیون ۹۱۴ء میں قائم ہوئی۔

(۴) نیوریہ ۹۰۵ء میں قائم ہوئی۔

کے نقشہ نے وُہ صُورت اختیار کی جو آجکل ہے۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں شاہ پرشیا نسلاً بعد نسلاً قیصر جرمنی مقرر ہُوا۔

آسٹریا کے بادشاہ کے پاس چونکہ اٹلی کا شمالی حصہ تھا اس لئے وُہ قیصر آسٹریا کہلاتا۔ شاہ اسٹریا نے سنہ ۱۵۲۶ء میں مُلک ہنگری کو بھی جسمیں تا حال علیحدہ سلطنت تھی اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ مگر سنہ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کو مجبوراً اٹلی کے شمالی حصص پر سے اپنی سلطنت اٹھانی پڑی۔ اس طرح سلطنت آسٹریا و ہنگری کی وُہ صُورت پیدا ہوئی جو اسوقت دیکھنے میں آتی ہے۔

ناظرین! ہم نے آپ کو تاریخ کے اس حصہ پر سے گذار دیا ہے جب یُورپ میں خانہ بدوش قوموں نے ایک اندھا دُھند مچا رکھی تھی۔ اور تاریخ یُورپ میں آئے دن ایک حملہ آور قوم کا نام آجاتا ہے۔ جس کا نام اور حال پہلے معلوم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یُورپ کی تاریخ کے قرون وسطیٰ کے آغاز کا حال پڑھتے ہوئے طبیعت سخت پریشان ہوتی ہے۔

ہنگری آسٹریا۔ جرمنی۔ فرانس۔ پولینڈ۔ روس۔ کی سلطنتوں کا حال تو مختصراً زمانہ حال تک پہنچا دیا گیا ہے۔ گو اس مضمون کو صرف قرون وسطیٰ کی ابتدائی زمانہ سے تعلق ہے۔ لیکن اگر بات کو ختم کر دیا جائے تو ناظر کو ایک گونہ تسکین ہوجاتی ہے۔ گو اسی امر کو حسب موقعہ دوبارہ شروع کرنا پڑے۔ اس لئے ہیں نہایت مختصر طور پر اٹلی و ہسپانیہ کی تاریخ کا بھی خاتمہ کئے دیتا ہوں اگر توفیق رفیق ہوئی تو پھر کبھی سارے یُورپ کی تاریخ کا خاکہ انشاء اللہ تعالیٰ مکمل کر دونگا۔ اور جو کچھ اب باقی رہگیا ہے اسے بھی ناظرین مخزن کے سامنے پیش کر دونگا۔

اٹلی میں پہلے خانہ بدوش قوم آسکن آباد تھی۔ اس کے بعد قوم پلاسجی نے وہاں جا کر طرح اقامت ڈالی۔ انکے بعد قوم اٹروری بھی وہاں پہنچی۔ آخر الذکر قوم بہت مہذب تھی اس نے شہر بسائے اور مُلک میں تجارت شروع کی۔ جب مُلک میں امن ہوگیا تو قوم پلاسجی جس نے پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ وُہ بھی شہروں میں آنے لگے۔ ان دونوں قوموں کے خلط ملط ہونے سے وُہ قوم پیدا ہُوئی جو بعد میں رومن کہلائی۔ اور جس نے دُنیا کے بڑے حصہ پر

اُمّید

دیکھ اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دے کے اک سہارا

اُمّید کیا پیارا لفظ ہے۔ کیسا پُر تاثیر نسخہ ہے۔ رنج ہو یا حرمان۔ مصیبت ہو یا ناکامیابی۔ درد ہو یا الم۔ اندوہ ہو یا غم۔ سب پر غالب ہے۔ روزِ بد میں اس کی رفاقت موسم سرما میں آفتاب کی تموزت ہے۔ شبِ غم میں اس کی غمگساری ریگستان میں دریا کی روانی ہے۔ اس نے کہیں جادو کے کرشمے دکھلائے کہیں دُعا کے معجزے نمایاں کئے۔ کبھی مشکل سے مشکل مہم سر کی۔ کبھی اہم سے اہم معمّا حل کیا۔ یہی ہے جس نے باوجود متواتر ناکامیابیوں کے پلینی کو جادۂ استقلال پر ثابت قدم رکھا اور آخر الامر گوہرِ مطلوب سے مالامال کیا۔ یہی وہ چھلاوا ہے جس نے کلیمؑ کی طور کیطرف ہدایت کی اور مقصودِ آتش کے عوض جلوۂ خدا اور نبوت سے بہرہ ور کیا۔ یہی وہ ستارا ہے جو سمندروں میں کولمبس کا راہ نما رہا۔ یہ تو زمانہ سلف کی سُنی سُنائی باتیں ہیں۔ ہر صبح و مسا اُمّید کی بڑی بڑی خوبیاں آپ بچشمِ خود دیکھتے ہونگے۔ بیمار صاحبِ فراش بنا ہوا ہے۔ دم لبوں پر ہے۔ ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ملک الموت کا ہاتھ صاف نظر آرہا ہے۔ مگر اُمّیدِ زندگی ہنوز منقطع نہیں۔ دواؤں پر دوائیں پلائی جاتی ہیں۔ تدبیروں پر تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کہ شاید سنبھل جائے۔ چارہ کارگر ہو۔ سانس پلٹ آئے۔ عاشقِ بیقرار بسترِ غم پہ پڑا یادِ جاناں میں تڑپ رہا ہے۔ سر دُھنتا ہو۔ کلیجہ تھام کر آہیں مارتا ہے۔ خودکشی کی ٹھان کر خنجر اُٹھا لیتا ہے مگر جگر میں نہیں چبھوتا۔ ممکن ہو کہ دن پھریں اور محبوب مہربان ہو۔ بھٹکا ہوا مسافر جنگل اور کوہستان میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ تلوے زخموں سے چھلنی بن گئے ہیں۔ چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ حواس باختہ

(۵) اراگون کیسٹیل سنہ ۱۰۳۵ء میں قائم ہوئیں۔ آخر الذکر دونوں سلطنتوں میں سنہ ۱۴۹۱ء میں ایک پر عورت اور دوسری پر مرد حکمران تھا۔ ان دونوں نے باہم شادی کرلی۔ اس سے انہیں قوت حاصل ہوگئی۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکال موجودہ ہسپانیہ کی بنیاد رکھی +

غلام نقشبند

نئی خالق باری ۔ ماسٹر جلال الدین صاحب مراد آبادی نے سہولت متعلمین زبان انگریزی کے لیے ایک نئے ڈھنگ کی خالق باری تصنیف کی ہے جس کا نام انہوں نے اینگلو اورنٹل خالق باری رکھا ہے۔ انگریزی الفاظ کے ساتھ ساتھ انکے اردو مرادف اُسی ترکیب سے اشعار میں درج کئے گئے ہیں۔ جو پرانے مکتبوں کی "خالق باری" میں فارسی اور اردو کے متعلق ملحوظ رکھی گئی تھی۔ البتہ یہ جدت ہے۔ کہ "خالق باری" تو ایک ہی بحر میں لکھی گئی تھی۔ مگر یہاں مختلف بحر اور مختلف اوزان مختلف بابوں کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔ اور اس امر کا التزام کیا گیا ہے۔ کہ وہ اوزان انتخاب کئے جائیں جو آج کل خصوصیت سے مقبول ہیں۔ یہاں تک تو ماسٹر صاحب موصوف کی جدت پسندی قابل داد ہے اور عروض پر انکے قابو کا پتہ ملتا ہے۔ مگر ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کا اس سے بہتر مصرف کیوں نہ تلاش کیا اور تقلید کے لئے پرانی درسی کتابوں میں سے ہی اگر کسی کو لینا تھا تو "خالق باری" کو کیوں ڈھونڈھا۔ فارسی سیکھنے کے لیے ہی وہ کونسا ایسا اچھا ذریعہ ہے کہ اب انگریزی اس سے حاصل ہو جائیگی۔ اور انگریزی میں تو یہ دقت مزید برآں ہے کہ تلفظ اردو تحریر میں کبھی ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ گو ماسٹر صاحب نے نیچے انگریزی حروف میں وہی لفظ لکھدئے ہیں اور لفظ درست ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر بے سود ہے۔ اب بھی بہت مقامات ایسے ہیں کہ وہاں انگریزی تلفظ صریح غلطی میں ڈالنے والا ہے۔ ہماری رائے میں ہندیوں کے ہاتھ میں اس کتاب کا دینا مضر اور انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں تک اس کا پہنچانا غیر ضروری ہے۔ البتہ جدت پسند طبائع کے لئے اس میں دلچسپی ہے کہ مشکل الفاظ کو مع انکے معانی کے نظم کے قوافی اور ردیف کی قید کے ساتھ کس مشاقی سے منظوم کیا گیا ہے +

کیونکہ ہر شخص جو کچھ کرتا ہے اپنے آئندہ فائدہ کے خیال سے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مقصد مترقبہ
کسی طرح حاصل نہیں ہونیکا۔ یقین ہے کہ وہ اسی دم کل سعی و کوشش یکقلم ترک کر دے۔ اس لئے کہ
حالت ناامیدی میں جد و جہد کرنا بڑی نادانی اور سراسر ابلہی ہے۔ ممکن نہیں کہ امید نہ ہو اور
ترقی کی جائے۔ تیمور۔ نپولین اور کرامول جنکی شہرت اب تک دنیا میں موجود ہے۔ جن کے
نقشے جابجا [illegible] رہے ہیں۔ ہرگز اپنے آپ کو بلند ترین مراتب پر پہونچانے کی
کوشش نہ کرتے اگر انہیں امید نہ ہوتی کہ ان کی جانفشانی اور پریشانی رائگاں نہیں جائیگی۔ یہ لوگ
اگرچہ [illegible] دنیا سے کچھ کر نہ سکتے تھے مگر حوصلہ بلند رکھتے تھے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج بنی آدم
ان پر افتخار کرتی ہے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ امید جسقدر بالا ہوگی انسان اسی قدر حصول مطلب کے
لئے جد و جہد کریگا اور اتنا ہی عالی مرتبہ و بلند پایہ ہوگا۔ مگر واضح رہے کہ بلند حوصلگی کے بھی دو
درجے ہیں۔ اول وہ جس کا پورا ہونا ممکنات میں سے ہے۔ دوم وہ جسکو ڈھکوسلا یا خیال فاسد
کہتے ہیں۔ قسم اولیٰ سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ قسم ثانی سے جز رنج و افسوس کچھ نہیں ملیگا۔
اول تو وہ فرقہ ہے جس کی امیدیں اس کی حیثیت اور امکان کے دائرہ سے باہر نہیں ایسے
لوگوں کی زندگی خوشی اور کامیابی کے ساتھ گذرتی ہے اور انہیں کے سر بڑائی اور عظمت کا
سہرا رہتا ہے۔ اور بد تر وہ گروہ ہے جو جھونپڑوں میں رہ کر محل کا خواب دیکھا کرے یا
ان تخیلات و خواہشوں کا عادی ہو جن کا پورا کرنا اس کی لیاقت سے ایسا ہی بعید ہے
جیسا کسی ادنے طایر کا سیمرغ سے نبرد آزمائی کا دعویٰ کرنا داخل حماقت ہے۔ پہلے تو منزل
مقصود کا راستہ ملنا ہی دشوار ہے دوسرے راستہ ملجانے پر بھی ان لوگوں کا وہاں تک پہنچ
جانا بعید از قیاس ہے۔ کیونکہ یہ اس قدر دشوار گذار اور پر پیچ ہے کہ تھوڑی دور چل کر
کم ہمت کا جی چھوٹ جائیگا۔ پاؤں میں چھالے پڑ جائینگے طاقت رفتار زائل ہو جائیگی اور
نتیجہ یہی ہوگا کہ ع : خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے ہوئے۔ جیسے بیجا
امیدوں کے نتائج خراب ہوتے ہیں ویسے ہی مایوسی کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ مرد کو

ہیں۔ پاؤں چلنے سے عاری ہو چکے ہیں۔ مگر ہمت نہیں ہارتا اُفتاں وخیزاں چلا ہی جاتا ہے۔ نہ راہ ملتی ہے نہ منزل مقصود کا پتہ چلتا ہے۔ نہ کوئی ہادی ہے نہ رہنما ہے مگر اُسکے پاؤں ہیں کہ آگے ہی پڑتے ہیں۔ لوٹنے کا نام تک نہیں لیتے۔ کیونکہ اُمید ہو کہ خدا مدد کرے اور محنت کارآمد ہو۔ اِن ہی تین تمثیلوں پر کیا حصر ہے۔ ہمارا کوئی کام ایسا نہیں جس میں اُمید کی بُو نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ دُنیا اُمید پہ قائم ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے کل کاروبار رُک جائیں۔ زندگی محال ہو جائے۔ برابر ایسے ایسے جانگزا سانحے پیش آتے ہیں اور ایسی ایسی رُوح فرسا تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا کرتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان کے تاب و تواں سے اُن کی برداشت کوسوں بعید ہو۔ ہرگز ممکن نہیں کہ یہ زار و نحیف اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا متحمل ہو سکے اگر بُرے وقتوں میں اُمید کی دلاویز صُورت اس کی تشفی و تسلی کو سامنے آکر نہ کھڑی ہو یا اُسے یہ بھروسا نہ ہو کہ آج نوحہ ماتم ہے تو کل نغمہ شادی بھی ضرور ہے۔ بیشک قسام ازل نے انسان کے حصہ میں جہاں طرح طرح کے صدمے لکھے وہاں ایک اُمید بھی لُطفِ خسروانہ سے عطا فرمائی تاکہ یہ ہر حال میں اپنی قسمت پر قانع رہے اور زندگی کا لُطف اُٹھا سکے۔ اگر وُہ حکیم اپنی اِس زبردست دانائی سے کام نہ لیتا اور انسان کو اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کا وعدہ نہ دیتا تو اس دُنیا کا قیام مشکل ہو جاتا کیونکہ دُنیا کا قیام انسان سے ہے اور انسان اپنی فطرت کے تقاضے سے ایک حالت میں نہیں بسر کر سکتا۔ جب تک رات کے بعد دن نہ نصیب ہو یا غم کے بعد خوشی کی نہ اُمید ہو۔ زندگی بدمزہ اور تلخ ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

نظرِ غور سے دیکھا جائے تو ہماری کُل ترقیاں اور کامیابیاں اُمید ہی پر مبنی ہیں۔ اُمید ایسی ضرورت ہی جسکے غیبت میں ہم کسی کام کی انجام دہی کی کوشش نہ کریں۔ طلبا مدارس و مکاتب کا جانا چھوڑ دیں۔ کسان جوتنے بونے سے سروکار نہ رکھے۔ تجار خرید و فروخت اموال سے مُنہ موڑ لیں۔ درحقیقت کسی حرفہ یا پیشہ کا نام لیوا بھی نظر تک نہ آئے

سیّد محمد کاظم حبیب

سید محمد کاظم صاحب المتخلص بہ حبیب کنتوری یادگارِ خاندانِ شیخ ناسخ مرحوم شعرائے زمانۂ حال
کے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ حال میں اُن کا دیوان مطبع شمسی حیدرآباد دکن میں
شائع ہوا ہے۔ اور اتنا اندازہ تو اُس پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ کہ کہنہ مشق اُستاد
ہیں۔ اور خداداد قوتِ سخن کے زور سے لکھ رہے ہیں۔ کلام میں آمد زیادہ ہے اور آمد دیکھ
کر یہ معلوم کر کے کہ سید حبیب کنتوری ایک ایسے خاندان سے ہیں جو علما کا خاندان ہے اور وہ
بھی ذی علم آدمی ہیں۔ اُنکے کلام کی ایک وقعتِ خاص دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ذی علم
آدمی عموماً اپنے ہر کام کے لئے کوئی انجام اور مقصود قرار دیتا ہے۔ اگر وہ ذوقِ شعر رکھتا ہو۔ تو
شعرگوئی اور سخنوری سے محض اپنی فطرت کے ایک پُرزور تقاضے کو ہی پورا نہیں کرتا بلکہ چاہتا
ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرے۔ اور اُنکو مقبول پیرایہ میں اخلاق
مذہبی یا علمی مسائل اور نکات سمجھا دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد کاظم صاحب کے دل میں
یہ ایک عرصہ سے موجود ہے۔ کہ اُنکی شاعری وہ شاعری نہ ہو جس پر فعل عبث کا فتویٰ
دیا جا سکے یا جس سے بعض شائقین سخن کی فوری تفریحِ طبع سے بڑھ کر کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو
اس خیال کا اُنکے دل میں جاگزین ہونا خصوصیت سے قابلِ داد ہے۔ کیونکہ یہ خیال
ہندوستان کی دُنیائے شاعری میں ایک زمانہ سے کمیاب ہے۔ اور دہلی اور لکھنؤ کی صحبتیں
اس شوق سے اتنی ہی دُور ہیں۔ جتنا چین انگلستان سے۔ لکھنؤ کی صحبتوں میں حبیب کنتوری
تحصیلِ فن کے لئے رہنے کا موقعہ ہوا ہے۔ اُن میں سے نکل کر اُن کی جانب سے
کوشش شروع ہوئی کہ اُردو زبان میں غزل کا رنگ بدل دیا جاوے اور غزل سے وہ کام لیا جائے
جو صوفیا اپنے صوفیانہ کلام سے تہذیبِ اخلاق کے متعلق لیتے رہے ہیں۔ اور جو مصلحانِ قوم

نامرد کر دینا۔ محنتی کو اپاہج بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جس نے نا اُمیدی کو راہ دیا یقیناً اوسنے سے اونے کام کرنا اس کے لئے پہاڑ ہو گیا۔ سب سے بہتر اعتدال ہے۔ نہ اُمید کی افراط اچھی ہے نہ تفریط۔ اِن دونو کے بین بین ایک رستہ نکلتا ہے اور وہی صراط مُستقیم ہے +

محمد شہاب الدین خان

نسیم دکن ۔ یوں تو دکن ایک عرصہ سے قدر سخن کے لئے مشہور چلا آتا ہے۔ مگر حال میں دہلی اور لکھنؤ میں علمی جرچا کی کمی سے حیدر آباد ہی علم و فن کا مرجع بنا ہوا ہے۔ اور اچھے اچھے نکتہ دان فن وہاں آ کر جمع ہیں۔ عاشقانہ شاعری۔ گو زمانہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑا ہوا ہے۔ پھر بھی دکن میں خاص رونق پر ہے۔ حضرت داغ مدظلہ العالی کے تلامذہ ہی وہاں اس کے زندہ رکھنے کے کافی ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہندو مسلمان رؤسا سب اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور تو اور خود موجودہ مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد صاحب بہادر شوق شعر میں سرشار ہیں اور انہیں اعلیٰحضرت کے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ اس لئے تعجب نہیں ہونا چاہئے اگر وہاں اس قدر کے متعدد گلدستے نکلیں۔ وہاں کے اس شوق کا تازہ ترین نمونہ رسالہ نسیم دکن ہے۔ جو منشی نادر علی صاحب برتر کے اہتمام سے بسرپرستی راجہ رائے رایان بہادر امانت ونت آصفجاہی ۵ جنوری سے چھپنا شروع ہوا ہے۔ اگر پہلے پرچہ سے اندازہ لگائیں تو غزلیات کے دلدادوں کے لئے خاص دلچسپی کی چیز ہوگی۔ جنوری کے پرچہ میں عالیجناب مدار المہام صاحب بہادر۔ سید علی احسن مارہروی۔ سید کاظم حبیب کنتوری۔ آغا شاعر دہلوی۔ امراؤ مرزا دہلوی۔ اور نواب یار الملک کی غزلیں قابل تذکرہ ہیں۔ صاحب مہتمم نے زمانہ کے خیال سے اس گلدستہ کے ساتھ آٹھ صفحہ مضامین کے لئے اور آٹھ صفحہ ناول کے لئے بھی لگا دئے ہیں۔ مضمون اس پرچہ میں مبادی علوم پر مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر کے قلم سے نکلا ہے اور ناول سرپرست رسالہ راجہ رایان بہادر کے شوق تحریر کا نتیجہ ہے۔ اس پر قیمت واجبی یعنی عام خریداروں کے لئے ۱۲ سالانہ مع محصول ڈاک ہے۔ اس سے اُمید ہے کہ یہ رسالہ جلد اپنے قدر دان پیدا کرے گا +

ہے۔ جہاں قوم کا نام کسی شعر میں آگیا۔ اور ہمارے نازک مزاج رئیس بگڑے ”اجی کوئی اور چھیڑ
کی چیز پڑھو۔ خدا جانے آج کل کیا مرض پھیل گیا ہے۔ جسے دیکھو۔ قوم۔ قوم پکار رہا ہے۔ سب
کو ایک حیلہ سا ہاتھ لگ گیا ہے“۔ اگر کسی شاعر نے اس سے بڑھ کر غلطی کی ہے اور غزل میں
قومی رنگ بھر دیا ہے۔ بس اُس نے تو اپنا گلا آپ کاٹ ڈالا۔ اگر شہرت پانی بھی تھی۔ تو کھو دی۔
اس خنجر ستم کے سب سے پہلے مجروح مولوی الطاف حسین صاحب حالی ہیں۔ چند سال ہوئے
اُن کا دیوان چھپا۔ بہت لوگوں نے تو نثر کا جو دیباچہ اُس کے پہلے لکھا ہوا تھا۔ اس کو
دیکھ کر ہی دیوان دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اُن کے نزدیک حالی کی غزلوں کا پڑھنا غزل گو شعرا کے
گروہ کی جانب سے تکفیر کا مستوجب ہونا تھا۔ بعض نے ورق گردانی کی اور جہاں غزل میں
کوئی مضمون دیکھے اُسے پھینک دیا۔ آج کل سب مسدس حالی کے بعد آدمی انہیں خیالات کو
غزل میں کیا پڑھا کرے۔ بس ایسے بھی نکلے جنہوں نے ذرا غائر نظر ڈالی۔ اور اس جھگڑے
تک پہنچ گئے کہ شاعر اور ناظم کا فرق جو مولینا حالی نے لکھا ہے۔ اس کے واسطے عدالت
شاعری سے کوئی تعزیر مقرر ہونی چاہئے۔ کوئی صاحب تھے کہ ”نیندیں اچاٹ دیں تیری
کہانیاں ہیں“۔ اچھا مصرعہ نہیں۔ اچاٹ کا یہ استعمال بہت بامذاق اور نفیس نہیں ہے۔ ایک
صاحب بولے۔ ”خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا“۔ باعتبار مضمون کے تو عشق کی سچی
تعریف ہے۔ مگر شخص ایک ایسا لفظ ہے کہ نثر کے لئے مخصوص ہے اور مصرعہ میں گھبرایا ہوا بیٹھا
ہے کہ میں کہاں آ پھنسا۔ ایک زمانہ آئیگا۔ کہ شاعری کے اُس رنگ کی جسے حالی نے
پیدا کیا ہے قدر کی جائیگی۔ اور اسی کے یہ عنوان ہیں کہ حبیب کنتوری جو اساتذہ لکھنؤ سے
تلمذ رکھتے ہیں اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ وہاں سے بیٹھے ہوئے حالی کو پہچانا تو یہ انہوں نے
ایک غزل لکھی ہے جس میں یہ شعر نتیجہ خیز ہے اور مقطع میں جتا دیا ہے کہ وہ اور حالی اس حقیقت
شناسی میں ہمدرد ہیں وہ لکھتے ہیں :-

عیاں ہے سنگ سے آہن کے اشتیاق کا درد   ہر ایک نوع میں موجود ہے فراق کا درد

نثر کی پرزور تقریریں اور مولینا حالی صاحب مسدس اور ترجیع بند قومی نظموں سے خالی از
تعجب نہیں۔ اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو۔ کہ اُن کو بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد
دکن سے تعلق ہے اور مدت سے وہیں رہتے ہیں۔ وہاں کی مجالس میں آتے جاتے ہیں۔
وہاں کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ وہیں کے اہل ذوق سے داد پاتے ہیں۔ اور وہیں ایک
خاصہ وسیع حلقہ اپنے شاگردوں اور مداحوں کا رکھتے ہیں۔ بلکہ حیدرآباد اس وسیع مگر
بدقسمت ملک ہند کے اُن چند بڑے شہروں میں ہے۔ جہاں اب تک رفتار زمانہ سے بہت کچھ
بے پروائی ہے۔ بے پروائی تو ایک طرف تمام بے خبری ہے۔ امرا ہیں کہ رفاہ عام کی حیثیت
کو چھوڑ کر یوں محو آرام پرستی ہیں۔ کہ گویا دنیا اُنکے لئے ہے اور وہ دنیا کے لئے۔ گویا نہ
کبھی اس سے پہلے زمانے میں انقلاب آئے ہیں۔ نہ اب آرہے ہیں۔ نہ آیندہ آئینگے۔ وہ
اگر کھٹکا ہو بھی تو بلا سے۔ کم از کم اُنکے لئے تو انقلاب پیدا ہی نہیں کئے گئے۔ جن
کی بدولت چھوٹا سا سچا شوق شاعری کا اگر کسی میں ہوا بھی تو وہ لفظی تجنیسوں تک محدود ہو گیا ہے
سخنوروں کا کلام اُنکے کان تک اگر اتفاق سے پہنچ گیا۔ تو صلہ داد کی صورت یہ ملحوظ ہے
کہ کوئی لفظی صنعتیں ایسی ہوں جو انہیں سمجھ آجائیں۔ کوئی بندش یا نسبت لفظی ایسی ہو کہ
انکے دل میں بیٹھ جائے۔ یا کوئی مضمون رنگین عشق و عاشقی یا بادہ نوشی کا ایسا ہو جو سب
حال معلوم ہو۔ فلسفی خیالات اور اخلاقی مضامین سے تو واسطہ نہیں۔ کہیں اگر سن پائیں
تو فوراً منہ پھیر کر کہہ دیں کہ کیا پھیکا۔ پھس پھسا کلام ہے۔ اسے تو مسجد میں جا کر وعظ کہئے
جس کو ضرورت ہوگی خود جا کر سن لیگا اگر خدا نے شاعر نہیں بنایا تو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ
انسان شعر ہی کہے۔ اپنا وقت ضائع اور دوسروں کا دماغ پریشان کرے۔ آئے تھے
وہاں سے متقی اور پرہیزگار۔ ناصح مشفق بن کے۔ واللہ ہم ایسے لوگوں سے سخت جلتے
ہیں۔ دو چار حاشیہ نشینوں نے ہاں میں ہاں ملائی اور چلئے فلسفی شاعر کو اپنی عرقریزی
کا صلہ مل چکا۔ اس سے بھی کم قدر ایسے حلقوں میں اس شاعری کی ہے جس کو قومی شاعری کہتے

یوں علائق میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند / پر جو دل ڈھونڈھو تو اُن کا ہے وہاں سب سے الگ
سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں / ہے کوئی بھیدی اور اُن کا رازداں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر / شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکاں سب سے الگ

یہ الگ دوکان جو اس جدید مذاق کے پسند کرنے والوں نے کھولی ہے۔ اسے کچھ عرصہ تک قبولِ عام سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور چند قدر دانوں کی قدر دانی پر قناعت کرنی ہوگی۔ لیکن وہ دن آئے گا۔ کہ یہ دکانیں غیر آباد اور بے رونق نہ رہیں گی۔ پرانے اور مشہور بازاروں سے کئی بڑے بڑے سوداگر اسی بازار کی طرف جھکینگے۔ اور جو بیان سخن کی نئی نسلیں اس بازار کی گاہک ہوں گی۔ سرِ دست تو انہیں بھی تسلی ہونی چاہیے کہ اپنی اپنی خدمت سرانجام دے کر فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ دیکھئے تو یہی اس تہذیب کے راگ کو حبیب نے گایا ہے۔ سُننے والے ابھی کہاں سے آتے ہیں:-

مہر و الفت سے ہے مآلِ تہذیب / ذکر انس سے ہے کمالِ تہذیب
ہے وہ آرائشِ حُسنِ باطن / جس کو کہتے ہیں جمالِ تہذیب
کم نہیں مردمکِ چشم سے کچھ / [illegible] انسان پہ [illegible] تہذیب
آج کل ہم میں اگر سچ پوچھو / شکل عنقا ہے مثالِ تہذیب
رُخ پہ کرتا ہے متانت پیدا / دل میں رہتے ہی خیالِ تہذیب
قوم کا اپنے نہ گھٹتا کبھو عروج / ہو نہ جب تک جو زوالِ تہذیب
جامِ جم سے ہے کہیں بڑھ کے سوا / بزمِ غفلت میں سفالِ تہذیب
زندہ قوموں کے لئے آبِ حیات / بنتا جاتا ہے زلالِ تہذیب
بدر بن جائے گا چندے یہ حبیب / حق نے چاہا تو ہلالِ تہذیب

اُن غزلوں کے سوا جن میں سوائے نصیحت آمیز رنگ کے دوسرا رنگ آنے نہیں پایا جابجا اس مجموعہ میں ایسی غزلیں ملتی ہیں۔ جن میں اکثر اشعار میں مفید خیالات کو ملحوظِ نظر رکھا گیا ہے

وہ سنگ ہے نہ ہو جس دل میں اتفاق کا درد ۔۔۔ ہمیشہ مُہلکِ اقوام ہے نفاق کا درد

نہ سمجھے گا جو ہمیشہ رہا ہے با ساماں ۔۔۔ کہے بھی گر کوئی بے ساز و بے براق کا درد

تمہیں بھی بھائیو لازم ہے اس کی چارہ گری ۔۔۔ ہمارے دل پہ بہت شاق ہے نفاق کا درد

حبیب خوب تھی طرزِ کلامِ اہلِ عرب ۔۔۔ ہوا ہے ہند میں حالی کو اس مذاق کا درد

حبیب نے اس سیدھے سادے رنگ میں غزلیں لکھی ہیں اور لطف یہ ہے کہ خوبیٔ زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ صوفیانہ۔ اخلاقی اور مذہبی رنگ رندانہ مذاق کے ساتھ ساتھ ہر استادِ فن کے ہاں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ حالی اور حبیب کے رنگ کے سخنوروں میں اور پرانے شعرا میں اس بارہ میں تمیز یہ ہے کہ وہاں رندانہ رنگ اصل مقصود ہے اور تصوف اور اخلاق کی تھوڑی سی چاشنی۔ داخلِ وضعداری۔ اور یہاں اخلاقی شاعری مدِ نظر ہے اور عاشقانہ مضامین وضع کے نباہ کا تقاضا۔ ہم چند غزلیں اور چیدہ اشعار دیوانِ حبیب سے اقتباس کر کے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ دیوان مذکور میں اخلاقی مضامین کس کثرت سے موجود ہیں۔

قیدِ تکلیف سے ہیں اہلِ طریقت آزاد ۔۔۔ غمِ دُنیا سے رکھتے ہیں طبیعت آزاد

ہم کو تنہائی و غربت سے ضرر کیا اے چرخ ۔۔۔ پا گئے روز کے جھگڑوں سے فراغت آزاد

نہیں جمتے کسی پر ہے کبھی ہو کے غبار ۔۔۔ رہتے ہیں اہلِ کرم جن کی ہے طینت آزاد

بارِ خاطر بھی کبھی ہوتے ہیں یارِ مخلص ۔۔۔ روز احباب کو دیتے نہیں زحمت آزاد

متکفل ہے خدا بارِ علائق کا حبیب ۔۔۔ خلق میں چاہئے انسان کی ہمت آزاد

اس غزل کو پڑھتے ہوئے بالکل اسی رنگ کی ایک غزل مولینا حالی کی یاد آتی ہے جس کے کچھ شعر درج کر دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ ۔۔۔ ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں سے بندشوں میں بے لگاؤ ۔۔۔ رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

تھا سبک رو توسنِ عمرِ رواں	عشق کا کل تازیانہ ہوگیا
کہتے ہیں سُن سُن کے ہاں پھر کیا ہوا	حال میرا اک فسانہ ہوگیا
تم جو آئے سب کو حیرت ہوگئی	میرا گھر آئینہ خانہ ہوگیا
دِن بہت گذرے بدلنا چاہئے	جامۂ ہستی پُرانا ہوگیا
پُوچھتے کیا ہو کہاں ہے اب حبیبؔ	مرکے بھی اُس کو زمانہ ہوگیا

تصوف کا مذاق گو اکثر اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مگر بعض اشعار میں کمال کو پہنچ گیا ہے:-

مبدا قدرت ہے حسن صورت آرائے ازل	اُس نے جب آئینہ دیکھا اک حسیں پیدا ہوا
کیا عجب باہم ہوا گر ارتباطِ جسم و رُوح	درد سے پہلے مرا قلب حزیں پیدا ہوا

غرض مختلف مذاق کے اشعار کو جو اِس دیوان میں ملتے ہیں پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک مقطع میں جو حبیبؔ نے سخن گسترانہ تعریف اپنی کی ہے۔ وہ حقیقت میں اُس کا مستحق ہے اور وُہ تعریف یہ ہے:-

دانائے فن سُنینگے تو فرمائینگے حبیبؔ
پختہ کلام ہے کسی نازک خیال کا

اِس کے سوا بالکل جدید طرز میں مسلسل مضامین نظم لکھنے میں بھی سید محمد کاظم صاحب دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ اور اس طرز کے کلام کا ایک نمونہ جو اُنہوں نے مخزن کے واسطے خاص طور پر لکھا ہے۔ آج حصۂ نظم میں درج کیا جاتا ہے۔ شائقین پڑھیں اور داد دیں۔ اُن سے اختلاف اگر ہم کو ہے تو صرف ایک بات میں اور وُہ یہ کہ شاعرانہ رقابت کے جوش میں اُنہوں نے بعض معاصرین کی طرف ایسے کھُلے اشارے حقارت آمیز کئے ہیں۔ جو پایۂ متانت سے گرے ہوئے ہیں۔ رقابت شعرا کے ہمیشہ ساتھ رہی ہے۔ اور ایشیائی شعرا میں لکھنؤ بہت کم اِس سے خالی ملینگے۔ ہندوستان میں یہ اور بھی ترقی کرگئی ہے۔ اور بعض دفعہ شعرا کی باہمی چشمک ناظرین کے لئے لطفِ خاص رکھتی ہے۔ بشرطیکہ نزاکت کے ساتھ چوٹ

پرانی باتیں

ہے شبِ ماہ میں بیٹھا ہوا اک شخص ملول — رات کہتی ہے کہ اے باغِ حوادث کے پھول

کیوں مرے چاند کے سایہ میں ہے ایسا غمگیں — تھاہ پیدا ترے دریائے تفکر کی نہیں

وہ تغیر ترے ہر چینِ جبیں سے ہے عیاں — سطحِ دریا پہ جو ہوتا ہے تلاطم کا سماں

کہہ رہی ہیں تیری گھبرائی ہوئی یہ سانسیں — دل میں اندوہ کے نشتر ہیں الم کی پھانسیں

شورِ امواج کا عالم ہے نمایاں ان سے — بحرِ جمعیتِ خاطر میں ہے طوفاں ان سے

ہوگئی کیا وہ بشاشت وہ ظرافت ہے کہاں — خندہ روئی ہے کہاں اور وہ لطافت ہے کہاں

کھو دیا کس کی نظر نے وہ ترا حسنِ مذاق — وہ ادائیں ہیں کہاں لوگ تھے جنکے مشتاق

ہوگئی کیا وہ روانی وہ طبیعت کی چہل — جس لگاوٹ پہ طرحدار بھی جاتے تھے پھسل

صحبتیں کیا ہوئیں وہ کیسی ہے یہ تنہائی — سچ بتا مجھ کو یہ حالت تجھے کیونکر بھائی

چیت اُٹھا سُنکے یہ دریائے تفکر کا غریق — بولا سُن کرنی ہے گر حال کی میرے تحقیق

ہوں میں تنہا نہیں اسوقت کوئی محرمِ راز — گرمیٔ حسرت و حرماں سے مرا دل ہے گداز

کبھی آجاتا ہے گذری ہوئی حالت کا خیال — کبھی صحبتِ عشرت کی بڑہاتی ہے ملال

آرزوئیں کبھی کر دیتی ہیں پیدا اک جوش — عالمِ یاس میں خود اُٹھتا ہے سینہ سے خروش

کبھی سمجھاتی ہے رفتارِ جہاں کی حالت — رائگاں وقت نہ کر جھیل نہ بیجا زحمت

یہ مسلم ہے کہ عالم کی ہے ہر شے گذران — عیش کی طرح گذر جائے گا کلفت کا سماں

کرلے دل سرد ہر اک چیز سے راحت ہے یہی — بھول کر بیٹھ ہر اک شے کو فراغت ہے یہی

چار دن کے لئے ہر وقت سہے کون الم — چھوٹ جائیگا جو خود اسکو نہ کیوں چھوڑ دیں ہم

فکر باقی نہیں اب کوئی جو ہونا ہے وہ ہو — مغتنم جانونگا میں ہر نفسِ ہستی کو

یکجائے۔کہیں کہیں اس قسم کے اشعار دیوان حبیب میں بھی ہیں۔ جنکے لئے خواہ مخواہ داد زبان پر آتی ہے۔مگر جہاں بہت کھلے اشارے آتے ہیں۔ وُہ صحیح مذاق کو ضرور کھٹکتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو ایسے اشعار نکال دیئے جائیں۔ کیونکہ اُن کی موجودگی سے اُس نصیحت آمیز کلام کی تاثیر میں فرق آنے کا ڈر ہے۔جس سے اُنکے دیوان کی بہت سی غزلیں مملو ہیں +

حُقّہ نوشی۔ حقّہ نوشی سے خون رقیق ہو جاتا ہے۔اور خُون کے سُرخ دانے نابُود ہو کر سفید دانوں کو ترقی ہوتی ہے۔معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔قلب کی دیواریں ڈھیلی پڑجاتی ہیں۔اور اُسکے فعل میں بیقاعدگی عاید ہوتی ہے۔بینائی دُھندلی پڑجاتی ہے۔چمدار لکیریں۔اور سُرخ نقطے اور کئی ایک قسم کی شکلیں نظر آتی ہیں۔کانوں میں باجے کی آوازیں مسموع ہوتی ہیں۔ اور طاقت شنوائی ایسی کمزور ہو جاتی ہے۔کہ آواز جلد سمجھ میں نہیں آتی۔بلکہ ہر وقت گھنٹہ بجنے کی سی باریک آواز مانند سیٹی کے معلوم ہوتی رہتی ہے۔مسُوڑے ایسے کمزور ہو جاتے ہیں۔کہ ذرا اُنگلی کے صدمے سے بھی خُون نکل پڑتا ہے + (سر ولیم جیفر)

یہ عادت آدمی کے معدہ کیا بلکہ تمام جسم کو اپنے معمولی فعل سے معطّل کر دیتی ہے۔اور خاصکر دیگر سمّیات کی طرح زیادہ تر نظام عصبی پر اپنا بد اثر پیدا کرتی ہے۔اور اس سے اکثر اسفل حصّہ جسم مفلوج ہو جاتا ہے + (ڈاکٹر میل)

کل۔جاڑے کی رات تھی۔اور سردی شدت سے پڑ رہی تھی۔مَیں نے عزم کیا کہ "کل" سے مَیں از سرِ نو زندگی شروع کرونگا۔ جاڑا کٹ گیا۔اور بہار بھی گئی۔اور مَیں ویسا ہی سُست رہا۔پھر گرما کا موسم آنکو تھا۔مَیں نے کہا "کل" سے کام شروع کرونگا۔ گرمیاں گذر گئیں اور مَیں نہ بدلا۔اِسی طرح ماہ و سال گذرتے جاتے ہیں اور مَیں "کل" کہہ کر ٹالتا رہتا ہوں۔مگر موت میرے سر پر کھڑی ہنستی ہے اور کہتی ہے "ہاں! بیشک! کل" + (پی۔بی۔مارسٹن)

وجد کرتا تھا خود اشعار پہ اپنے ہر بار　　تھا حقیقت میں وہ ہر چند طبیعت کا بخار
کیا ستم ہے مجھے کس خبط نے گھیرا تھا ابھی　　یاد کرتا تھا میں اُس اپنی لٹی دولت کی
مدّتوں میں جسے محنت سے کیا تھا اک جا　　راتدن جس کے لئے رنج و تعب جھیلا تھا
جس کی اُلفت میں عزیزوں سے ہوا میں بدظن　　جس ستمگر نے رفیقوں کو بنایا رہزن
جسکے ہاتھوں سے ہوا میری صداقت کا خون　　رائے صائب کو کیا جس نے مبدّل بہ جنون
کر کے مجبور نکالا مجھے جس نے گھر سے　　نوجوانی میں چھُڑایا پدر و مادر سے
فکر میں جس کی ہوئی طاعتِ معبود قضا　　جس کی اُمید پہ بندوں کو خداوند کہا
جس کا آشفتہ سمجھ کر ہوئے بدظن حکّام　　جس کی خاطر سے کئے میں نے نہ کرنے کے کام
اس پہ طرّہ یہ ہے آخر کو وہ خود بھی نہ رہی　　مجھ کو مُنہ پھیر کے دیکھا بھی نہ جسوقت چلی
دل دُکھا دیتی ہیں یاد آ کے پُرانی باتیں　　آنیوالے ہیں وہ دن اور نہ وہ پچھلی راتیں
عیش ہے طولِ امل سے جو نہ ہو مضطرِ دل　　وجہِ کلفت ہے بہر حال غمِ مستقبل
مطمئن ہو گیا بس قلب میرا اس گُر پر　　عمل آئندہ ہے الماضی لایذکر پر

پھر نہ اُبھریں یہ کبھی ایسا ڈبا دُونگا انہیں
یاس کے گہرے سمندر میں گرا دونگا انہیں

سیّد کاظم حبیب

خفتگانِ خاک سے استفسار

مہرِ روشن چھپ گیا اُٹھی نقابِ رُوئے شام　　شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر　　ساحرِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
یہ سیاہ پوشی کی تیّاری کسی کے غم میں ہو　　محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے

صبح دیکھے گی اُسی طرح سے خنداں مجھ کو
یُوں نہ پھر پائیگی تو مضطر و حیراں مجھ کو

واقعے پچھلے میرے پیش نظر تھے اسدم
عالمِ فکر میں تھا تازہ حوادث کا الم

آج آیا تھا مجھے اپنا لڑکپن کیوں یاد
قابلِ شرم ہر اُس عہد کی ہر اک روداد

عقل ناقص تھی مری اور ارادے ناقص
غور کرتا ہُوں تو افعال تھے سارے ناقص

غم کو لازم تھا سبب اور نہ خوشی کو بنیاد
تھوڑی سی بات کا ہوتا تھا اثر دل پہ بڑا

بے محل خواہشِ مطلوب میں وُہ سر دُھننا
ہر گھڑی اپنی ہی کہنا نہ کسی کی سُننا

روکے جس راہ سے کوئی وُہی چلتے رہنا
باتوں باتوں میں ہر اک وقت مچلتے رہنا

آن کی آن میں پھر تھی مُتغیّر حالت
منقلب صُورتِ بازیچہ تھی وُہ ہر حالت

بُھول ہی جانے کے قابل ہر جوانی کی اُمنگ
لُطف کیا جب نہ رہا اپنی طبیعت کا وُہ رنگ

ہے نہ وُہ عشق کی گرمی نہ جنوں کا وُہ جوش
جس سے پاؤں کی خبر تھی نہ مجھے سر کا ہوش

ایک جا بیٹھ کے ہوتی تھی طبیعت بیکل
گھر نہ خوش آتا تھا لگتا تھا سُہانا جنگل

دیتی تھی قلب کو تسکین پہاڑوں کی ہَوا
وقت بے وقت وُہ گھبرا کے اکیلے پھرنا

سر پہ ٹوپی جو نہیں ہے تو نہ ہو ہوش نہ تھا
لاگ تھی دل کی بناوٹ کا وُہ کچھ جوش تھا

اُڑ کے پڑ جاتے تھے آنکھوں میں اگر سر کے بال
بار بار اُنکا ہٹانا بھی نہ ہوتا تھا وبال

ہوتی تھی دُھوپ میں پھرنے سے جو سیری مجھکو
اور آتی تھی نظر چھاؤں گھنیری مجھ کو

جا کے گر سبزۂ نو رُستہ کو فرشِ مخمل
لیٹ جاتا تھا سنبھالے میں دل اپنا بیکل

درد رہتا تھا مجھے سبزے کی پامالی کا
غیر کا رنج ذریعہ تھا نہ خوشحالی کا

قلب کو دیتی تھی تفریح وُہ ساون کی ہَوا
ہوتا تھا ابر کا سایہ میری وحشت کی دَوا

سامنے جھُوم کے جب کالی گھٹا آتی تھی
بنکے جنگل کی ہَوا رُوح فزا آتی تھی

پاکے آزادی میں یُوں وقت موافق اپنا
کرتا تھا شاہدِ مقصود کے ملنے کی دُعا

کبھی پاتا تھا اگر اپنی طبیعت موزُوں
نظم کرتا تھا فراقیہ ہزاروں مضموں

فکر اینٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے؟
تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے جنت، و یا اک منزلِ آرام ہے؟
یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے -
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟

کیا عوض رفتار کی اس دیس میں پرواز ہے؟
موت کہتا ہے جسے انساں وہ کیا راز ہے؟

اس جدائی میں نہفتہ وصل کا ساماں ہے کیا؟
چشمِ بستہ سرمۂ گوہر بے انساں ہے کیا؟

اس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا؟
کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت کا؟

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علمِ انساں اس ولایت میں کیا محدود ہے؟

یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق
کیا وہاں پر جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق؟

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی؟
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟

حسن و خوبی ہو کے بے پردہ نظر آتے ہیں کیا؟
اس جہاں میں عشق کے ارماں نکل جاتے ہیں کیا؟

کیا دلِ انساں کو واں بھی ذوقِ استفہام ہے؟
کیا وہاں بھی جستجو میں روح کو آرام ہے؟

بے نشاں ہے جس کی ہستی وہ اسی ہستی میں ہے؟
جس کو کہتے ہیں بلندی وہ اسی پستی میں ہے؟

ہم جسے کہتے ہیں ہستی ہے وہ کیا تفسیرِ حسن؟
ہے صداقت بھی سعادت بھی وہاں تصویرِ حسن؟

آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

اقبال

کھیت سے آتا ہے دہقاں منہ میں کچھ گاتا ہوا
پائے گرد آلود دیتے ہیں مسافت کا پتا

کام دھندا ہو چکا اب نیند ہے آرام ہے
ہائے وہ آغازِ محنت جسکا یہ انجام ہے

رات کی آمد ہے مرغانِ ہوا خاموش ہیں
ابتدا و انتہا آپس میں ہم آغوش ہیں

شورشِ گفتارِ انساں کی صدا آتی نہیں
وہ صدائے نغمۂ گوش آشنا آتی نہیں

رنگِ خاموشی میں ہر ڈوبی ہوئی موجِ ہوا
ہاں مگر اک دور سے آتی ہے آوازِ ہوا

دل کہ ہے بے تابیٔ الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

اے عدم کے رہنے والو! تم جو یوں خاموش ہو
مے وہ کیسی ہے نشے میں جسکے تم بیہوش ہو؟

اے مے غفلت کے متوالو! کہاں رہتے ہو تم؟
کچھ کہو اُس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ ولائت بھی ہمارے دیس کی صورت ہی کیا؟
شب وہاں کی کیا ہے؟ صبح و شام کی رنگت ہے کیا؟

دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے؟
اُس ولائت میں بھی کیا مجبور کہتے ہیں اسے؟

واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟
اُس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟

رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں
اُس گلستاں میں بھی کیا۔ ایسے نکیلے خار ہیں؟

اِس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا؟
اُس ولائت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟

یہ خوشامد اُس ولائت کا بھی کیا دستور ہے؟
واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟

واں کی عزت بھی حکومت بھی حباب آسا ہے کیا؟
واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟

آہ! اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں
واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

خرمنِ دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا؟
اُس جہاں میں ہے تبسم پُرخطر ایسا ہی کیا؟

اور دیگر چیزوں کو ادھر اُدھر پھینکنے میں صرف ہوتی ہے۔ اینٹوں کے گھر بنانے میں سہولت سے صرف ہو سکتی ہے۔

(۲) بچپن کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ اس عمر میں کسی شئے پر مسلسل توجّہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس کے جسمانی قوائے کو ایک جگہ قرار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس کے قوائے عقلیہ بھی ایک نقطہ پر عرصہ کے لئے قرار پذیر نہیں رہ سکتے۔ جس طرح ہاتھ نچلے نہیں رہ سکتے اسی طرح اس کی توجہ میں بھی ایک طرح کی بیقراری ہی جو اسے ایک مقام پر جمنے نہیں دیتی۔ لہذا ہر طریق تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سبق طویل نہ ہوں اور چھوٹے چھوٹے حصّوں پر منقسم ہوں تاکہ پڑھتے وقت بچّے کے مختلف قوائے کو تحریک ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازم ہے کہ ہر سبق میں ایک خاص مشترک بات ہو تاکہ ایک خاص مقام پر توجہ لگانے کی عادت بھی ترقی کرتی جائے۔

(۳) بچوں کو اشیاء کے غور سے دیکھنے اور بالخصوص ان کے چھونے میں لطف آتا ہے۔ تین مہینہ کی عمر کا بچّہ ہو اور اس کی توجہ روشنی کی طرف منتقل ہو جائے تو ہاتھ پھیلاتا ہے اور شمع کے شعلہ کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظر کے فعل سے اس کی تسلّی نہیں ہوتی۔ حسّ لامسہ سے بھی مدد طلب کرتا ہے کیونکہ اسے قدرتاً اشیاء خارجی کے چھونے میں مزا آتا ہے۔ یہ بات تو ہر شخص کے تجربہ میں آئی ہوگی کہ جب بچّہ کی نظر دیوار کی کسی تصویر پر جا پڑے تو بے اختیار چلّانے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ تصویر اتار کر اس کے ہاتھوں میں دیدی جائے۔ چلّانے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے میاں اب چپ ہونے میں ہی نہیں آئینگے۔ مگر جب مطلوبہ شئے سامنے رکھدی جائے تو چپ ہو جانا تو ایک طرف بعض اوقات آپ کی ہنسی بھی نکل جاتی ہے۔ پس جس شئے کے متعلّق سبق دو اس کو بچّے کے سامنے رکھو اور جب سبق ختم ہو جائے تو شئے مذکور اس کے ہاتھ میں دیدو۔ مشاہدہ سے حس بصر کی تربیت ہوتی ہے۔ چھونے سے

صبحِ پیری

کیا جانے سر کے بال تھے مدت سے کیوں سپید
نزلہ جھکا وہ ریش پہ اب یہ غضب ہوا

سیمیں یہ مو نہیں ہیں طنابیں ہیں نور کی
خیمہ سحر کا آن گڑا کوچِ شب ہوا

اب کیجے جا کے معرکۂ زندگی کے کام
ہونا تھا جتنا بزم میں عیش و طرب ہوا

کیا دیکھے آئینہ کوئی؟ منہ ہی نہیں ہے جب
بے کار ہے جو قبضے میں شہرِ حلب ہوا

آنکھوں کی دوربینوں میں بھی اب نہیں وہ زور
دانتوں کا بھی حصار مرمت طلب ہوا

جاسوس کان کے پڑے کرتے ہیں بے خبر
ان کی بلا سے دہر میں شور و شغب ہوا

طاقت کہاں بیاں میں کہ دیجو گلوں کو طول
مجبوریوں سے وردِ زباں شکرِ رب ہوا

وہ دن کہاں کہ صبح سے ہو سیر چوک کی
بازارِ عیش گرم جہاں وقتِ شب ہوا

پانوں کے راہوار اٹھاتے نہیں قدم
کمری جو یک بیک یہ ہوئے، کیا سبب ہوا؟

امعا جو بگڑے پھر نہ ہوئے آہ مستقیم
معدے ہیں گرچہ ہضم مسلم مطب ہوا

شہباز کو کہ فرض سے تھا دور جو بزرگ
کیوں کر خیالِ نافلہ و مستحب ہوا

جب تک رہا وہ ہند میں تھا شیخ فاسقاں
کعبے گیا تو قبلۂ شیخ العرب ہوا!

پروفیسر شہباز

کم مایہ مسرت۔ گو تمام خوشیاں کم مایہ ہیں لیکن سب سے زیادہ کم مایہ وہ خوشی ہے جو درد سے خریدی جائے اور پشیمانی جس کا پھل ہو۔

ایسا نہ ہو کہ یہ قوت بے قاعدہ طور پر بڑھ جائے اور اس سے قوائے عقلیہ کی ترقی میں نقص پیدا ہو۔ بعض حکماء کی رائے ہے کہ اس قوت کی تربیت کی اتنی ضرورت نہیں جسقدر کہ اسے مناسب حدود کے اندر رکھنے کی۔ بچے کی اس خصوصیت سے بے انتہا تعلیمی فائدہ ہوسکتا ہے۔ اکثر مکتبوں میں لڑکے کاغذ کی کشتیاں یا "دن رات" بنایا کرتی ہیں۔ قوت واہمہ کے لئے یہ اچھی مشق ہے۔

(۷) بچوں میں ہمدردی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ جن سے بچہ کی اخلاقی تعلیم میں ایک نمایاں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ ماں باپ غمگین نظر آویں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنالیتا ہے۔ تجربہ اور مشق سے یہ جبلی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ ابتدا میں اوروں کے غم سے متاثر ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ اُستاد کو چاہیے کہ اسے ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سُنائے اور یاد کرائے۔ جس حیوان کے متعلق اسے سبق دینا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ بچے کے لئے ایک عمدہ مثال تقلید کرنے کے لئے قائم ہوجائے۔

(۸) الفاظ یاد رکھنے کے لئے بچہ کا حافظہ حیرت ناک ہے۔ اپنی مادری زبان کی پیچیدگیاں کس آسانی سے سیکھ جاتا ہے اور یاد کرلیتا ہے۔ معلم کو لازم ہے کہ اپنے شاگردوں کو عُمدہ عُمدہ اشعار اور نظمیں یاد کرائے اور پڑھے ہوئے سبقوں کے مضامین کی طرف بار بار اشارہ کرے۔

(۹) اس عمر میں قوتِ متمیزہ کمزور ہوتی ہے۔ اشیاء کے باریک باریک فرق تو معلوم نہیں کرسکتا۔ ہاں بڑے ظاہر اور نمایاں اختلافات مثلاً اختلافاتِ صُورِ اشیا معلوم کرلیتا ہے۔ لہٰذا ابتدا میں ظاہر اختلافات کی طرف اسے توجہ دلانی چاہیے۔ مثلاً دو چیزیں ایک گیند اور ایک پہلودار شے اس کے سامنے رکھدو اور دونوں کے اختلافات مندرجہ ذیل طور سے بیان کرو:—

قوت لمس معتد بہ فروغ پاتی ہے۔ گفتگو اور راگ وغیرہ سے قوت سامعہ ترقی کرتی ہے۔ اس طرح لمس اور بصر کے متحدہ استعمال سے بچہ کو صورت شے کا ادراک ہوتا جاہیگا۔

(۴) بچے کی توجہ صورت شے سے زیادہ رنگ شے کیطرف لگتی ہے۔ جن اشیا کا رنگ شوخ ہو اس کا دھیان زیادہ تر انہیں کی طرف رہتا ہے۔ کسی اوّل درجہ کے مصور کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھدو اگر اس کا رنگ شوخ اور چمکیلا نہیں تو اسے اس کی پروا بھی نہیں ہوگی۔ برخلاف اس کے اپنی چھوٹی سی کتاب کی رنگین تصویروں پر جان دیتا ہے۔ بول چال میں ملاحظہ کیجیے لفظ سُرخ۔ نیلا وغیرہ تو پہلے سیکھ جاتا ہے اور لفظ مربع۔ تکون وغیرہ کہیں بعد میں جاکر۔ اس سے یہ اصول قائم ہوا کہ بچے کے ابتدائی سبق رنگین اشیاء کے متعلق ہونے چاہئیں۔

(۵) بچے میں بڑوں کی نقل کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہم جولیوں کو کہتا ہے آؤ بھئی ہم مولوی بنتے ہیں تم شاگرد بنو کبھی بازار کے دوکانداروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے کبھی پھر پھر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ "چلے آؤ انار سستے لگا دیئے"۔ اس وقت میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

(۶) قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی ہے۔ شام ہوئی اور لگا ستانے اپنی اماں کو "اماں جان! کوئی کہانی تو کہدو"۔ ماں چڑیا یا کوے کی کہانی سُناتی ہے تو خوشی کے مارے لوٹ جاتا ہے۔ ذرا بڑا ہوا اور کچھ پڑھنا سیکھ گیا تو ناولوں اور افسانوں کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اُستاد کو چاہیے کہ قوتِ واہمہ کے نمو کی طرف بالخصوص خیال رکھے

کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا اس قسم کا علم دینا ممکن ہے کہ بعض وجوہات سے اچھا ہوا ہو۔ علمی اصولوں کے رو سے بچّے کے حافظہ پر ایک بیجا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں ہے۔

جس طرح تصوّرات کے لئے مقابلہ مدرکات کی اور تصدیقات کے لئے مقابلہ تصوّرات کی ضرورت ہے۔ اسی طرح استدلال کے لئے جو مقابلہ تصدیقات سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ بچّے کے علم میں کافی تعداد تصدیقات کی ہو۔ اُستاد کو خیال رکھنا چاہئے کہ بچّے کے مدرکات تصوّرات تصدیقات اور استدلالات اس کے علم کے انداز کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے جائیں۔

(۱۱) آخری خاصہ بچّے کا یہ ہے کہ اخلاقی محرکات سے یا تو بچّہ متاثر ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو نہایت اقل درجہ پر۔ کیونکہ اس قسم کی تحریکوں سے متاثر ہونا اور اس اثر کو عملی زندگی کے دائرہ میں ظاہر کرنا ایک ایسا امر ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ معلّموں کا فرض ہے کہ ابتدا سے ہی بچّے میں اخلاقی تحریکوں سے متاثر ہونے کی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً شروع سے ہی اُنکو ہمدردی کرنا سکھائیں اور نیز اس امر کی طرف پوری توجہ دیتے رہیں کہ بچّہ اپنے سبق کے متعلق ضروری ترتیب کا لحاظ رکھے کیونکہ امن اور صلحکاری کی عادت انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نفس ناطقہ قوائے کا ایک مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے اور اس کی ہر ایک قوّت کا نشو و نما ہر دوسری قوّت کے نشو و نما پر منحصر ہے جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں۔ اسی طرح نفس ناطقہ کی قوائے کا نشو و نما بھی انہیں اصولوں کے تحت میں ہے۔ لہذا طریقۂ تعلیم کامل وہی ہوگا جو نفس ناطقہ کے تمام قوائے کے لئے یکساں ورزش کا سامان مہیّا کرے۔ ادراک فکر تخیّل تاثر اور مشیّت غرضکہ نفس ناطقہ کی ہر قوّت تحریک میں آنی چاہئے۔ کیونکہ کامل

گیند	پہلو دار شے
ایک ہی سطح ہے	بہت سی سطحیں ہیں
کوئی گوشہ نہیں ہے	بہت سے گوشے ہیں
کوئی کنارہ نہیں	بہت سے کنارے ہیں

اِن نمایاں اور ظاہر اختلافات کا علم دے چکنے کے بعد کسی اَور شکل کی شے پیش کرو۔ اور علیحدہ علیحدہ گیند اور پہلو دار شے سے اسکا مقابلہ کر کے باریک باریک اختلاف واضح کرو۔

(۹) قوائے عقلیہ مثلاً تصدیق اور استدلال کا کمزور ہونا۔ بچے سے ایسی فہمید کی توقع نہ رکھو جو ابھی تجربہ اور علم سے بڑھتی ہے۔ اِن قوائے کے مدارج ترقی کا لحاظ اُستاد کے لئے نہائت ضروری ہے۔ دو عام اشیا اِس کے سامنے رکھو اور انکے بڑے بڑے اختلافات بیان کرو اسی طرح مقابلہ کرتے کرتے تصدیق پیدا کرو مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تصدیق بغیر تصورات کے محال ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں دو تصورات کے مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے جو خود مختلف مدرکات کا مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً بہت سے افراد نوع انسان کا مقابلہ کرنے سے ان میں بعض مشترک اوصاف معلوم ہوتے ہیں جنکی اشتراک کی وجہ سے ہم ان سب افراد کو ایک مشترک اور حاوی نام دیدیتے ہیں جو ہر فرد پر صادق آتا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں سے ایسے تصورات کے علم کی توقع نہیں رکھنی چاہئے جس کے ضمنی مدرکات کا علم ہی اس کو نہیں ہے۔ ایک برس کے بچے کو کیا علم کہ "حب وطن" کس جانور کا نام ہے۔ ہمارے بعض معلم بچے کے ہاتھوں میں ایسی ابتدائی کتابیں رکھدیتے ہیں جنکا پہلا باب مثلاً "خدا کی صفات" سے شروع ہوتا ہے۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ "خدا" ایک ایسا مجرد تصور ہے جو قوائے عقلیہ کی حد کمال پر پہنچنے اور بہت سا علم حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور صفات شے کا اس شے سے علیحدہ تصور کرنا ایک ایسا فعل ہے جو بچے سے

امریکہ کی آزادی

امریکہ کے ایک مشہور جادوبیان مسٹر ہنری ہیٹرک نے امریکہ کی آزادی کے متعلق جنگ شروع ہونے کے وقت ایک پُرزور تقریر کی تھی - اُس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

اِنسان کا اُمید کی دلفریبیوں میں محو ہوجانا ایک قدرتی بات ہے - تلخ - سچے اور غیر مساعد واقعات کی طرف سے ہم اکثر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں - اور اُمید کی راگنی سُنکر ایسے متوالے ہوجاتے ہیں کہ وُہ ہماری عقل کو سلب کر کے ہمیں حیوان بنا دیتی ہے - مگر کیا یہ اُن مدبروں کا شیوہ ہے جو آزادی کے حاصل کرنے کے اہم اور مشکل کام میں لگے ہوں؟ - کیا ہم اُن لوگوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں - جو کان رکھتے ہیں مگر اپنی نجات کی باتوں کو نہیں سُنتے - اگر مجھے پُوچھیئے تو میں تو حق سُننا چاہتا ہوں خواہ وُہ کیسا ہی صدمہ پہنچانے والا اور تلخ کیوں نہ ہو -

میرے قدم کی راہ نمائی کے لیے تو صرف ایک ہی چراغ ہے اور وُہ تجربہ ہے - میں آیندہ کا موازنہ صرف ماضی سے کرسکتا ہوں - پس گذشتہ دس سال کے عرصہ میں برطانیہ کی وزارت کے برتاؤ میں کونسی بات ہے جو اُن اُمیدوں کے پُورا ہونے کا حوصلہ دلا سکتی ہے جو بعض اصحاب کے دلوں میں باقی ہیں؟ کیا وُہ عیارانہ تبسّم جو ہماری درخواست پر کیا گیا ہے؟ جناب اس پر اعتبار نہ کیجیے گا - یہ تو آپ کے لئے ایک کمند ہے - دیکھئے کہیں آپکا منہہ چُوم کر دھوکا نہ دیدیں - ذرا اپنے دل سے پُوچھئے کہ آپ کی درخواست کی کیا آؤبھگت ہُوئی ہے - اُس کو اُن جنگی تیاریوں سے جو ہمارے قریب کے سمندر میں ہو رہی ہیں - اور جو ہمارے ملک پر اپنا تاریک سایہ ڈال رہی ہیں کیا مناسبت ہے - کیا صلح اور محبت کے کاموں کے لئے جنگی بیڑوں اور فوجوں کی ضرورت ہُوا کرتی ہے - کیا ہم نے

طریقِ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں *

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لئے بچّے کے نشو و نما کا مطالعہ کہاں تک ضروری ہے۔ معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو مُلک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگذاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگذاری مُلک کے معلّموں کی کارگذاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس مُلک میں اس مُبارک پیشہ کی وُہ قدر نہیں۔ جو قدر کہ ہونی چاہیئے۔ معلّم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی تمدّنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور تمام قسم کی ملکی ترقّی کا سرچشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لئے ضروری ہے کہ وُہ اپنے پیشہ کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریقِ تعلیم کو اعلیٰ درجہ کے علمی اصُولوں پر قائم کریں۔ جس کا نتیجہ یقیناً یقیناً یہ ہو گا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچّا عشق پیدا ہو جائیگا۔ جس کی گرمی میں وُہ تمدّنی اور سیاسی سرسبزی مخفی ہے۔ جس سے قومیں معراجِ کمال تک پہنچ سکتی ہیں *

محمدؐ اقبال

خیابانِ فارس۔ پچھلے رسالہ میں لاٹ کرزن بالقابہ کی کتاب کے ترجمہ کا اشتہار درج ہو چکا ہے۔ اُس میں یہ جتایا گیا ہے کہ پیشگی قیمت دینے والوں کے لئے رعائت ہے۔ منشی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے اس کتاب کے لائق مترجم ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ اشتہار کو دیکھ کر درخواستیں خریداری کی تو اُنکے پاس پہنچی ہیں۔ مگر قیمت ساتھ نہیں پہنچی۔ اس لئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ محض درخواستِ خریداری کتاب چھپنے سے پہلے بھیجنا کافی نہیں۔ قیمت میں رعائت اُسی صورت میں ہے۔ کہ رعائتی نرخ سے قیمت بھی درخواست کے ہمراہ بھیجدی جائے۔ اُمید ہے کہ شایقین اس امر کو ملحوظ رکھینگے *

نہ کریں کبھی نہ بیٹھینگے۔ ذلت اور کمینہ پن سے ترک کرنا پسند نہیں کرتے تو ہم کو لڑنا پڑے گا۔ مَیں پھر کہتا ہُوں کہ ہمیں جنگ کے لیئے آمادہ ہوجانا چاہیئے۔ سوائے ہتھیاروں سے کام لینے اور تمام لشکروں کے مالک کی درگاہ میں اپیل کے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔
ہماری نسبت کہا جاتا ہے کہ ہم کمزور ہیں اور ایسے خوفناک اور قوی دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔ مگر وُہ وقت کب آئیگا جب ہم قوی ہونگے۔ اگلے ہفتے؟ یا اگلے سال؟ کیا جب ہتھیار چھن جائینگے اور ہر گھر پر ایک انگریز محافظ مقرر ہوگا۔ کیا ہم توقف اور تساہل سے طاقتور ہو سکتے ہیں۔ کیا سُستی سے زمین پر پڑے رہنے اور اُمید کے چھلاوے پر بھروسہ کرنے سے وُہ سامان مہیا ہوجائینگے جن سے ہم مقابلہ کرسکینگے۔ اُسوقت تک تو دشمن ہمارے ہاتھ اور پاؤں کو باندہ کر ہمیں نکما بھی کردیگا۔
اگر ہم ان وسائل کا جو قدرت نے ہمیں دیئے ہیں۔ مناسب استعمال کریں تو ہم کمزور نہیں ہیں۔ آج ہمارے تیس لاکھ بھائی آزادی کے مقدس نام کے لئے مُسلّح ہیں علاوہ ازیں ہمارا ملک ایسا ہے کہ خواہ دشمن کتنی بڑی فوج کیوں نہ لے آئے اِسے تسخیر نہیں کرسکتا۔ اور پھر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن لڑائیوں میں ہم تنہا نہ ہونگے۔ وُہ عادل خُدا جس کے ہاتھ میں قوموں کی قسمت ہے وُہ ہمارے لیئے بہت سے مُعاون پیدا کردیگا۔ جو ہماری لئے لڑینگے۔ جنگ میں ہمیشہ طاقتور ہی فتح نہیں پاتا۔ بلکہ وہ جو زیادہ بہادر اور چُست و ہوشیار ہوتا ہے۔ بازی لے جاتا ہے۔ مگر اب ہمارے لیئے اِس بات کے فیصلہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ جنگ کیجائے یا نہ کی جائے۔ اگر ہم اِس ذلت کے قبُول کرنے پر راضی بھی ہوجاتے تو اُس کا وقت بھی جا چکا ہے۔ اب اگر پناہ لینا چاہیں تو غلامی اور ذلیل اطاعت کے سوا اب کہیں پناہ نہیں۔ ہمارے لیئے زنجیریں تیار ہوچکی ہیں اور اُن کی چھن چھن کی آواز باسٹن کے میدانوں سے سُنائی دے رہی

صلح سے اس قدر گریز ظاہر کی ہے کہ ہماری محبت کو پھر بہ جبر حاصل کرنے کی ضرورت واقع ہوئی ہے۔ حضرات اپنے آپ کو دھوکا نہ دیجئے۔ یہ تو صاف جنگ کے سامان ہیں اور ہمارے زیر کرنے کی تیاریاں ہیں۔ یہ بادشاہوں کی آخری دلیلیں ہوتی ہیں۔ کیا آپ ان جنگی تیاریوں کے سوائے ہمیں جبراً و قہراً مطیع کرنے کے کوئی اور معنے بتا سکتے ہیں۔ کیا دشمن کے اس حصہ میں برطانیہ کا کوئی اور دشمن بھی ہے جس کے لئے یہ جہاز اور فوجیں جمع کی گئی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ صرف ہمارے لئے بھیجے گئے ہیں کہ وہ زنجیریں جو برطانیہ کی وزارت اتنی دیر سے ڈھال رہی ہے ہمیں پہنائی جائیں اور ہم جکڑ دیئے جائیں۔

اب ہمیں کس طرح ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ کیا بحث و تکرار کی جائے؟ ہم اس سال تک بحث کر چکے ہیں۔ اس مضمون پر کونسی نئی بات ہے جو ہم کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے جہاں تک ممکن تھا ہر پہلو سے اس پر دلیلیں پیش کی ہیں۔ مگر بے سود۔ کیا ہم عاجزانہ التجا اور منت و سماجت پر اتر آئیں۔ مگر وہ الفاظ کہاں سے آئینگے جو پہلے استعمال نہیں کئے گئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ آؤ دھوکہ نہ کھائیں۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی ہے کہ اس طوفان کو جو آرہا ہے۔ لوٹا دیں۔ ہم نے درخواست کی ہے۔ تکرار کی ہے۔ عاجزی کی ہے۔ اپنے آپ کو تخت کے آگے گرا کر التجا کی ہے کہ مظالم اور پارلیمنٹ کے مظالم کو روکا جائے۔ مگر ہماری درخواستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہماری شکایت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم پر مظالم زیادہ کر دیئے گئے ہیں۔ ہماری عاجزیوں کی کچھ پرواہ نہیں کی گئی اور تخت کے پایہ سے ہمیں نفرت کے ساتھ دھکیلا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد صلح اور امن کی امید کرنا خیال خام ہے۔ امید کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اگر ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اور ان بیش قیمت حقوق کو جن کے لئے ہم اتنی دیر سے جھگڑ رہے ہیں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس قابل فخر جد و جہد کو جس میں ہم مدتوں سے لگے ہوئے ہیں اور جس کے لئے ہم نے حلفیں اٹھائی ہوئی ہیں کہ جب تک وہ عظیم الشان مقصود حاصل

خوابِ ناز

(ایک منظر کی یاد میں)

ہاں نگاہِ شوق آ دکھلائیں اک پیارا سماں ۔۔۔ پاک نظارہ ہے۔ آ نا پاک دل سے تو بھی یاں
تو بنے گلچیں تو یہ ہے ایک طرفہ بوستاں ۔۔۔ شائقِ گلگشت جس کا ہو دلِ روحانیاں

حسن کا اس دم عجب عالم فریب انداز ہے
وہ بہارِ باغِ خوبی محوِ خوابِ ناز ہے

اس گھڑی آرام میں ہیں وہ نظر کی بجلیاں ۔۔۔ چلبلی وہ مسکراہٹ وہ پیاری شوخیاں
جاگتا ہے ایک بھولا پن مثالِ پاسباں ۔۔۔ پیارے چہرے پر ہے چھایا ہائے کیا پیارا سماں

گر فرشتے بھی یہ بھولی صورت دیکھ پائیں
اپنے معصومی کے دعوے سے یقیں ہے ہاتھ اٹھائیں

روح پرور تا ہے یہ منظر عجب دلکش اثر ۔۔۔ جس طرف کو آنکھ اٹھاؤ چاندنی ہے جلوہ گر
منعکس ہوتا ہے اس چہرے سے کیا نورِ قمر ۔۔۔ چاندنی کی ہر کرن ہے ایک الفت کی نظر

چاند بھی گویا کہ اس جلوے سے محوِ دید ہے
ہاں مبارک ہو نگاہِ شوق تیری عید ہے

ہے غرورِ حسن کی اس سادگی میں بھی جھلک ۔۔۔ ہر شعاعِ حسن میں ہے برقِ خاطف کی چمک
نشترِ جاں ہر سکوں میں بھی ہے اک بانکی پلک ۔۔۔ اضطراب افزا ہے گھونگھر والے بالوں کی مہک

ابروئے پیوستہ میں عشوہ ہے گو دزدیدہ ہے
مسکراہٹ ہے لبوں پر اب بھی گو خوابیدہ ہے

ہیں ہم آہنگِ خموشی غمزہ و ناز و ادا ۔۔۔ دیدۂ مشتاق ہے آئینہ ساں حیرت زدہ

ہے - جنگ ناگزیر ہے - بس اب اسکے لئے کمر ہمت چست باندھ لو - اور تیار ہو جاؤ - اب حقیقت کو چھپانا یا کم کر کے دکھانا ٹھیک نہیں - بعض اصحاب امن امن پکارا کریں - مگر اب امن کہاں - جنگ شروع ہو گئی - دوسرا ہوا کا جھونکا جو شمال سے آویگا اُس میں ہتھیاروں کی جھنکار سُنائی دیگی - ہمارے بھائی میدان میں آ چکے ہیں - ہم یہاں کیوں بیکار پڑے ہیں - اب بتائیے کیا مرضی ہے - کیا جان ایسی پیاری اور امن ایسا عزیز ہے کہ غلامی اور زنجیروں کے بدلے خرید لئے جائیں - اے خدا تو ہم سے اُس دن کو باز رکھ - اوروں کی نسبت تو میں نہیں کہہ سکتا مگر مجھے یا تو آزادی دے یا موت *

عبدالرشید چشتی

حصولِ دولت - یہ بھی امر ہے اگرچہ کہ درست نہیں) کہ مفلس لوگ اُن لوگوں کو نگاہ حسد سے دیکھتے ہیں جو دولتمند ہوں - زیادہ تر اس وجہ سے کہ بہت سے متمول لوگوں نے یہ دولت بذاتِ خود نہیں پیدا کی - بلکہ انہیں آبا و اجداد سے وراثتاً ملی ہے - لیکن خواہ کسی شخص نے یہ دولت خود پیدا کی ہو یا اُسے وراثتاً ملی ہو - ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ اسکے فراہم کرنے میں غالباً بہت سی فراست - پیش بینی - صبر - نفس کشی اور بعض اوقات سچائی بھی صرف ہوئی ہوگی جو عام لوگ صرف کرنے کی لیاقت نہیں رکھتے - بالکل اسیطرح جیسے ایک شخص نے اُس گھر کے لئے جس میں اُس کی سکونت ہے - قیمت ادا کی ہوگی - دُنیا میں بڑے بڑے کام صرف دِل خوش کن آرزوؤں سے ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ عزم فراست اور مستعدی کا نتیجہ ہیں *

مُہذب ظرافت - یہ کوئی ایک نامور ظریف ہیں - جو مارک ٹوئین کے نام سے زمانہ بھر میں مشہور ہیں اور جہاں ایک گھنٹہ کوئی اپنے لطائف ظرافت کسی مجمع میں سُناتے ہیں - وہ چار ہزار روپیہ ٹکٹوں کے ذریعہ سے وصُول ہو جاتا ہے - کچھ عرصہ ہوا وہ یورپ میں ایک بہت بڑے مجمع میں تقریر کر رہے تھے کہ ضمناً ذکر آ گیا - کہ زار روس نے جو تمام یورپ میں صلح و امن کے قیام کے متعلق تجاویز پیش کی ہیں - مسٹر سٹیڈ جو انگلستان میں بڑے اخبار نویسوں میں سے ایک ہے - انکا حامی ہے - اور بہت سے مضامین اُن کے موافق لکھ چکا ہے - مارک ٹوین نے مسٹر سٹیڈ کی تحریرات کی ایک فقرہ میں ہنسی اُڑا دی - کہنے لگا کہ مسٹر سٹیڈ نے تو اس مسئلہ کے متعلق یہ کیفیت ہے کہ زار روس تجویز کے موافق ہے اور میں بھی موافق ہوں - باقی دنیا بھر کی رائے سے کیا جھگڑا ہے" *

ہوگیا سناٹا سا چمن میں ۔۔۔ اوس سی کچھ پڑ گئی گلشن میں
بند ہوا نغمہ سے بلبل ۔۔۔ دن کے سوگ میں بیٹھا سنبل
آنکھ میں نرگس کی نیند آئی ۔۔۔ لینے لگا ہر بار جمائی
لوٹ لیا گلچیں نے گلشن ۔۔۔ گویا باغ بنا ہے اک بن
قابلِ دید ہے عالم بالا ۔۔۔ فلک سجا ہے تاروں سے کیسا
رات کے آنے کی ہیں یہ خوشیاں ۔۔۔ کی ہے فرشتوں نے بھی چراغاں
بزمِ طرب کیا خوب سجی ہے ۔۔۔ نغمہ زنی زُہرہ نے کی ہے
سارے ثوابت دنگ کھڑے ہیں ۔۔۔ محفل کے وُہ رنگ جمے ہیں
قدسیوں کا واں لگا ہے پہرا ۔۔۔ کوئی بشر جانے نہیں پاتا
لیکن ان دریاؤں کو دیکھو ۔۔۔ کھینچ ہی ڈالا سب کا فوٹو
کُل سنسار ہے بے خود سوتی ۔۔۔ ہیں یہ پروتے چُن چُن موتی
گو عکسی تصویر ہے بھاتی ۔۔۔ لیکن رات ہے گذری جاتی
سارے ساتھی گھر کو سدھارے ۔۔۔ کون گنے اب بیٹھا تارے

وقتِ راحت ہے کیوں کھوئیں
آؤ بس ہم تُم بھی سوئیں

علمدار حسین (از بنوں)

دہقان کی داستان

ہمارے دیرینہ عنایت فرما منشی سراج الدین احمد صاحب جو عرصہ دراز تک پوسٹل ڈپارٹمنٹ میں ذمہ داری کے عہدوں پر ممتاز رہ کر اب پنشنیاب ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل نظم ہمیں ارسال فرماتے ہیں۔ اس میں اُنہوں نے دلی درد کے ساتھ دہقان کی تکالیف اور مشکلات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔

اس چمن کی دلفریبی کی نہیں کچھ انتہا ۔۔۔ اے نگاہِ شوق بس گلگشت اس کی تا کجا
یہ نہ ہو ارمان کی بے تابیاں ہونے لگیں
جاگ اُٹھیں وُہ تو تجھ سے بدگماں ہونے لگیں

نیرنگ

رات کا سماں

شام ہُوئی اور سُورج ڈوبا ۔۔۔ چھایا دنیا میں اندھیرا
فاختہ ۔ طُوطی ۔ چڑیا ۔ کوّا ۔۔۔ کرنے لگے سب رَین بسیرا
سُنکر سب اللہ اکبر ۔۔۔ لگے نمازیں پڑھنے مِل کر
سنکھ بجا اور گھنٹہ ٹھنکا ۔۔۔ بیٹھے ہندو کرنے پُوجا
چمگادڑ نے آنکھیں کھولیں ۔۔۔ اُلّو نے اپنی بولیاں بولیں
اُمڈا اندھیرے کا دریا ۔۔۔ پلٹ گئی دُنیا کی کایا
دیئے کئے لوگوں نے روشن ۔۔۔ گانے لگے چھایا اور ایمن
بچے لگے سب نیندیں لینے ۔۔۔ مائیں اُن کو لوریاں دینے
بھیک منگوں نے ناکے روکے ۔۔۔ مانگا اِک اِک سے رو رو کے
جنٹلمین کلب میں پہونچے ۔۔۔ آبادی میں گئے بھونکے
میکش سب کی آنکھ بچا کے ۔۔۔ میکدے کی جانب ہیں جاتے
رندِ جو خوش ہیں جی ہی جی میں ۔۔۔ پیرِ مغاں کی ہیں پانچوں گھی میں
بیٹھے ہیں کُشتۂ ناز بچارے ۔۔۔ اپنی دُھن میں عشق کے مارے
سر کا ہوش نہ پاؤں کی سدھ ہے ۔۔۔ ماری گئی کچھ ایسی بُدھ ہے

میں نے ہی اپنے پسینے اور لہو کو ایک کر کر دیئے شاہی خزانے پُر ز لعل و سیم و زر

وقت پر گر میں نہ پہنچاؤں محاصل اور خراج

شاہ پھر کون اور کہاں گنج اور کیسا تخت و تاج

خاک چھانی میں نے اور کوئی ہوا تحصیلدار اور ہوا میری عرق ریزی سے کوئی پیشکار

میرے ماتھے کے پسینے سے بنے سب چوبدار میری ہائے و ہو سے ہی پاسبانوں کی پکار

گرم مٹھی اہلکاروں کی مری گرمی سے ہے

نرم گوئی چوبداروں کی مری نرمی سے ہے

تیغ اہل سیف کی ہے آب میری چاہ سے اور قلم واقف ہے میری محنتِ جانکاہ سے

آشکارا میری جانکاہی ہے کوہ و کاہ سے انتظامِ سلطنت ہے شورشِ جنگاہ سے

بنتے ہیں ملک داری کے لئے سیف و قلم

میری کسبوں اور بلوں کچالوں کا لوہا دمبدم

میرا ہی خونِ جگر ہے غازۂ روئے بتاں مشک سا میرے عرق ہی سے ہے جعدِ مہوشاں

گر نظر میری سے قیس و کوہکن ہوتے نہاں بھول جاتے لیلیٰ و شیریں کی ساری داستاں

محفلِ رندانِ مے آشام میں ساقی میں ہوں

بجتے ہیں میرے رگ و پے ہی سے چنگ و ارغنوں

میں ہی ہوں سب عابدوں اور زاہدوں کا قبلہ گاہ میرا تکیہ ہے فقیروں کے لئے جائے پناہ

بانیٔ مسجد ہوں میں اور رونقِ درسگاہ ہر مسافر پر کھلی ہے میرے در کی شاہراہ

ایک دن بھی ڈیوٹی اپنی مجھے گر بھول جائے

مولوی صاحب کی پھر آنکھوں میں سرسوں پھول جائے

آپ ملّا اور پوپ ہیں میرے خدمتگذار اک کولھو میں جتنا ہوں اور ہوں اک رہوار

لقمہ دیتے ہیں مجھے سینے کو شیرِ خوشگوار ذائقہ پر میرے جاں کو بعض کرتے ہیں نثار

منشی صاحب موصوف مشاق شاعر نہیں۔ اِس لئے اُن سے اُس منجھی ہوئی زبان اور ان چست بندشوں کی توقع رکھنا جو اُستادانِ فن اور دلی اور لکھنؤ کے اہلِ کمال لوگوں کا حصہ ہیں بیجا ہوگا۔ مگر اُن کا انتخاب مضمون اور تلاش قابلِ داد ہیں۔ اور جو واقفیت اور تفصیل انہوں نے اپنے بیان میں دکھائی ہے لائق تعریف ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دہقان کی یہ آپ بیتی دلوں پر اثر کرے گی اور کوئی اسے طویل کہانی سمجھ کر چھوڑ نہ دیگا:۔

ابر و باد و ماہ و خورشید و زمین و آسماں — صبح و شام و چاشت و روز و شب و وقت و زماں
کوہسار و سبزہ زار و جوئبار و گلستاں — شاہ و نواب و وزیر و چوبدار و پاسباں
میش و گاؤ و اشتر و اسپ و خر و فیل و غنم
آب و خاک و آتش و سیم و زر و لوح و قلم

الغرض دنیا سے اور دنیا کی موجودات سے — آشکارا یا نہاں صدہا تعلق ہیں مجھے
نعمتیں رکھی ہیں مالک نے جو حصہ میں مرے — کب بھلا مجھ سے شمار اور شکر انکا ہو سکے
میری صورت دیکھ محو رشک ہوتا کیقباد
تاج و تخت فارس کو کرتا نہ بھولے سے بھی یاد

کرتے ہیں لیل و نہار و چاشت و صبح و مسا — سال و ماہ و ہفتہ ہا و موسم صیف و شتا
سردی و گرمی و تاریکی و نور جاں فزا — اپنے اپنے وقت پر سب خدمتیں میری ادا
میرے پودوں کی شعاع مہر انور دایہ ہے
پاسباں کھیتوں کا میرے ماہ عالی پایہ ہے

وہ شگوفے اور میوے وہ بقولات و ثمر — جن سے خوشبو اور رونق ہی سبھوں کے خوان
یاسمین غیرت مشک و گل رشک گہر — جو کہ ہیں زیب گلوئے مہ وشان سیم
سب مری خاراشگافی ہی کی ہیں گلکاریاں
سب کے رگ ریشوں میں ہے میرا پسینا ہی رواں

تاج سلطانی میں تابندہ ہیں جو لعل و گہر — ہیں وہ سب قطرات میرے ہی عرق کے

نوحۂ تنہائی

(ترجمہ از ولیم کوپر)

تنہائی! ترے فسوں کہاں ہیں دانش نے جو رُخ ہیں تیرے دیکھے
خطروں میں ہمیشہ رہنا منظور شاہی نہ کروں پر اس جگہ میں
انساں کی پہنچ سے دُور رہ کر دن کاٹ رہا ہوں میں اکیلا
سننے کو کہاں وہ میٹھی بولی! اپنی ہی صدا پہ چونکتا ہوں
میدان میں درندے چلتے پھرتے صورت سے میری نہیں بھڑکتے
انسان کے ناشناس رستے! دہلاتی ہے اُن کی یہ ڈھٹائی
انسان کی نعمتو خدادادا! ق ہمسائگی - دوستی - محبت
اُڑ کر میں تمہارے پاس آؤں مل جائیں کہیں سے مجھ کو جو پر
غم اپنا کروں میں تم میں ہلکا ہر طرح کے صدق سے صفا سے
حکمت کا بڑوں کی لوں سبق میں دیکھوں میں شباب کی بہاریں!
مذہب! تری ذات میں نہاں ہیں سیم و زر و لعل کے خزانے
اس ارض نے اس سما نے لیکن کا ہے کو سُنی اذاں کی آواز
میت کے جرس پہ آہ کب کی کیوں عید یہاں کبھی منائی!
اے بادِ صبا نہ چھیڑ مجھ کو جا پیار کی کوئی تو خبر لا!
اُس دیس کا کوئی میٹھا پیغام ق دیکھوں گا نہ پھر کبھی میں جسکو
جا دیکھ تو میرے دوستوں کو بھولے سے کبھی ہے یاد آتی
بتلا مجھے آکے "تیرا اک دوست ہے تو سہی پر نظر سے اوجھل"!

ہیں کسی کے پوست سے پاؤں کی میری جوتیاں
کھات کھیتوں میں بنیں میرے کسی کی ہڈیاں

جنس گر سمجھے تو ہوں میں جنس کا حاجت روا   نوع گر مانے تو ہوں میں نوع کا مشکل کشا
کہلوا سکتا کوئی رزاق گر بعد از خدا   فصل میری ہی کو استحقاق اس خاصہ کا تھا

قصہ کوتاہ میں وہ ہوں ویران ہوں جسکے بغیر
بزم رزم و شہر و باغ و خانقاہ و شیخ و دیر

کہتے ہیں واعظ کہ تکلیفات ہیں حق کا کرم   اور نشانِ نورِ ایمانی ہیں رنج و یاس و غم
یا الٰہی ایسے واعظ ہوں جہاں سے جلد کم   یا انہیں کو بخش اے نورِ رحمت یک قلم

پر اگر اُن کا کہا سچ ہے تو پھر حق کی قسم
سب سے آگے میں ہی اس گھوڑ دوڑ میں ہوں قدم

ظاہراً سرسبز ہے مثل حنا میری پھبن   ہیں ہزاروں بحرِ خوں باطن میں لیکن موجزن
لالہ ساں ہوں سرخرو پر دل میں ہے داغ محن   صادق آتا ہے مری حالت پہ حافظ کا سخن

بلبلے برگِ گل خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا صد نالہ ہائے زار داشت

میں سبھی کچھ ہوں مگر ہوں صرف اوروں کے لئے   یا زمانہ کے جفاؤں اور جوروں کے لئے
نام ہے سرکار میں میرا پہ غوروں کے لئے   یا کہیں حکام عالیشان کے دوروں کے لئے

جس قدر جزوِ ضروری ہوں میں موجودات میں
اس سے بڑھ کر آفتیں رہتی ہیں میری گھات میں

سرد مہری مہر انور کی کبھی ہریاں تلک   سالہا تک ابر اُٹھتا ہی نہیں سوئے فلک
اُس پہ گرمی اس غضب کی ہو کہ بس اک اک جھلک   خشک کر دیتی ہے خونِ دیدۂ انس و ملک

جن شعاعوں میں کبھی تھا شیر مادر کا اثر

گنج دے اپنے لٹا۔ اپنے خزانے کھولدے | تولدے پانی کے تول اپنے جواہر تولدے
کوڑیوں کی طرح تو ہاتھوں سے موتی رولدے | لاکھ اپنے مُنہہ سی اپنی بیگناہی بولدے

جب یہ ثابت ہی کہ تو جلاد اور سفاک ہے
تیرا دامن خُون کے دھبّوں سے کیونکر پاک ہے

آہ اِک اِک پل میں کتنے خون تو نے کر دیئے | کتنے دریا بُرد دیہات اور قصبے کر دیئے
کتنے دولہا دولہنوں کے غرق ڈولے کر دیئے | کتنے مفقود الخبر تو نے پیاسے کر دیئے

ہر لبِ ساحل پہ ہی فریاد تیری کاٹ کی
آشنایانِ محبت سی بھی تو نے گھاٹ کی

کتنے ایسے بیگناہوں کو ڈبو تو نے دیا | آجتک جنکا نہ پایا رونیوالوں نے پتا
کتنے اُن مردانِ ہمت کو بہا تو لے گیا | ڈھونڈھتا ہے ایک عالم آج جنکے نقشِ پا

کوئی کس کس کو گنائے کوئی کس کس کو گنے
تیری گردن پر زمانے بھر کا ظالم خون ہے

ہم نے مانا شاخ تیری ہر چمن میں جوئے شیر | ہم نے مانا شور تیرا ہر صدا پر حرف گیر
لے اُوڑی منقارِ بلبل تیرا گلبانگ صریر | نغمہ سنجانِ گلستان سب تیرے ہیں ہمصفیر

کوہ کے ہر سنگریزے ہیں ہی تجھ سے زیر و بم
گانیوالوں نے تجھی سے آکے سیکھا تال سم

ہم نے مانا سب ہماری جاہ و ثروت تجھ سی تھی | رونقِ بازار تجھ سے تھی تجارت تجھ سے تھی
تجھ سے آساں تھی سفر سیر و سیاحت تجھ سے تھی | منزلیں طے تجھ سے تھیں قطعِ مسافت تجھ سی تھی

ریل کی ہم کو سواری یاں میسر تھی کہاں
دوڑتی تھیں تیرے سینہ پر ہماری کشتیاں

تھی زمانہ پر حکومت جاری ساری تری | روز رہتی اک نہ اک دھاوے کی تیاری تری

کیا تیز خیال کے قدم ہیں — آندھی کو بھی پیچھے چھوڑتے ہیں
ہے کیسی بلا کی اِس کی پرواز — کرتی ہے سریع نور کو مات ق
دھیان اپنے وطن کا جب ہے کرتا — لمحے میں سمجھتا ہوں وہاں ہوں!
پر ہائے وہ یاد جلد ظالم — واپس مجھے یاس میں ہے لاتی!
چڑیوں نے کیا ہے اب بسیرا — ماندوں میں سباع بھی چھپے ہیں
میرا بھی ہے خواب دار باقی — چل جی تو بھی اپنی کوٹھری میں
ہاں ہر جگہ رحمت خدا ہے — رحمت سے ہی سب کے ہیں جیتے
رحمت ہی بلا کا ہے اُجالا — رحمت ہی رضا کی خُو ہے دیتی

نذیر حسین احمد

دریا

مندرجہ ذیل نتیجہ خیز نظم منشی نادر علیخاں صاحب نادر کاکوروی کے دریائے طبع کی ایک موج ہے۔ منشی صاحب موصوف کا کلام دلگداز میں اور آودھ پنچ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ "نظم پروین" "خواب نوشیں" "گزشتگان سلف" وغیرہ دلچسپ مضامین جنکی نظر سے گذر چکے ہیں۔ اُنکے لئے حضرت نادر سے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم خوشی سے انکی نظم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اور اُمید رکھتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی ہمیں ممنون فرماتے رہینگے:۔

اے عظیم الشان! اے دریائے ناپیدا کنار — خرخرائے جا بہائے جا خس و خاشاک و خار
لا کہیں سیلاب پیدا کر کہیں تو لالہ زار — بن کہیں برق غضب اور بن کہیں ابر بہار
لیکن ان چھینٹوں میں تیرے کوئی آنیکا نہیں
اب یہاں کوئی بھی تجھ کو منہ لگانے کا نہیں

حُرمت خواروں میں تیرے کچھ کاشتکار اب رہ گئے
پُوچھنے والوں میں تیرے کچھ کہار اب رہ گئے

دوڑنے چھاتی پہ تیرے آہنی انجن لگا　　ہو لیا اب ساتھ اُس کے تیرا سارا قافلہ
کارواں تیرا اب اے دریا یہاں سے چل دیا　　ایڑیاں اب تو رگڑتا ہے یہاں پیچھے پڑا

ریل پر اب جاتری کہتے ہیں گنگا جی کی جے
دُور ہی سے تیری پالاگی ہے اور ڈنڈوت ہے

بس تری آغوش میں ہم کھو چکے جانیں بہت　　یاد آئیں گی ہمیں تیری مداراتیں بہت
دیچکیں اب تھپکیاں تیری ہمیں لہریں بہت　　کر چکیں گہوارہ جنبانی تری موجیں بہت

تیری خدمت تیری راحت اب ہمیں تکلیف ہے
اب ہم اپنی راہ جائیں اور تو اپنی راہ لے

یاد رکھ یہ قول بڑھ چلنا بہت اچھا نہیں　　اک نئے طوفاں کی ہر دم ہے گذرگہ یہ زمیں
جو کہ اعلیٰ تر بنا آخر ہوا ادنیٰ تریں　　جو ذرا اُبھرا یہاں اک دن ہوا وہ تہ نشیں

جو اکڑتا اور برتا سر اٹھائے یاں چلا
پہلی ہی منزل پہ ٹھوکر کھا کے سر کے بل گرا

نادر علیخان ۔ نادر

کچکول

تصویرِ صبح

آنے جانے لگی تھم تھم کے نسیمِ سحری　　پاؤں رکھنے لگا بن بن کے ہر اک کبکِ دری
عکسِ اشجار سے پیدا تھی عجب جلوہ گری　　نظر آتا تھا ہر اک سنگ عقیقِ شجری

ہر گڈھی کے ارد گرد اک نہر تھی جاری تیری   شہر کو گھیرے ہوئے تھی چار دیواری تیری

راجدھانی پر تھا پہرہ تیرے ہی عمّال کا

مُلک میں چلتا تھا سکہ تیری ہی ٹکسال کا

بھاگنے والوں کے اکثر پر لگا تو نے دیئے   شہر سے معتوب اور مجرم بھگا تو نے دیئے

شب کو خفیہ ملک پر دشمن چڑھا تو نے دیئے   صبح ہوتے دوسرے سکّے بٹھا تو نے دیئے

میان ہی سے ہر گھڑی تلوار باہر تھی تری

انقلابِ سلطنت بس ایک ٹھوکر تھی تری

لیکن اس قوت پر اپنی زعم تھا اتنا تجھے   سوجھ پڑتا ہی نہ تھا ہرگز حریف اپنا تجھے

ہو چلا تھا شانِ قہاری کا یاں دعویٰ تجھے   تیری نخوت نے ڈبویا آخر اے دریا تجھے

یہ نہ سمجھا تیری معزولی بھی کوئی بات ہے

ایک اِک قطرہ پہ پانی کے تری اوقات ہے

شاعروں نے تجھ سے لی دریا دلی کی گر نظیر   یا پرستش تیری کچھ کرنے لگے ہندو فقیر

اس پر اتنا زعم یہ پندار تجھ کو اے شریر   سارے مخلوقات کو سمجھے ہوئے تھا تو حقیر

کھول کر اب آنکھ اپنا حالِ ابتر دیکھ تو

تیرے اوپر کیا ستم ہے اے ستمگر دیکھ تو

ریل نے آ کر تری کچھ شان و شوکت چھین لی   جو رہی تھی وہ تری نہروں نے وقعت چھین لی

تیری دولت چھین لی تیری تجارت چھین لی   عہد نے انگریزوں کے سب تیری حشمت چھین لی

تیرے گھاٹ تجھ سے کٹ کر ریل سے اب جا ملے

تیرے خواہاں تیرے جویاں نہر سے اب جا ملے

قافلوں اور کاروانوں نے بھلا تجھ کو دیا   رہروانِ منزل کے یاروں نے بھلا تجھ کو دیا

تاجروں غلہ فروشوں نے بھلا تجھ کو دیا   گھاٹ کے سب ٹھیکہ داروں نے بھلا تجھ کو دیا

یہ کیا کہتے ہو تم سے بخت ہو سکتا ہے برگشتہ
مقدر یہ نہیں اپنا کہ جو پھر جائے دم بھر میں

سیّد امیر حیدر بخت اکبرآبادی

باتیں ہیں واعظوں کی عذاب و ثواب کیا — دو دن کی زندگی میں حساب و کتاب کیا

(لالہ سری رام - ایم - اے) — (مائل دہلوی)

اُٹھتی نہ تھی نقاب کہ بیہوش تھے کلیم — حضرت سے سیکھ لے کوئی دیدار دیکھنا
دل ڈھونڈھتا ہے لطف وہی پہلے وار کا — مجھ کو اسی نگہ سے پھر اک بار دیکھنا

(،،) — (،،)

یادِ کوثر میں ہوا شیخ غریقِ رحمت — مے کے پینے کا تو کمبخت میں مقدور تھا

(،،) — (،،)

کن محنتوں سے ہائے بنا تھا یہ قصرِ دل — قسمت میں تھا مری اسے برباد دیکھنا

(،،) — (،،)

پیدا نفس نفس سے ہے رنگ انقلاب کا — ہستی کو غور سے کیجے تو عالم ہے خواب کا
زاہد کو بادہ خواری کا چسکا لگا دیا — یہ کام عمر بھر میں ہوا ہے ثواب کا

(،،) — (،،)

بس شام ہوئی جائیے اے حضرتِ ناصح — اب رات ہے اور ہم ہیں اور افسانہ ہے اسکا
مائل کو غرض کیا ہے کہ جنت کی کرے فکر — کوثر سے کہیں بڑھ کے تو میخانہ ہے اسکا
مائل کو ملا کعبہ میں وہ رتبۂ عالی — کعبہ جسے کہتے ہیں صنم خانہ ہے اسکا

(،،) — (،،)

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا — جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا
سو عکس آئینے میں پڑے اور مٹ گئے — اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا

ڈالیاں جھومتی تھیں وجد میں ہر ڈالا تھا — صاف اک حلقۂ خاتم تھا وہ جو تھالا تھا

طرفہ اس صبح کی تھی شانِ جہاں کی رونق — تھا ہر اک طائرِ حق گو کی زباں پر حق حق

صورتِ ابرِ تنک چرخ پہ کم کم وہ شفق — گرمیِ حسن سے ہر عارضِ گل پر وہ عرق

آتشِ گل سے عنادل کے جگر جلتے تھے — قطرے شبنم کے پسینہ کی طرح ڈھلتے تھے

عام تھا خلق پہ لطفِ کرمِ ربانی — آبشاروں سے رواں چار طرف تھا پانی

چرخِ اخضر تھا جو تھا سبزۂ کوہستانی — گلِ خورشید پہ ہنستے تھے گلِ بستانی

مضطرب تھیں جو ہوا میں دلِ شیدا کی طرح — موجیں سبزے میں نظر آتی تھیں دریا کی طرح

عارف

([illegible])

حکمِ صیاد نہیں ہے کہ چمن میں آئیں — بلبلیں لوٹتی ہیں باغ کی دیواروں پر

سچ تو یہ ہے کیوں نہ زلیخا سے بگڑتے یوسف — ناز کرتے ہیں سبھی اپنے خریداروں پر

نہ بجھی پر نہ بجھی آتشِ رشکِ دشمن — صبح تک شام سے لوٹا کیا انگاروں پر

ضعف نے وحشتِ زنداں سے چھڑایا مجھ کو — ایک پرچھائیں سی پھرنے لگی دیواروں پر

واہ شاعر سا کبھی بھولا نہیں دنیا میں کوئی — آج پھر مان گیا آپ کے اقراروں پر

آغا شاعر دہلوی

بچا کر دامن اپنا آج بسمل سے نکل جاؤ — کہاں جاؤ گے تم دامن بچا کر دیکھیں محشر میں

خبردار آج ہشیاری سے مرغِ نامہ بر اڑنا — کہ خطِ شوق اپنا میں نے باندھا ہے ترے پر میں

جگہ دوں خانۂ دل میں بچھاؤں ہر قدم آنکھیں — خدا وہ دن تو دکھلائے کہ تم آؤ مرے گھر میں

کروں ثابت الٰہی کس طرح اپنی محبت کو — دل اپنا ڈال دوں کیونکر دلِ بے مہرِ دلبر میں

نہ لکھا مٹ سکا لوحِ جبیں کا دستِ صنعت سے — رہا خطِ شکستِ آئینہ بختِ سکندر میں

ہمارے خانۂ دل میں وہ دلبر جلوہ فرما ہے — عبث کیوں گھر بگھر ڈھونڈیں کہ وہ موجود ہے گھر میں

نالے بدن کو توڑ کے نکلے بِزنگ سے نے
(محمد اقبال)
مُنہہ بند کیا ہوا میں سراپا دہن ہوا
(امیر مینائی مرحوم)

اور ہی کچھ بن گئی تو خانۂ صیاد میں
یہ اثر آ سکے گا نہ تھا بلبل تری فریاد میں

پر مرے ٹوٹے ہوئے اُڑ جائیں سب سُوئے چمن
ایسی آندھی آئے یارب خانۂ صیاد میں

ہے یہی ذوقِ اسیری تو اسیری ہو چکی
مَیں نہیں بھولا سمانے کا کفِ صیاد میں

میرے دل سے کوئی پوچھے داغِ دل کے مزے
لُطف تھا دونو جہاں کا اک جہان آباد میں
(،،)
(داغ)

کرینگے درہم و برہم خُدا کے کارخانے کو
(علمدار حسین)
بنایا ہے بتوں نے اپنا بندہ اک زمانے کو
(غضنفر)

یہ مصرع لکھدیا ظالم نے میرے لوحِ تُربت پر
جو ہو فرقت کی بےتابی تو یُوں خوابِ گراں کیوں ہو

خُدا شاہد! خُدا شاہد! ہر اک فقرہ پہ کہتے ہو
خُدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو

دکھایا کُنجِ قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں مَیں کہاں کہاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو قید کرتا ہے
قفس کو لیکے مَیں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد

کب کیا قید سے صیاد نے آزاد مجھے
طرزِ پرواز بھی جس دم نہ رہی یاد مجھے

ہشیار کہ وقتِ سازو برگ آپہنچا
ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آپہنچا

محتاجِ عصا ہوا تو پیری نے کہا
چلئے اب چوبدارِ مرگ آپہنچا
(،،)
(میر انیس)

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروّج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

[illegible] کرزن صاحب بہادر بالقابہ کی بےنظیر اور لاجواب
کتاب کا ترجمہ۔ بامحاورہ اردو میں۔

اس کتاب کا (جو سرزمین ایران کے نئے اور پرانے حالات
کا ذخیرہ ہے۔ اور لاٹ صاحب موصوف کی سیاحی کا نتیجہ ہے)
مسٹر ظفر علیخان بی۔ اے نے جو علیگڈہ کالج کے گریجوایٹ
ہیں۔ باجازت حضور وائسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند
ترجمہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اس ترجمہ کو جو موسوم بہ خیابان
فارس ہے۔ ہز ہائینس حضور نظام والی دکن کے نام نامی پر
معنون کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی ہے۔ یہ بسیط
کتاب چار جلدوں میں تمام ہوگی۔ پہلی جلد با تصویر
جسکے صفحے چار سو کے قریب ہونگے زیر طبع ہے۔ اور مارچ ۱۹۰۲ء
کے اختتام تک تیار ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگی۔

قیمت مجلدات اعلیٰ کاغذ پر دستخط جلد سکے	قیمت دوسرے قسم کے کاغذ پر اچھی جلد کے دستخط
پیشگی پندرہ روپیہ	پیشگی آٹھ روپیہ
مابعد بیس روپیہ	مابعد دس روپیہ

خریداروں کو پیشگی کی رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے درخواستیں
مع نقد قیمت بنام مترجم بھیجی جانی چاہئیں۔

المشتہر ظفر علیخان بی۔ اے [illegible]

[illegible]

انگریزی زبان میں

چھ دلچسپ مضامین کا مجموعہ

جنمیں

شیخ عبدالقادر بی۔ اے نے اردو لٹریچر کی ترقی
کی ضرورت کی بابت بحث کرنے کے بعد شمس العلما
مولانا حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی۔
شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد۔
مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی۔
پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار۔ اور
مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی تصنیفات
پر تنقیدیں لکھی ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں کہ جن کے
چھپنے پر ملک بھر کے انگریزی اور اردو اخبارات
میں بہت قدردانی کے ریویو لکھے گئے اور جن کو
ملک میں بہت کچھ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔
بہت جلدیں بک چکیں تھوڑی سی باقی ہیں۔

قیمت فی جلد ۱۲؍ درخواستیں مع نقد قیمت
یا باجازت وی پی بھیجی جائیں۔

المشتہر محمد علی۔ مینیجر [illegible]

مخزن

علم تعلیم

عموماً ہر قسم کی محنت اور ہر ایک کام کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروریات سے ہے۔ اوّل علم یعنے اصولوں سے واقفیت۔ دوم ہنر یا مشق۔ مثلاً نقاشی۔ موسیقی۔ کفش دوزی وغیرہ پیشوں میں علم یا واقفیت تو سیدھی سادی ہوتی ہے اور آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر ہنر یا مشق بہت دنوں کی لگاتار محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور بعض کام ایسے ہیں جن میں صرف مشق کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً تیرنا کُشتی لڑنا وغیرہ۔ ان کاموں میں علمی واقفیت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن برخلاف اس کے بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن میں علم اور مشق دونوں یکساں درکار ہوتے ہیں اس قسم کی عمدہ مثال سرجری یا فنِ جرّاحی ہے۔

ہنر یا مشق کی ایک حد ہوتی ہے لیکن علم کی حد نہیں۔ چنانچہ جب ایک عمدہ سرجن مرجاتا ہے۔ تو اُسکا ہنر اُسکے ساتھ ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا علم اور اس کی واقفیت اُس کے جانشینوں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے واسطے رہتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ علم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ برخلاف اِس کے ہنر وہیں کا وہیں رہجاتا ہے۔ علم کی فضیلت سے اکثر پیشوں میں بہت کچھ نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اِن کی ابتدائی حالت اور موجودہ حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ بعض لوگ تعلیم کے بارہ میں

مخزن کا دُوسرا سال

خُدا کی عنایت سے مخزن نے اپنی عُمر کا پہلا سال ختم کیا۔ اس سال میں اسکی جو قدردانی ملک کے ذی رُتبہ۔ باکمال اور بامذاق اصحاب نے کی ہے۔ اور اسکو رونق دینے کے لئے جو جو کوششیں محض شوقِ سخن کی وجہ سے اور بغیر ایڈیٹر کے ساتھ سابقہ مُلاقات اور تعارفِ ذاتی ہونے کے بعض بزرگوں نے کی ہیں اُنکا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے ہم آئندہ سال کے لئے بہ نسبت اُن امیدوں کے جنکے ساتھ ہم نے اس رسالہ کو جاری کیا تھا زیادہ توقعات رکھتے ہیں۔ گو یہ جتانا ہمارا فرض ہے کہ ایسا پہلی اُمیدوں میں بھی کسی قسم کی مایُوسی نہیں ہُوئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس رسالہ کو روز بروز زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنائیں۔ اور دیگر امُور کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ اس کا حجم بھی بڑھا دیں۔ بہت بزرگوں نے یہ رائے دی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی رائے دی ہے کہ قیمت میں بھی اضافہ کر دیا جائے۔ مگر سر دست قیمت بڑھانا نامناسب سمجھکر ہم اپنے قدردانوں کا شکریہ اس صُورت میں ادا کرتے ہیں کہ اپریل آئندہ سے رسالہ میں آٹھ صفحہ اور بڑھا دیئے جائینگے اور قیمت وُہی رہیگی جو اب ہے۔ گویا بمعہ سرورق بجائے ۵۲ صفحہ کے ساٹھ صفحہ کا رسالہ شائع ہوا کریگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کے معاونین اور بہی خواہ اس عزم میں ہمارے معین و مددگار ہونگے اور جو زائد مصارف پڑینگے۔ اُنکی تلافی زیادہ خریداروں سے کر دینگے۔ اگر ہر خریدار ایک خریدار اور مہیا کرنے کی کوشش کرے تو کچھ ایسی مشکل بات نہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن خریداروں کا چندہ تمام ہو چکا ہے۔ اُنکے پاس اپریل کا پرچہ وی پی پہنچے گا۔ وصُول کر کے مشکور فرماویں۔ بصورت آئندہ خریداری بند کرنے کے قصد کے ۱۵ اپریل سے پیشتر اطلاع بخشیں ٭

ہے کہ اگر علمی واقفیت کے معنے کسی شئے کی اصلی ماہیت کے لیں تو اس سے کوئی عملی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً فرض کرو کہ سب لوگ آنکھ کی ساخت اور روشنی کے موجزن ہونے کا حال غور سے پڑھ لیں تو اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ انکو عینکوں کی ضرورت نہ رہے۔ اور ان کی خریداری کے بوجھ سے رہائی پائیں۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے شک اس صورت میں عینکوں کی بکری میں تو فرق نہ آئیگا۔ لیکن اگر سچ پوچھو تو عینکوں اور علم نظر کے دیگر نہایت قیمتی اوزاروں کی ایجاد کا باعث روشنی کی علمی واقفیت ہے نہ کہ تجربہ۔ اسی طرح تعلیم کے باب میں بھی علمی واقفیت کی بدولت بڑے بڑے نتیجے اور عملی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ مدرس کو جو علمی اور عملی واقفیت ضروری ہے اس سے کیا مراد ہے۔ علمی واقفیت میں وہ تمام واقفیت شامل ہے کہ جو مدرس اپنے کام کی نسبت حاصل کر سکتا ہے۔ اور عملی واقفیت خاص کام سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس سے وہ مسائل مراد ہیں جن سے کہ یہ کام بخوبی انجام پا سکتا ہے۔

مندرجۂ ذیل چند مسائل بطور ہدایت اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ مدرس انکو غور سے پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔

(۱) تعلیم اور تادیب دونوں ساتھ ہوں۔

ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مدرس کا بڑا فرض یہ ہے کہ بچوں میں جو ذہنی اور اخلاقی قوتیں موجود ہیں۔ انکی تادیب کرے۔ یعنے انکی طبیعتوں پر زور ڈالکر ان قوتوں سے کام لے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات عموماً کسی قدر صرف تعلیم یا واقفیت کے ذریعہ بھی عمل میں آسکتی ہے لیکن جن طریقوں سے لائق اور نالائق مدرس اس واقفیت کو پیدا کرتے ہیں ان میں بڑا فرق ہے۔

لائق مدرس جو باتیں اور حقیقتیں اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔

علم اور فن کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اُنکا خیال ہے کہ جس شخص کو کوئی مضمون آتا ہو وُہ کامیابی کے ساتھ اَوروں کو تعلیم دیسکتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال اُنکا محض غلط ہے کوئی اُستاد مطلوبہ نتیجہ اپنے شاگردوں پر مترتب نہیں کرسکتا جب تک کہ وُہ خود اس معاملہ میں بخوبی غور نہ کرلے۔

دراصل وُہ مسئلہ جو اُستاد کو حل کرنا ہے یہ ہے۔ کہ اُسے کس طرح اپنے شاگردوں کو تعلیم دینی چاہیئے۔ اور کیونکر کوئی بات وُہ اُنکے ذہن نشین کرسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم جاننے والے مُدرّس سے ہماری کیا مراد ہے۔ واضح ہو کہ طریقۂ تعلیم جاننے والا مدرّس وُہ کہلاتا ہے کہ جس نے صرف تعلیم دینے ہی سے تجربہ حاصل نہ کیا ہو بلکہ عِلم تعلیم کا غور سے مطالعہ کرکے اس کی نسبت علمی اور عملی واقفیت بھی حاصل کی ہو۔

علمی واقفیت سے یہ مراد ہے کہ اُس شئے کی اصلی ماہیّت اور صحیح صحیح حقیقت معلوم ہو۔ نہ کہ اُس شئے کی نسبت ہمیں ایک خیال پیدا ہوجائے۔ اگر علمی واقفیت کے معنے صرف خیال یا قیاس کے لئے جائیں تو اِسّے اکثر اصل حقیقت بالکل مخفی ہی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک قسم کا نقصان عائد ہوتا ہے۔ مثلاً مَیں بیمار ہُوں اور ڈاکٹر مجھے دیکھنے کے لیئے آیا اور اُس نے میری بیماری کی نسبت ایک غلط رائے بنالی تو ظاہر ہے کہ مجھے اس سے فائدہ تو ہرگز نہیں پہنچ سکتا بلکہ بجائے فائدہ کے نقصان پہنچنے کا بہت بڑا احتمال ہے۔

پس ضرور ہے کہ ہر ایک مدرّس کو اپنے پیشے کی واقفیت ہو۔ اگر مدرّس کسی مضمون کو محنت اور جانفشانی سے بنظر غور نہ دیکھیگا اور چاروں طرف سے ممکن الوقوع روشنی میں نظر نہ ڈالیگا تو اس کی واقفیت اس مضمون کی نسبت ادھوری اور نامکمل ہیگی بلکہ ممکن ہے کہ وُہ تعصّب سے بھری ہوئی اور یکطرفہ یا جزوی اور غلط ہو۔ اس موقع پر یہ اعتراض ہوسکتا

نہیں - حال ہی ہمیشہ موجود رہتا ہے -

بچوں میں اس قدر عقل نہیں ہوتی کہ عاقبت اندیشی کا فکر کریں - یہ بات ابتدا میں اُن میں پیدا نہیں ہوسکتی - رفتہ رفتہ زمانہ پاکر آیندہ کی بہبودی کا خیال انکے دلوں میں مرتسم ہوا کرتا ہے - پس اس ابتدائی حالت میں اُنکو ہر طرح کی نیاب تحریک اور تحریص سے کار تعلیم میں مصروف رکھنا چاہیئے -

(۳) ضبط اور ترتیب لازم ملزوم ہیں -

جہاں ایک طرف سکول اور جماعت کا ضبط انتظام مدرسہ کی بُنیاد ہے - دُوسری طرف مدرس کے ذہن میں جو خیالات ہوتے ہیں اُنکی ترتیب اور درستی بھی ضروریات سے ہے یہ جو ایک مثل مشہور ہے کہ سُست آدمیوں کو نہایت تکلیف اور مشقّت اُٹھانی پڑتی ہے دُوسرے پیرایہ میں اس کو ہم اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ کم لیاقت لوگ یعنے ایسے شخص جنکے خیالات قرینے سے صاف طور پر دماغ میں جمے ہوئے نہیں ہوتے اور وُہ ضبط و ترتیب کا خیال نہیں رکھتے اُنکو نہایت مشقت گوارا کرنی پڑتی ہے - اور بہت سے وقت میں نہایت تھوڑا کام کرسکتے ہیں -

(۴) کام تھوڑا ہو پر اچھا ہو -

یعنے کمیّت کی نسبت کیفیت کا زیادہ خیال رکھو اس سے آخر میں کامیابی کی زیادہ اُمید ہوتی ہے - اگر نوجوان مدرس اس بات کو خیال میں رکھے کہ اُسے اپنے مطالعہ میں ایک بات کو یاد رکھنے کے لئے کسقدر بار بار دُہرانے کی ضرورت ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ وُہ مبتدی بچوں کو اناپ شناپ بتا کر بغیر یاد کرائے آگے چلنا پسند کرے اور اُسے معلوم ہو جائیگا کہ یہ مقولہ یعنے خط پر خط نصیحت پر نصیحت کامیابی کا ایک بڑا جزو ہے - سنگتراش جو پتھر پر نقش کرتا ہے جس قدر زیادہ گہرا کھودتا ہے اسی قدر اسکا نقش دیرپا اور پائدار ہوتا ہے اور جُوں جُوں ہتھوڑے کی چوٹ لگتی جاتی ہے اس میں اَور بھی پختگی آتی جاتی ہے -

انہیں کے دماغ سے نکلوانا ہے اور نالائق مدرّس خود انکو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر اندھا دُھند اُن باتوں کی طرف لیجاتا ہے۔ مثلاً ایک ناقابل مدرّس جماعت کو حیوانات کی خاصیتیں اِس طرح بتائیگا کہ خود اُنکے سامنے یہ خاصیتیں سلسلہ وار بیان کر دیگا۔ اور برخلاف اِسکے ایک لائق اُستاد اِس طرح سے تعلیم دیگا کہ جماعت خود بخود مشاہدے سے وُہ خاصیتیں بیان کر دے جن سے حیوانات کو معدنیات اور نباتات سے تمیز کر سکتے ہیں۔ اگرچہ آخر کار ہر دو حالتوں میں وُہی خاصیتوں کی ایک فہرست مرتب ہو جائیگی۔ لیکن ایک حالت میں تو صِرف یاد کرنے کی محنت ہوگی اور دُوسری حالت میں عقل اور ذہن پر زور پڑے گا۔ سوچ سمجھ کر خود نکالنا ہوگا جسّے طبیعت میں شوق اور اُمنگ پیدا ہوگی۔

علاوہ اِس کے جب ایک بچّے سے یہ کہا جائے کہ تمہیں یہ کرنا چاہئے وُہ کرنا چاہئے اِسے فقط سکھانا کہتے ہیں۔ لیکن اگر اُسے کسی کام کے کرنے کا طریقہ بتا یا جائے تو گویا اُس میں علم و عمل کے ذریعے ایک نئی قابلیت پیدا کرنا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نصیحت سے عمل اچھا ہے۔ کیونکہ عمل کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) رشک پیدا کرنا کامیابی کا ذریعہ ہے۔

بچّوں سے خوشی خوشی زیادہ کام لینے کے لئے ضروری ہے کہ اُستاد اُن میں ایکدوسرے پر فوقیت لیجانے کا شوق پیدا کرے۔ اُنکی طبیعتوں کو اُکساتا رہے اور باہمی رشک سے اُن میں محنت کرنے کے لئے سرگرمی اور جوش پیدا کرے۔ یہ جو مشہور ہے کہ علم اپنا صلہ آپ ہے صِرف انہیں معنوں کے لئے ہے کہ صلہ اصلی ہو اور اِس سے خوشی پیدا ہو۔ اُستاد خوشنودی ظاہر کرے عموماً جماعت بھی خوش ہو اور خود بچّے کو بھی خوشی ہو کہ میں نے درحقیقت اچھا کام کیا ہے۔ یاد رکھو کہ بچّے کو یہ یقین کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ آئندہ کی بہبودی اسوقت کی کوشش اور محنت پر منحصر ہے۔ بچّے کے نزدیک جو کچھ ہے حال ہی کا زمانہ ہے اور تم اُسکی اس ذہنی خاصیت کو بدل نہیں سکتے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ آئندہ اور ماضی کچھ بھی

دُنیا میں تلاش کر کے طلبہ کے روبرو پیش کرے - بچّوں کی طبیعتیں دنیا کی بیرونی چیزوں کی طرف ہمیشہ رجُوع ہوتی ہیں لیکن دلائل کی طرف اُنکی طبیعتیں مائل نہیں ہوتیں بلکہ دلیلوں سے اُنکا جی اُکتا جاتا ہے -

(۸) جماعت کی استعداد کا خیال رکھو -

مدرّس کا فرض ہے کہ جیسا دیکھے ویسا بن جائے - یعنے جب وُہ چھوٹے بچّوں کو تعلیم دے تو اپنے بچپن کا خیال سامنے رکھ لے یعنے اس طرح بیان کرے کہ اُن کی سمجھ میں آجائے - اور جب اعلےٰ جماعت کو تعلیم دے تو ظاہر ہے کہ وُہ اُنکو چمچہ میں دُودھ نہیں پلا سکتا - یعنے اس موقع پر تعلیم دینے کے لئے بڑی عقل اور سمجھ درکار ہے -

(۹) جماعت کی آنکھ اور کان سے کام لو -

حواس عقل کے دروازے ہیں - پس جب دو راستے کھُلے ہوں تو کامیابی کی زیادہ اُمید ہوسکتی ہے - بہ نسبت اس کے کہ ایک رستہ کھلا ہوا ہو - اسّے یہ مراد ہے کہ مدرّس تختہ سیاہ سے برابر کام لے اور تلفّظ اور طرز بیان درست کرنے کے لئے زبانی مدد بھی دے -

(۱۰) خیالات کا ظاہر کرنا سکھاؤ -

جب جماعت کو ایک بات بتا دی گئی تو یہ صرف آدھا کام ہوا - ابھی یہ سکھانا باقی ہے کہ طلبا خود اس کو کس طرح ظاہر کریں - اِنسان ایک تنہا حیوان نہیں ہر کہ اُسکے لئے صرف جاننا ہی کافی ہو بلکہ وُہ اپنے ہمجنسوں سے تعلّق رکھتا ہے اور اُن میں سے ایک ہی - اِس لئے ضرور ہے کہ وُہ اپنے علم کا اظہار کر سکے - گونگا آدمی اپنے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتا - پس مدرّس کو چاہیئے کہ جس بات کو جماعت خوب جانتی ہو فرداً فرداً طلبا سے اس بات کو بیان کرائے اور جہاں تقریر میں نقص پائے اِصلاح کرتا جائے - اور خود اسکے مقابل میں صحیح پیرایہ بنا کر دکھلائے - اور یہ یاد رہے کہ فصاحت بہت کچھ خوض کرنے کے بعد آتی ہے -

لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ بار بار دوہرانے سے طبیعت پر گران پیدا ہو اور چبائے ہوئے نوالے کو چبانے سے مضمون بے لطف معلوم ہو۔

(۵) معلّم اور متعلّم دونو دل سے کار تعلیم میں شوق سے مصروف ہوں۔ اسّے یہ مُراد ہے کہ جس کام میں مصروف ہوں۔ اس میں اُستاد اور شاگرد صدق دل سے ایسا جوش اور شوق ظاہر کریں جیسا کہ ایک نیک اور محنتی آدمی کا فرض ہوتا ہے۔ دیکھو مزدور جب ایک سخت اور مشقت کے کام میں لگے ہوتے ہیں کیسے خوشی کے نعرے مارتے ہیں گو وُہ کام اُنکی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ مگر اس طرح انکو ذرا بھی بار معلوم نہیں دیتا۔ اور بنسی خوشی بہت جلد اُسکو پُورا کر لیتے ہیں۔ غرضکہ ہمیشہ اپنے فرض کو کمال شوق سے ادا کرنا چاہیئے اور ادائے فرایض متعلقہ میں ایمانداری اور جانفشانی کو اپنا فرض سمجھیں اور فرض ادا کرنے میں اپنی سچی خوشی سمجھیں ؎

کرو وُہ جو اس دم ہے پیش نظر
نہ دو دھیان تم دُور کے کام پر
تو جی میں یہ ٹھانو کہ کر کے ہٹے
کسی کام پر ہو اگر تم ڈٹے

(۶) صاف صاف بیان اور تشریح اور تلفظ کا ادا کرنا ضروری امور ہیں۔ چونکہ مدرس کا بڑا کام یہ ہے کہ قوتِ بیان کو بڑھائے اور زبان کی واقفیت کو رفتہ رفتہ زیادہ کرتا جائے۔ پس جب تک کہ صاف صاف صحت تلفظ کے ساتھ ہر ایک بات کو نہ بیان کیا جائیگا معلّم اور متعلّم دونو طرف سے یہ بات ظہور میں نہ آئیگی۔

(۷) بہت سی عُمدہ عمدہ تمثیلوں سے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔

تمثیل سبق کی جان ہے۔ عُمدہ تمثیلیں بمنزلہ دریچوں اور کھڑکیوں کے ہوتی ہیں جنکے ذریعے سے کسی مضمون کی واضح طور پر تشریح کر کے اُسپر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مدرس کو اپنا وقت اور توجہ اس بات پر صرف کرنی چاہیے کہ جو حقائق صادقہ جن چیزوں کے ذریعے وُہ اپنے شاگردوں کو سکھانا چاہتا ہے۔ انکی تصویریں اور نمونے اس

گُناہ

اک مغربی مُہذب کا مقولہ ہے جس کے معنے ہماری زبان میں یہ ہو سکتے ہیں کہ "گُناہ بُرائی کا بادل ہی جو بربادیوں سے لبریز ہے"۔ الحفیظ! الامان! اگر ان لفظوں میں کچھ سچائی ہے۔ اگر اس فقرے میں کوئی حقیقی خوفناک اثر ہے۔ اگر دیکھنے سُننے والے کی نگاہیں اور کان واقعی طور سے غور و فکر سے ادھر متوجہ ہیں تو اس میں ذرا شک نہیں کہ ضرور رونگٹے کھڑے ہو جائینگے۔ دِل لرز جائیگا۔ کلیجہ کانپنے لگیگا اور ندامت کا پسینہ ماتھے پر ہوگا۔ اے گنہگار دِل! میں تجھ سے پُوچھتا ہُوں کیا تو ماں کے پیٹ سے ایسا ہی پیدا ہوا تھا؟ نہیں نہیں اُس عالم کا مجھے یُوں ہی سا خیال کبھی کبھی آجاتا ہے تو اک نورانی آئینہ تھا تو اک لہلہاتا ہوا کنول تھا۔ تجھ میں سیاہی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ تو پنکھڑی سے زیادہ ہلکا۔ حباب سے زیادہ نازک تھا اور تجھ میں سے بہشت کے پھُولوں کی خوشبو آتی تھی۔ ہائے جب میں پنگوڑے میں لیٹا ہوا انگوٹھا چوسا کرتا تھا۔ وہ گھڑی انگنائی۔ گرمیوں کی راتیں۔ اور وُہ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی (چاندنی) کا آپ ہی آپ میری ایک ہی جگہ ٹک جانیوالی نگاہوں میں گھُل مِل جانا۔ میرے سر پر جو ایک نیلی سی چھت (آسمان) ہوتی تھی۔ اُس میں سفید سفید ہزاروں لاکھوں بلکہ اَن گنت چمکتی ہوئی چیزیں (تارے) پھرا کرتی تھیں۔ وُہی ٹھنڈی ٹھنڈی سُنہری چیز جو ایک گول گول زرد زرد گل تکئے (چاند) میں سے آتی تھی اُس سے میں پہروں کھیلا کرتا تھا۔ میں بہتیرا ٹمک ٹمک کر اپنے ننھے ہاتھ بڑھاتا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے بھی کھینچکر اپنے چھوٹے چھوٹے تکیوں میں ملالُوں لیکن نہیں وُہ مجھ سے بہت دُور ہوتا تھا اور میرے ہاتھ نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی نرم نرم چیز (ہوا) ایکا ایکی میرے پاس آجاتی تھی میرے جھنڈولے بالوں کو پریشان کر دیتی تھی میرا ننھا سا کُرتا اُڑنے لگتا تھا

(۱۱) اختراع اور ایجاد کو فروغ دو۔

ہر ایک پیشے کا سب سے بڑا جزو ایجاد ہے۔ مثلاً نقّاشی۔ سنگ تراشی۔ شاعری اور فصاحت وغیرہ۔ ہر ایک کمال کی زینت ایجاد ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ایجاد تعلیم کا بھی ایک اعلےٰ جزو ہو۔ جہاں ایک طرف عام لوگوں کو فقط یہی نظر آتا تھا کہ ایک دیگچے میں پانی اُبل رہا ہے دوسری طرف ایک شخص کو یہ نظر آیا کہ یہ ایک دُخانی کل ہے۔ پس مدّرس کو لازم ہے کہ خود تمثیلیں دیتا رہے اور مشابہت اور فرق معلوم کرتا رہے۔ اور نیز جماعت کی طبیعت کو بھی اس بات کی طرف راغب کرے۔

(۱۲) پچھلی تعلیم کو خلاصہ کر کے دوہراؤ۔

جب تک کہ سبق کے کل رشتوں کو اکٹھا نہ کر لو اور تمام مضمون کو ایک مختصر نظر سے نہ دوہرا لو اپنی تعلیم کو مکمل نہ سمجھو۔ کُل سبق کا خلاصہ ضروری ہے کیونکہ کُل چیز بہیئتِ مجموعی یاد رہیگی اور بچے کے ذہن میں سما جائیگی +

م۔ ل۔ (ایم۔ اے)

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ ۔۔۔ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی ۔۔۔ نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت ۔۔۔ جو چاہو کریں لوگ عزّت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے ۔۔۔ نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتسابِ شرافت ۔۔۔ نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دُنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

(حالی) (ناظم)

شہ دینی شروع کی۔ مجھ پر اس پیار اخلاص اور دھوم دھام نے اُلٹا اثر کیا۔ اب میں ضرورتاً اپنی جان چھڑانے کے لئے چغلیاں کھانے لگا۔ جھوٹ بولنا آگیا۔ ایک کی دو اور دو کی چار اِدھر کی اُدھر لگانی سیکھیں اور آئے دن نئے سبق کے بدلے مختلف چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سبق حفظ یاد کر لئے۔ بُرے کھیلوں کی طرف رغبت۔ اچھی باتوں سے نفرت۔ محلّے کے رزیل بچّوں سے گالی گلوچ۔ اپنی بریّت کے لئے جھوٹی جھوٹی قسمیں۔ حیلے بہانے پہروں گھر سے غیر حاضر رہنا سیکھا۔ بزرگوں نے گو اس پر اکثر توجہ کی سزائیں بھی دیں۔ نیک صحبت نیک راہ چلانا چاہا مگر ابتدا اگڑ چکی تھی ؎

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست

نرود جُز بوقتِ مرگ از دست

گناہ کی لت جو خمیر میں سرائت کر گئی تھی اب کب چھٹتی تھی۔ پہلے روپیہ پیسہ خاطر خواہ ملتا تھا اب تا دیّا ہاتھ کھینچا جانے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے قرض چوری دغا بازی فریب کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اسی طرح جوان ہُوا تو بے ایمانی ظلم ناعاقبت اندیشی نخوت شرارتیں میرے ساتھ جوان ہوئیں۔ بے ادبی جہالت بدمستی اور بُری صحبتوں سے تو دلی لگاؤ تھا ہی۔ تھوڑے ہی دن میں پنج عیب شرعی کے علاوہ دُنیا بھر کے بُرے فعلوں میں طاق ہو گیا اور ہر گناہ کے لئے مجھ میں ایسی حیرت ناک جُرأت خود بخود پیدا ہو گئی کہ ایسی کبھی میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

محنت مشقت کس جانور کا نام تھا۔ آپ سے آپ موٹا مشٹنڈا ہونا چاہیے تھا چنانچہ جوانی کے زور بل کو حظِ نفس۔ مطلب براری۔ دھینگا مُشتی اور ہشت مشت میں صرف کیا۔ رفتہ رفتہ شورہ پشتی اختیار کی اور اِک اچھے خاصے جتھے کا سرغنہ بنگیا۔ اب کیا تھا کڑوا کریلا نیم چڑھا وُہ اور بھی کڑوا ہو گیا اب گناہوں کی کیا کمی تھی جو وقت چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا کر بیٹھتا تھا۔ خوفِ خدا میرے دل میں سے اس طرح اُڑ گیا

اور بے اختیار میری آنکھیں بند ہوجاتی تھیں۔ بہت سی آوازیں میرے کانوں میں آیا کرتی تھیں مگر میں اپنی دُھن میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی کی ایک نہ سُنتا تھا۔ میری پاک دُنیا وہی تھی میری سچی خوشی کا وہی زمانہ تھا میری بادشاہت کی وُہی گھڑیاں تھیں اور اس زمانے میں او آستین کے سانپ (دل) تو مجھے کیا بھلا معلوم ہوتا تھا؟ اس کے بعد میرا دودھ بڑھا میں گھٹنیوں چلنے لگا اور مجھے ضدیں کرنی آگئیں۔ آہ اے کافر دل)! بس یہ ابتدا تھی میرے گناہ کی۔ پہلا گناہ جس کی مجھے عادت پڑنی شروع ہوئی وہ میری پیاری ماں کی نافرمانی تھی۔ وُہ مادرِ مہربان جو ہمیشہ آپ گیلے میں سوتی اور مجھے سُوکھے میں سُلاتی تھی کڑوی کسیلی ثقیل چیزیں کھانے پینے کو منع کرتی تھی اور میں ضدیں کرتا تھا۔ مچلتا تھا۔ روتا تھا کہ نہیں میں تو یہی کھاؤنگا۔ وُہ عفیفہ مکرمہ مجھ کو بیماری کے خوف ہوا زدگی کے خیال سے پانی سے نہیں کھیلنے دیتی تھی۔ گود سے نیچے نہیں اُتارتی تھی اور میں بےشرم بے حیا نافرمان اُس کی ایک نہ سنتا تھا۔ اُس کے حقوق سب بھلا دیئے تھے۔ زبردستی اُترتا تھا کیچڑ میں کھیلتا تھا۔ کپڑے سان لیتا تھا اور جو چیز پاتا تھا منہ میں ڈال لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ وُہ ممنوع باتیں میری عادت بنگئیں اور شفیق ماں باپ نے لاڈلے بچّے کی ہر تقصیر سے چشم پوشی کی۔ افسوس صد افسوس یہ چشم پوشی ہی کرنی عین نقصان تھی وُہی عادتیں بڑھتے بڑھتے گناہوں کی شکل پیدا کرنے لگیں۔ ایک سے دو اور دو میں سے چار شاخسانے پیدا ہوگئے اور اس شفاف دل پر جو فطرت نے اپنے نُور سے مجلّا کرکے مجھے دیا تھا بدنما سیاہی کی جھلکیاں بھی نمودار ہونے لگیں۔ گو اس وقت اس تغیر کے سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا مگر رفتہ رفتہ محسُوس کرنے لگا۔ کسی قدر بڑا ہوا تو مجھے ادب آداب کی تربیت ہونے لگی۔ لکھنا پڑھنا شروع ہوا۔ منت مرادوں کی بھرمار تو پہلے ہی سے تھی اللہ آمی (آمین) پیر سلامی تو ایک مدت سے ہو رہی تھی اب اُستاد رکھے جانے لگے نئے نئے چاؤ نئے نئے ارمان۔ دو سے چار آنکھیں ہوگئیں۔ اور ان مدارج نے مجھے اور بھی

توڑ ڈالیگا - آہ اُس وقت میں سخت پریشان ہوجاتا تھا - بھونچکا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے مگر کوئی کہنے والا انسانی صورت میں نہیں دکھائی دیتا تھا اور میں پھر اپنی عادت کے موافق گناہوں کی لمبی چوڑی فہرست میں جسے لکھتے لکھتے لکھنے والا بھی عاجز آگیا ہوگا اِک اور اضافہ کرنا چاہتا تھا اور پھر مجھے وہی صدائے مہیب آنے لگتی تھی جس سے کبھی کبھی میرے تن بدن میں رعشہ بھی ہوجاتا تھا مگر افسوس ہے کہ کہنے والا تو گناہ کے اختتام تک برابر اسی لب و لہجے میں مجھے ملامت کئے جاتا تھا اور میں مساوات میں پڑکر اُس کی پروا نہیں کرتا تھا - یہاں تک کہ آخر وہ ٹلنے والی گھڑی وہ انمٹ ہونی شُدنی - وہ جس سے برسنٹ ہرشاہنز کے بعد دنیا میں ایک بڑی تعداد جانداروں کی اپنے قالب چھوڑ دیتی ہے گدا سے لیکر شہنشاہ تک جس سے عاجز ہیں اور جس نے گذشتہ سنہ ۱۹۰۱ء میں جنوری کی ۲۲ ویں کو شام کے سات بجے کچھ منٹ پر قیصرہ ہند ملکہ معظمہ کو باوجود کروڑہا جانوں پر قابض ہونے - دنیوی اعتبار سے جواہرات میں تلنے ہزارہا میل مربع تر و خشک پر حکمران کہلانے اور منتخب روزگار ڈاکٹروں کی موجودگی کے بھی ایک پلک مارنے نہ دی (موت) میرے سر پر بھی آگئی - اب میری آنکھیں کھلیں کہ میں کون تھا - کس لئے بنایا گیا تھا اور میں نے یہاں آکر کیا کیا - آہ! میرے دوستو! یہ آخری لفظ اب میری زبان سے نہیں ادا ہوتے - میرے وہ عمر بھر کے رفیق جن کے بھروسے اور قوت پر جن کے خوش رکھنے اور آرام دینے کے لئے جن کی زیبائش کے واسطے جنہیں تر و تازہ رکھنے کی غرض سے تمام بداعمالیوں کی پوٹ میں نے اپنے سر پر رکھ لی تھی ایک ایک کرکے مجھ سے جدا ہونے لگے اور مجھے پاداش اعمال کے لئے تنہا چھوڑ دیا آنکھیں بے نور ہوگئیں - کان بہرے ہوگئے - ہاتھ پاؤں سست پڑگئے - حواس جاتے رہے دم رکنے لگا اور کسی نے سر سے لیکر پاؤں تک رگ رگ میں سے سانس نکال لیا - اب وہ ظالم اور وہ میرے اپنے ہاتھوں کے بوئے ہوئے کانٹے یعنی وہی شرمناک عبرت انگیز

جس طرح منافق کے دل میں سے نورِ ایمان - اپنی کوئی چیز میری نظر میں اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی یہانتک کہ میری بیوی مجھے بُری معلوم ہونے لگی - میری نگاہیں بالکل ناپاک ہوگئیں - حظِ نفس کے لئے بڑے بڑے گناہ - مثلاً چوری ڈاکہ اور قتل انسان میرے لئے کھیل ہوگئے - سیکڑوں دل مَیں نے دُکھائے - جھوٹی گواہیاں مَیں نے دیں آپس میں لڑائیاں مَیں نے ڈلوائیں - حلال حرام میں مجھے تمیز نہ رہی - لوگوں کے حق میں نے چھین لئے - جن سے شرم کو بھی شرم آئے وُہ وُہ ناجائز اور ظالمانہ برتاؤ مَیں نے کئے - حتیٰ کہ غریبوں کے گلے کاٹ ڈالے - عورتوں کو بیوہ - بچوں کو یتیم بیکس اور بے خانماں بنادیا - اِن مظالم اور شرمناک واقعات سے کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی محبت بھری نگاہیں جو بچپن میں میری بھولی بھالی صورت پر اکثر قربان ہوا کرتی تھیں اب ان میں زہر بھر گیا تھا اور جب کوئی مجھے دیکھتا تھا تو گویا اُن آنکھوں میں خون اُترآتا تھا - رات دن اپنے سامنے مَیں دُنیا کو مرتے دیکھتا مگر اپنی موت کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آتا تھا گویا موت اَوروں ہی کے لئے بنائی گئی تھی - اور میں اُس سے بالکل آزاد تھا - مَیں خدا کے بندوں کو اپنا محکوم - بادشاہِ وقت کو اپنا ہم عصر اور پرائے مال کو اپنی ہی ملکیت سمجھتا تھا - اُن طاقتور ہاتھ پاؤں پر مجھے بڑا ناز تھا جو فطرتی طور سے قوی اور میرے سب گناہوں میں شریک رہا کرتے تھے مگر خُدا جانے یہ کیا بات تھی کہ باوجود تمام بے باکیوں کے میرا ہزار دفعہ کا تجربہ ہے کہ مَیں جب کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے گناہ کا قصد کرتا تھا تو میرے اُسی دل میں سے جواب کثرتِ جرائم سے بالکل سیاہ ناکارہ - فولاد سے زیادہ سخت اور گندہ ہوگیا تھا خود بخود یہ لفظ کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا تھا کہ او رسیاہ! بدبخت! کیوں اپنی جان پر ظلم کرتا ہے - کیوں جہنم میں گھر بناتا ہے ظالم! خُدا کے غضب سے ڈر اور پہلے اُس بوجھ کو ہلکا کرلے جواب کوئی دم جاتا ہے تیری گردن

آثارِ قدیمہ

ہم ذیل میں ایک خط درج کرتے ہیں۔ جس میں ایک با مذاق اور پُر درد دل نے اُن اثرات کا اظہار کیا ہے جو دہلی کے آثار قدیمہ کو دیکھ کر اُس پر ہوئے :-

دہلی

۱۵۔ نومبر ۱۹۰۱ء

پیارے فخرو

آج یہ تیسرا دن ہے کہ میں دہلی میں ہوں۔ پہلے روز تو کچھ ایسی تھکونی سی رہی کہ کہیں چل پھر نہ سکا۔ دُوسرے روز صبح کو ایک گاڑی کرایہ کی اور شہر کے دلچسپ مقامات دیکھنے کو چلا۔ خوش قسمتی سے میرے ہمراہ وہیں کے ایک سن رسیدہ شخص مل گئے جن کی واقفیت سے مجھے سیر میں بہت زیادہ مزا ملا۔ ہم شہر کے کاروباری حصہ سے ہوتے ہوئے سب سے پہلے جمعہ مسجد میں گئے جو اِس وقت دہلی میں تو کیا ہندوستان بھر میں ایک ہی مسجد ہے۔ اِسکے اُونچے اُونچے مینار اور وسیع صحن اور لمبی لمبی سنگِ مرمر کی صفیں جنپر سنگِ موسیٰ کی پیاری دلفریب اور بل کھائی ہوئی تحریر وہ لکیر ہے کہ دل اس کا فقیر ہوا جاتا ہے۔ جا بجا خوبصورت اور پیچیدہ طغرے ہیں جو کسی کی زلفِ پریشان کی طرح مسجد کی پیشانی کو دلفریب بنا رہے ہیں اُس کے وسیع صحن کا لبریز حوض جو غزالانِ وشت کی آنکھوں کا نمونہ دکھا رہا ہے پہلے پہل ایک اجنبی شخص کی آنکھوں کو چکاچوند کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ساتھ ان سب باتوں کے زمانے کے انقلاب نے اِسکی روز افزوں تباہ حالت اور گذشتہ شان و شوکت پر زبان بے زبانی میں ایسی پُر درد اور مُوثر تقریر سُنا دیتی ہے۔ کہ وُہ آنکھیں جن کو یہ بگڑی شان و شوکت دیکھ کر چکاچوند سی لگ گئی تھی۔ آنسوؤں سے ڈبڈبا آئی ہیں۔ خیر ہم لوگ تھوڑی دیر ٹھہر کر حسرت کی نظروں سے اُس کو دیکھتے ہوئے پھرے۔ اور ہماری

واقعات جو میری ساری ناپاک زندگی میں مجھ سے ظہور پذیر ہوئے تھے سب یکے بعد دیگرے میرے سامنے آنے لگے۔ دُنیا کا وُہ تمام مال جو مَیں نے ہزار جھوٹ۔ سچ۔ پھند۔ فریب اور خون ریزیوں سے جمع کیا تھا اب کا سب نہایت حسرت کے ساتھ دُوسروں کے لئے چھوڑنا پڑا۔ اُن ستم رسیدوں کے مُردہ جسم جنکے گلوں میں پھانسیاں ڈال ڈال کر مَیں نے زبردستی لٹکا دیا تھا۔ ایڑیاں رگڑتے دم توڑتے جنہیں دیکھا تھا پھر اُنہیں مہیب صُورتوں میں گویا میری چھاتی پر چڑھے آتے تھے۔ وُہ عورتیں جن کو مَیں نے ستایا تھا وہ معصوم بچے جنہیں میں نے یتیم بنایا تھا انتقام کی تیز چھُریاں لئے ہُوے میری آنکھوں میرے پہلوؤں میں بھونکنے کے لئے دوڑے چلے آتے تھے۔ بیسیوں ہاتھ تھے جو میری طرف بڑھ رہے تھے۔ سینکڑوں کرخت اور ہولناک آوازیں تھیں جو مجھ پر یُورش کر رہی تھیں ان سب پر طُرہ سب سے زیادہ خطرناک جو نظارہ تھا جسے دیکھتے ہی میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی میرا کلیجہ شق ہوگیا اور میرے سخت دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے وُہ یہ تھا کہ ملک الموت کا زبردست ہاتھ میری گردن پر تھا۔ فرشتگان عذاب مجھ پر مسلّط تھے۔ قہر خدائے قہّار جوش زن تھا اور دوزخ میرے لئے منہہ کھولے ہُوئے تھا۔ آہ آہ! کاش اس سے پہلے چلتے ہاتھوں میں کوئی نیک کام کر گذرتا۔ او ظالم خود بخود برباد ہو جانے والے!! او اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنے والے! او غرور کے پتلے! او خود غرضیوں کے دیوانے او لالچ کے دیوتا!! او بے بنیاد کائنات! اسوقت تو اُس رحمت اللعالمین کی خدمت میں سر نیاز جھکا دے۔ اس وقت تو رجُوع قلب سے دو آنسو نکال کر نجات کا طالب ہو جا۔ آہ آہ تو تو سب کچھ کرے مگر افسوس ہے کہ اب وقت نہیں رہا۔ گناہوں کی دلچسپی نے تجھے کہیں کا نہیں رکھا اور اے بدنصیب بندے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

آغا شاعر (دہلوی)

گاڑی انہیں قدیم آثاروں کے جھرمٹ میں ہوتی ہوئی قطب صاحب تک پہنچی - یہ عمارت بھی گویا دنیا کے عجائبات میں سے ایک جگہ ہے - اسکو قطب الدین نے (جو پہلا مسلمان بادشاہ ہے - جس نے دہلی کو اپنا دار السلطنت بنایا) ایک بہت بڑی مسجد بنانے کے ارادے سے بنایا تھا - لیکن اس کی حیات نے وفا نہیں کی اور ایک ہی مینار بنکر رہ گیا - اس کے گرد بھی تھوڑی بہت گری پڑی عمارتیں ہیں جو قطب الدین کے وسیع حوصلہ کا ثبوت دے رہی ہیں یہ مینار سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے اور اس کے گرد نیچے سے اوپر تک عشق پیچاں کی طرح قرآن کی آیتیں لپٹی ہوئی ہیں - اور یہ نہایت متانت سے کھڑا اپنی غائر نظروں سے دنیا کے انقلابات کا معائنہ کر رہا ہے - یہ مینار اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بہت دور دور کے سیاحوں کو کھینچ رہا ہے - غرض تھوڑی دیر تک ہم گردنیں اٹھا اٹھا کر اس سربفلک مینار کو نہایت حیرت اور استعجاب کی نظروں سے دیکھتے رہے - پھر اس کے اوپر چڑھے - اور اسی کی طرح دور دور تک پھیلے ہوئے آثار قدیمہ پر تعجب خیز اور حسرت ناک نظر ڈال کر نیچے اتر آئے - اُن مسمار عمارتوں کا کیا حال لکھوں جنکو زمانہ بہت کچھ مٹا چکا اور مٹائے چلا جا رہا ہے - اُن کی زمانے کی بگاڑی ہوئی صورتیں اِدھر اُدھر رہ گئی ہیں جو اپنے بانیوں کو یاد دلا رہی ہیں - اور گویا کوئی شاعر اُنہیں کی زبان سے کہہ رہا ہے - ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را!!

اب شام ہو گئی - آفتاب دور کے کھنڈر میں جہاں تھوڑے تاڑ کھجور نظر آ رہے ہیں غائب ہونے کو ہے - زرد زرد دھوپ ٹوٹی پھوٹی اونچی عمارتوں کی پیشانی کا بوسہ رخصت لے رہی ہے - کوتے درختوں پر شور کر رہے ہیں - مسافروں کا قدم آبادی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے - ایک آدھ گیدڑ بھوک سے بیتاب ہو کر سویرے ہی شکار کے کھوج میں نکلا ہوا ہے - ہمارے گاڑی بان نے بھی اب گھوڑا جوتنا شروع کر دیا ہے - آفتاب

گاڑی ایک لمبی اور گرد آلودہ سڑک کو قطع کرتی ہوئی قلعہ میں پہنچی - یہ قلعہ اُسی کا بنایا ہوا ہے جس کی ایک یادگار ابھی ہم دیکھ چلے آرہے ہیں - کیا بتاؤں کہ کیا دیکھا اور میرے دل کی کیا حالت ہوئی - بھائی! میرے پاس اتنے الفاظ نہیں ہیں کہ میں اُن دلی جذبات کا اظہار کروں جو وہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئے - صدہا قسم کی دلپر چوٹیں پڑیں اور ہزاروں چرکے لگے! میں وہاں کی عمارتوں کا کیا کیا ذکر کروں - اس خط کی اتنی سی جگہ اس کے لئے کافی نہیں ہوسکتی - جب میں اپنے سفر سے لوٹوں گا تو اچھی طرح سُن لینا - میں اسوقت وہاں کی ایک عمارت کا شعر لکھ دیتا ہوں جو اس کی تصویر کھینچ دینے کے لئے کافی ہوگا - وہاں کی عمارتوں میں ایک نہایت ہی خوبصورت اور اس بگڑنے پر بھی بلا کا جوبن رکھنے والے کمرے میں جہاں اُس کی سُنہری دیواروں کے کارنس کے کنارے کنارے جس میں بڑی بڑی صناعیوں سے کام لیا گیا ہے اور جس میں بڑے بڑے بیش قیمت پتھر اور جواہرات اپنے اپنے نقش قدم چھوڑکر یورپ چلے گئے ہیں اور وہاں کے قصروں اور محلوں کو چمکا اور دمکا رہے ہیں - سنگ موسئے کے خوبصورت حرفوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ؎ اگر فردوس بر روئے زمین است + ہمین است و ہمین است و ہمین است - اس کو تم صرف ایشیائی شاعری نہ سمجھنا - جسوقت یہ لکھا گیا تھا دُنیا اس سے بڑھ کر خوبصورت عمارت نہ رکھتی تھی! میں اس وقت تمہیں اس قلعہ کی تاریخی حالت نہیں لکھونگا - کیونکہ میں ان عمارتوں کے حالات کی ایک مستند کتاب "آثار الصنادید" جو ایک بڑے عالم کی لکھی ہوئی ہے لاؤنگا - جس کو میرے ساتھ پڑھنے میں تمہیں بھی پورے سفر کا مزہ ملے گا -

آج ہم لوگ پُرانی دلی میں گئے تھے جہاں قدیم آثار دو تین کوس تک پھیلتے چلے گئے ہیں اور ان ویرانوں کے درمیان ایک لمبی غیر مستقیم سڑک دوڑ گئی ہے جو قطب صاحب کی لاٹ تک جاتی ہے - ہم تین بجے سہ پہر کو قطب صاحب کی لاٹ دیکھنے کو چلے - ہماری

اصولِ حکومت

سسرو رومۃ الکبریٰ کا مشہور مدبّر اور مقرر جو اپنی فصاحت اور بلاغت میں آپ ہی اپنا نظیر تھا اپنے بھائی کوئنٹس کو جو کسی ایشیائی صوبہ میں حاکم تھا ایک خط لکھتا ہے اور اُسے اِطلاع دیتا ہے کہ اُس کی حکومت کا زمانہ ایک سال کے لئے بڑھا دیا گیا ہے اور اس مدّت کے لئے سلطنت کی اہم ذمّہ داری ابھی اُسی کے سر پہ رہے گی۔ چنانچہ اسی ضمن میں وُہ اُسے تدبیرِ سلطنت کے متعلق چند نصائح کرتا ہے۔ اِس خط کو پڑھ کر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ یہی نصائح ہمارے کسی حاکم کے لئے کیسی صادق آسکتی ہیں۔

اگر تم اَور ایک سال کے لئے تازہ دم ہو کر پھر ہر بات میں نیکنامی اور شہرت کے حاصل کرنے کے لئے یُوں آمادہ ہو جاؤ کہ نہ صِرف دُوسروں پر۔ بلکہ خود اپنے پہلے حالات پر سبقت لیجاؤ۔ اور اپنے دِل و دماغ کے تمام قوٰے اور خیالات کو اِس طرف لگادو کہ جو کام تم کرو اُسی میں تمہاری تعریف ہو تو مان لو کہ ایک سال کی محنت سے تم اپنی زندگی کے بہت سے سالوں کی خوشی کو بڑھانے کے علاوہ اپنی آیندہ نسل کے لئے باعثِ افتخار ہو گے۔

اِس لئے میَں التجا کرتا ہُوں کہ اپنی ہمّت کو پست نہ ہونے دو اور نہ اپنے کام کی اہمیّت کو دیکھ کر ڈر جاؤ بلکہ تمام مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے مردانہ وار کمرِ ہمّت چُست باندھ لو۔ اِس لئے کہ تمہارے متعلق ایسا کام نہیں ہے کہ تم اتفاقیہ اس میں کامیاب ہو جاؤ گے بلکہ اِس میں محنت اور تدبیر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اگر تمہارا زمانۂ حکومت ایک ایسے وقت میں بڑھایا جاتا جب تم کسی بڑے جنگ میں مصروف ہوتے تو میں ضرور کہتا کہ تمہاری باگ قسمت یا اتفاق کے ہاتھ میں ہے۔ مگر فی الحال سلطنتِ جمہور کا وُہ حصّہ تمہارے زیرِ عنان ہے جس میں اتفاق اور قسمت کو بہت ہی کم دخل ہے اور وہ زیادہ تر تمہاری نیکروی اور تمہاری طبیعت کے اِعتدال پر منحصر ہے۔ اِسوقت نہ ہیں کسی دشمن کے حملہ

کا غروب ہونا تھا کہ بھیانک پن اور سناٹا حدِ نظر تک چھا گیا۔ ہم اُن ویرانوں سے ہوتے ہُوئے چلے۔ دوسری تیسری تاریخ کا چاند ایک درخت کے سر پر ہمیں نظر آیا جسکے گرد گرد تارے آنکھیں پھاڑ کر اُن بھیانک عمارتوں کو جو اس وقت عجیب طرح کی نظر آ رہی تھیں دیکھ رہے تھے اور گاڑی کی رفتار کی وجہ سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہمارے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہم اس منظر کو دیکھتے ہُوئے آبادی میں داخل ہو گئے۔ کل صُبح اُن ویرانوں کی طرح اس آبادی کو بھی چھوڑ دُونگا۔ والسّلام

ام۔ اے۔ وَدُوْد

چاء نوشی۔ چاء نوشی کا استعمال ملک میں زور سے ترقّی کر رہا ہے اور اُسکے ساتھ پڑھے لکھے لوگوں میں کافی اور کوکو کے استعمال کی بھی رغبت بڑھتی جاتی ہے۔ اِسلئے ہمارا خیال ہے کہ رسالہ چاء و کافی و کوکو کے لائق مصنّف ڈاکٹر سیّد غلام حسین صاحب نے اِس رسالہ کو شائع کرنیسے ایک مفید کام کیا ہے۔ یہ رسالہ اسوقت ہمارے سامنے ہے۔ اسکا حجم ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر کوئی اسّی صفحے کے قریب ہے۔ اور اسمیں ان تینوں مقبول پینے کی چیزوں کی نسبت دلچسپ اطلاع جمع کر دی گئی ہے۔ مثلاً چاء کی نسبت بتایا گیا ہے۔ کہ کیونکر دریافت ہُوئی۔ کس طرح اس کا رواج بڑھا۔ اِسکے استعمال کی اچھی ترکیبیں کونسی ہیں۔ اِسکے خواص از رُوئے طب کیا ہیں۔ اس سے نقصان کیا ممکن ہے اور نفع کیا۔ ہماری رائے میں اس رسالہ کا پڑھنا خالی از دلچسپی اور فائدہ نہ ہوگا۔ مطبع فیضِ عام علیگڈھ میں چھپا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت فی جلد ۵ ؍ ہے اور محصولڈاک جُدا ہے۔ شایقین مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیں:۔ "سیّد محفوظ حسین و برادران رسہنہ۔ ضلع گوڑگانوہ"۔

ایک اور رسالہ انہی ڈاکٹر صاحب کا تصنیف کردہ ہمارے سامنے ہے مگر وُہ کسی حیثیت سے قابلِ ستایش نہیں۔ اوّل نام بے ڈھنگا سا ہے "مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کرنا"۔ دُوسرے اس میں مصنّف صاحب بحث اصلی سے دُور جا پڑے ہیں۔ کہیں طبّی دلائل لاتے ہیں کہیں مذہبی۔ کبھی عقلی۔ کبھی نقلی۔ اور بعض فقرات ایسے بھی لکھ گئے ہیں جو مذاقِ سلیم کو کھٹکتے ہیں ۔

اختیارات سے حکومت کرو - اور اس عرصہ میں کوئی بُت - یا تصویر - یا برتن یا لباس -
یا غلام - یا ذاتی خدمت یا نقد زر (ایک ایسے صوبے میں جہاں ان چیزوں کی اس قدر
کثرت ہے) تمکو دیانت داری اور اعتدال کی راہ سے ایک دم کے لئے منحرف
نہ ہونے دے -

اِس سے بڑھکر اور کونسی بات ہوسکتی ہے کہ تمہاری پرہیزگاری اور اعتدال تاریکی
میں نہ دبے رہیں بلکہ ایشیا کی روشنی میں روز روشن کی طرح چمکیں - تمکو خدا نے ایک ایسے
صوبے پر حکمران کیا ہے جو دُنیا کے ملکوں اور قوموں میں مشہور و معروف ہے -

اِس بات کا بھی خیال رکھو کہ ایسا نہ ہو کہ جہاں تم جاؤ وہاں کے لوگ ہراساں ہو جائیں
یا تمہارے اخراجات سے تنگ آجائیں یا تمہاری موجودگی سے اُن میں شورش پیدا ہو
بلکہ جہاں جاؤ لوگ خوشی سے جامے میں نہ سمائیں اور ہر شہر یہی سمجھے کہ ہم ایک اپنے
مربّی کی مہمانداری کرتے ہیں نہ ایک ظالم و جابر کی - ہر گھر میں یہ خیال ہو کہ ایک مہمان
اُترا ہوا ہے نہ راہزن -

اِن تمام امُور میں غالبًا تجربہ نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ صرف یہی کافی نہیں ہے
کہ یہ تمام صفات تمہاری ذات میں موجود ہوں - بلکہ تمہارا یہ فرض ہے کہ جس مُلک پر تم
حکمران ہو وہاں نہ صرف تم اپنے لئے جوابدہ بنو بلکہ سلطنت کے تمام افسروں - ماتحتوں
رعایا اور جمہور کے تم نگرانِ حال ہو - بیشک تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری نیابت میں
ایسے لوگ موجود ہیں کہ نیکی اور خود داری اُنکو ہرگز کسی ذلیل یا کمینہ پن کے فعل کی اجازت
نہ دے گی -

تمہارے صوبے میں ایسے افسر بھی ہونگے جنکو تم نے مقرّر نہیں کیا - بلکہ جن کا
عزل و نصب تمہارے اختیار سے خارج ہے - اوّل تو اُنکا یہ فرض ہے کہ وُہ تمہارے
مطیع رہیں اور ہر حال میں تمہارے ہم آہنگ ہوں لیکن اگر اُن میں کبھی کوئی بدلگامی

کا اندیشہ ہے نہ کسی جنگی معرکہ آرائی کا خوف - نہ کسی باجگذار کی بغاوت کا کھٹکا ہے نہ تنخواہوں اور رسد رسانی کی کمی ہے - اور نہ فوج میں کوئی بغاوت - یہ حادثات ایسے ہیں کہ بعض اوقات نہایت دُور اندیش لوگوں کو بھی پیش آجاتے ہیں - اور جس طرح کوئی بڑا کارآزمودہ ملّاح بھی طُوفان کی شدت کو نہیں روک سکتا - اسی طرح اتفاق یا قسمت کی دشمنی کا کوئی شخص مقابلہ نہیں کرسکتا - تمہارے حصّہ میں پُورا پُورا امن آیا ہے مگر یہ امن بھی ایسا ہے کہ اس میں حزم و احتیاط اور جفاکشی کے بغیر کام نہیں چل سکتا ۔

تمہیں جن امُور کی انجام دہی کرنی ہے وہ نہایت ہی اہم ہیں اور ان میں پرلے درجہ کی دُور بینی لازم ہے - لیکن جن لوگوں پر تمہیں کلّی اختیار حاصل ہے انکو زیرِ فرمان رکھنا کونسا مشکل امر ہے شرط صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی ذات پر قابو رہے - کسی اور شخص کی نسبت اپنے نفس پر اختیار رکھنا زیادہ دشوار ہے - مگر تمہیں تو قدرت نے طبیعت ہی ایسی دی ہے کہ اگر تمہیں تعلیم بھی نہ دیجاتی تو بھی شاید اعتدال کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے - چہ جائے کہ اس پر تمہیں ایسی تربیت ہوئی ہے کہ بُری سے بُری خلقت کو بھی نیکی کی طرف مائل کر دیتی پس اسباب کی طرف سے مجھے پُوری طمانیت ہے کہ تم اپنی ذات سے تو ہر قسم کی ناواجب خواہشات سے مبرّا ہو - مگر ڈر یہ ہے کہ تمہاری حکومت میں حریص اور لالچی اہلکار یا سوداگر فریب یا ظلم سے دُوسروں کو نقصان نہ پہنچائیں - اور تم اُنکا کماحقّہ انسداد نہ کرسکو - اگر تم ان باتوں کو مدِّنظر رکھکر حکومت کروگے تو تمہاری یُونانی رعایا یہ سمجھیگی کہ تم بھی اُنکی قدیم روایات کے مطابق ایک آسمانی دیوتا ہو اور دُنیا کی بہی خواہی کے لئے زمین پر اُترے ہو -

مَیں یہ اس لئے نہیں لکھتا کہ تم صرف ان باتوں پر عمل ہی کرو - اور اگر عمل کرتے ہو تو بس انہیں کا بند ہوجاؤ - بلکہ ان پر عمل کرکے ان سے مسرت حاصل کرو - تمہارے لئے بڑے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ تم تین سال تک ایشیا میں کامل فوجی

اور ہمیشہ تمہاری مرضی کے مطابق کام کریں۔ علاوہ بریں تمہاری تمام رعایا کو یہ معلوم ہونا چاہیئے
کہ تمہیں اپنے ماتحتوں کا پاس خاطر۔ انکی حرمت اور عزت اور اُنکی سرفرازی دل سے مقصود
ہے۔ اور یہ بھی عام طور پر مشہور ہونا چاہیئے کہ تم نہ صرف رشوت لینے کو بُرا جانتے ہو
بلکہ رشوت دینے کو بھی ویسا ہی مکروہ سمجھتے ہو۔ اور کسی شخص کو اس لالچ سے رشوت
دینے کی جرأت نہ ہو کہ تمہارا کوئی ماتحت افسر تمہارے مزاج پر قابو رکھتا ہے اور جو
چاہے تم سے کرا سکتا ہے۔

میرا اس نصیحت سے ہرگز یہ مُدعا نہیں کہ تم اپنے نائبوں سے درشتی کرو یا خواہ
مخواہ اُن پر شک کیا کرو۔ بلکہ اگر اُن میں سے ایسے لوگ ہیں جو اس دو سال کے عرصہ
میں دیانتدار رہے ہیں تو کیوں اُن پر پُورا پُورا اعتماد نہ کیا جائے۔ مگر جنکی بددیانتی سے
تم ایک دفعہ آگاہ ہو گئے ہو اُن پر کبھی بھروسہ نہ کرو اور خصوصاً کبھی کوئی اپنا ذاتی اختیار
اُنکے سپُرد نہ کرو۔

اگر تمہارے صُوبے میں کوئی ایسا شخص ہو جو اس عرصہ میں تمہارا دوست بنگیا ہو اور
اس زمانہ سے پہلے تم اُسے نہیں جانتے تھے تو اُس پر اعتماد کرنے میں نہایت احتیاط سے
کام لو۔ اس لئے نہیں کہ اُن میں قابلِ اعتبار لوگ نہیں ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ تمہیں اسکا
علم نہیں۔ اور لوگوں کے بعض عیوب سالوں تک پردے میں رہتے ہیں۔ اور اُن کی
صُورت شکل۔ طرز بود و باش کسی چیز سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ان میں کوئی خاص
عیب بھی موجود ہے۔ بعض لوگ تم سے از حد محبت اور اُلفت کا اظہار کریں گے مگر در
اصل ذاتی لالچ پر مٹے ہونگے۔ اور شاید وہ ہر حاکم سے ایسی ہی قرابت حاصل کر لیتے ہوں
ایسے لوگوں سے بچنا نہایت ضروری ہے اور اُن سے کبھی خلا ملا کی نوبت نہ آنی چاہیئے
اس لئے کہ ایسے لوگ رشوت اور ناجائز ذرایع سے خوب واقف ہوتے ہیں اور وہ جو
کچھ کرتے ہیں اپنی منفعت کی خاطر کرتے ہیں۔ ہاں اگر تم نے کسی کو پرکھ لیا ہے تو خوشی

ظاہر کرے تو تمہارا برتاؤ اس قسم کا ہونا چاہئے کہ جہانتک وُہ ایسے قواعد میں بے ضابطگی کرتا ہے جنکے تم خود پابند ہو اور صرف تمہاری ذات کے متعلق ہیں تو تمہیں تحمل اور برداشت کرنا چاہئے۔ لیکن جہاں وُہ عوام الناس کے فایدہ پر ذاتی منفعت کو ترجیح دے تو تمہارا اغماض کرنا غلط ہوگا۔ جن لوگوں کو سلطنت نے تمہاری اعانت اور نیابت کے لئے مقرر کیا ہے ضرور ہے کہ وُہ ملکی امور کی انجام دہی میں اُن اصُولوں کے پابند رہیں جنکا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

مگر وُہ لوگ جنکو تم نے خانگی طور پر اپنی مصاحبت اور ہمراہی کے لئے انتخاب کیا ہے۔ یا تمہارے ضروری ملازم۔ جو تمہارے درباری کہلاتے ہیں۔ اُنکے تمام افعال بلکہ اقوال کے لئے بھی تم خود جوابدہ ہوگے۔ لیکن تمہارے گرد جو لوگ ہیں وہ اس قسم کے ہیں کہ اگر وُہ راست روی سے کام کریں تو وُہ تمہارے عزیز ہو سکتے ہیں۔ اور اگر وُہ تمہاری مثال کی پیروی نہ کریں تو تم بڑی آسانی سے انکو درست کر سکتے ہو۔ اور اب تمہاری حکومت کے تیسرے برس میں تمہیں وہی دیانتداری اور سچائی کے اصُول کو قائم رکھنا چاہئے۔ بلکہ بہ نسبت سابق کے زیادہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا چاہئے

تمہارے کان ایسے ہونے چاہئیں کہ جو کچھ وُہ خود سُنیں وُہی تم سُنو۔ نہ یہ کہ جو کچھ کوئی اپنے لالچ اور فائدے کے لئے تم سے کہدے اُسے ہی قبول کرلو۔ تمہاری مُہر صرف ایک آرائش کی چیز نہیں ہونی چاہئے بلکہ وُہ تمہاری قائم مقام ہو۔ وُہ کسی اور شخص کی مرضی کے تابع نہ ہو بلکہ وہ خود تمہاری شاہد ہو۔ تمہارا سارجنٹ ایسا شخص ہونا چاہئے۔ کہ بجائے رشوت ستان ہونے کے لوگوں کا اور سلطنت کا سچا اور وفادار مُلازم ہو۔ ہمارے بزرگ یہ عہدہ ہمیشہ آزادی کے ساتھ اُس شخص کو دیتے تھے جو اس کے قابل ہوتا تھا۔ اور اُس سے غلاموں کی طرح سے کام لیتے تھے۔ اُسی طرح سے تمہارے سکرٹری اور دوسرے نائب خود مختار اور جفاکار لوگ نہ ہوں بلکہ جو لوگوں کی دِل سے بہتری چاہیں

عدالت اور حکومت ایسی ہونی چاہئے کہ لوگوں کو یہ خواہش کبھی محسوس ہی نہ ہو کہ کوئی تم سے بڑا حاکم بھی ہو جس کے آگے وُہ جا کر فریاد کریں - اور ایسے طریقِ عمل کے لئے ایک وسیع دِل - اور روشن دماغ کی ضرورت ہے جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو اور ذاتی لیاقت سے معمور ہو - یہ سب صفات تم میں بدرجۂ اکمل موجود ہیں مگر میں اُن کی یاد دہانی اپنا فرض سمجھتا ہُوں - اور اُمید ہے کہ تم اسے کسی اَور بات پر محمول نہ کرو گے +

عبد الرّشید چشتی

تاریخ مدرسۃ العلوم - سید افتخار عالم صاحب نے جو مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے پرانے طالب علم اور صاحب مذاق علمی ہیں - کالج کی ایک تاریخ لکھ کر نہ صرف کالج پر جس کے وُہ خود ممنون تھے - بلکہ بالعموم تعلیم یافتہ مسلمانوں پر احسان کیا ہو - علیگڈھ کالج ہندوستان میں اور خصُوصًا مسلمانوں میں اب خوبی تعلیم کے اعتبار سے مسلمہ مرکز ہے - اور اسکے حالات سے سب علم دوست اصحاب کو دلچسپی ہے - اسلئے قابل مؤلف نے نہایت محنت سے ابتدائے کالج سے اب تک کے حالات ایک کتاب کی صُورت میں جمع کر دیئے ہیں - جس کا حجم تین سو صفحہ سے زیادہ ہو اور جو بلحاظ لکھائی اور چھپائی کے آج کل کے اچھے نمونوں میں ہے - نری رُوکھی پھیکی تاریخی باتوں کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا - بلکہ دلچسپی بڑھانے کے لیے بانیٔ کالج کی زندگی کے متعلق بعض لطیف واقعات اس میں درج کی گئی ہیں - عبارت اکثر مقامات پر سادگی کے ساتھ زور دار ہونے کی خوبی لئے ہوئے ہے - اور بحیثیت مجموعی کتاب ایسی ہے کہ کوئی اسے پڑھ کر یہ نہ کہہ سکیگا کہ میں نے وقت ضائع کیا - دیباچہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے قصد تھا کہ ٹرسٹیوں کی تصویریں بھی اس کتاب میں درج کی جائیں - لیکن چونکہ سب وقت پر میسر نہیں ہو سکیں - اس لئے یہ قرار پایا ہے کہ ایک اَور کتاب بنام "مرقع ٹرسٹیاں" شائع کیجائے - اور اس میں ہر ٹرسٹی کے مختصر حالات اور تصویر ہو - موجُودہ جلد میں کالج کی عمارت اور زمین کے نقشے وغیرہ دیئے گئے ہیں جو کالج کی تصویر ذہن میں اُتارنے میں معاون ہیں - قیمت اسکی تین روپیہ علاوہ محصُولڈاک ہے - اور چودھری محمد یونس خاں صاحب - رئیس مارہرہ - ضلع ایٹہ سے مل سکتی ہے +

اُسے اپنے احباب کے زُمرے میں داخل کرلو۔

یُونانیوں سے بے تکلفی کرنے میں بھی خاص احتیاط برتنی لازم ہے۔ اس لئے کہ کئی پُشتوں کی غلامی سے اُن میں بہت سی بُری عادتیں آگئی ہیں اور وُہ عموماً سخت خوشامدی ہیں۔ اُنکی حالت کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ اُنسے نہایت فیاضانہ سلوک کیا جائے۔ اور اُن کی منفعت اور رعایت ملحوظِ خاطر رہے کہ وُہ اپنی پہلی سی عادتیں پھر حاصل کرلیں۔ مگر اُن سے بے تکلفی کبھی نہ ہو اِس لئے کہ نہ صرف وُہ ہم سے حسد رکھتے ہیں بلکہ آپس میں وُہ ایک دُوسرے کو اچھی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔

الغرض تم اپنے طریقِ عمل میں اِن باتوں کا خاص خیال رکھو اوّل اپنی ذات سے دیانت دار اور میانہ رو رہو۔ دوم وُہ لوگ جو تمہارے گرد ہیں اُن میں خودداری قائم رکھو۔ سوم کیا ایشیا کے لوگوں۔ اور کیا یُونانیوں سے بے تکلف دوستی میں نہایت درجہ کی احتیاط کو کام میں لاؤ۔ چہارم اپنے خانگی معاملات میں انتظام اور پابندی مدِنظر رکھو۔ جس صُوبے پر تم حکمران ہو وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ قانون کی پابندی نہایت لازمی امر ہے اِس لئے عدالت میں ہرگز بیجا نرمی یا رعایت کو دخل نہ دینے دو۔ بلکہ سب کو یکساں سمجھو۔ اور یکساں سلوک کرو۔ اور دیکھو کہ تمہارے نائب اس بات کو کبھی ہاتھ سے نہ دیں۔

مزید برآں لوگوں کے عذرات اور عرضداشتوں کو نرمی اور تحمل سے سُننا۔ فیصلہ کرنے میں نرمی۔ اور عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش اور اُنکے دلائل پر غور کرنے کی عادت سے تم بہت جلد ہر دلعزیز ہو سکتے ہو۔ رُوم میں جہاں لوگ اسقدر خودسر اور آزادی پسند ہوگئے ہیں۔ وہاں بھی نرمی کی بہت قدر ہوتی ہے چہ جائے کہ ایشیا جہاں نہ تم سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ حکم ہے نہ تمہارے فیصلوں کی کوئی اپیل ہے۔ نہ جمہوری طرزِ حکومت۔ بلکہ لوگ ہر وقت تمہاری طرف دیکھتے ہیں کہ کیا اشارہ ہو۔ اِس لئے تمہاری

جاڑا ہے اور کپڑا نہیں۔ غرض اس اُمت میں سے اگر کوئی دُنیا کی زندگی کی تصویر کھینچنے کا سلیقہ رکھتا ہو تو اس کی تصویر دیکھ کر ہر فرد بشر کا دل دُنیا کی زندگی سے سیر ہو جائے۔ نہ صرف سیر ہو جائے بلکہ دُنیا سے ڈرا آنے لگے۔ ہر شخص کو یہ توقع ہو گی کہ اس قوم کو چُونکہ دُنیاوی آرام کا خوب تجربہ ہے اس لئے اُن میں ہمدردی کا مادہ زیادہ ہو گا۔ مگر افسوس ہے کہ صُورتِ حال یُوں نہیں۔ اوّل تو یہ کہ ننگی کیا نہاوے اور کیا نچوڑے۔ یہ بیچارے اپنی مدد خود نہیں کر سکتے۔ خود ضروریاتِ زندگی کو ترستے رہتے ہیں تو وُہ دُوسروں کی امداد کیا کریں۔ دُوسرے یہ کہ جہالت کے باعث یہ لوگ ایسے اکھڑ ہوتے ہیں کہ سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے۔ اور اپنے آپ تو بھلا کیا سمجھیں گے۔ اِس لئے وُہ دوسروں کے درد کو محسوس نہیں کرتے۔ پھر مدد کیسی۔ اور اگر کسی بندۂ خدا کا دِل دُکھا بھی تو وُہ بے بس ہے۔ پاس پیسہ نہیں۔ نہ پیٹ کے دھندے سے فرصت نہ فراغت۔ پھر وُہ کسی کے دُکھ میں کیونکر شریک ہو۔ اور اپنی حالت کو بدلنے یا ترقی کرنے کا خیال کیا کرے۔

اب متوسطین کی حالت دیکھئے۔ اِن لوگوں کی حالت بالکل تجارت کی سی ہے۔ تجارت قوموں میں تعلق پیدا کرتی ہے اور خود اُنکے امن کی ضامن بنتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ ایک قوم کے مختلف گروہوں میں رشتہ کا کام دیتے ہیں۔ متوسط الحال لوگوں کو تجارت کے ساتھ ایک اَور مناسبت بھی ہے۔ تجارت جن قوموں میں تعلق پیدا کرتی ہے اُن کی حالت میں اگر ذرا سا بھی تغیر ہو تو تجارت پر فوراً اثر پڑتا ہے۔ کسی قوم میں وبا پھیل جائے تو تجارت ماند۔ کہیں قحط پڑ جائے۔ یا جنگ چھڑ جائے تو تجارت مندی۔ مگر باوصف اِس طرح سریع التاثیر ہونے کے پھر بھی تجارت ہی اُنکی ضروریات کی کفیل رہتی ہے۔ بیماروں کو دوائیں اور بھوکوں کو روٹیاں۔ اہل مصاف کو بارود سکّہ بہم پہنچاتی ہے۔ یہی حالت متوسطین کی ہے کہ امرا اور غربا میں واسطہ یہی لوگ ہیں۔ اور ان دونوں کی بھلائی بُرائی کا اثر بھی متوسطین پر ضرور پڑتا ہے۔ اگر اُمرا زیادہ ترعیش

ہندی اہلِ حرفہ

اہلِ یورپ کا یہ عام مقولہ ہے کہ قوموں کی قوت کا باعث متوسط الحال لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم کے امرا اپنی وضع کے اس قدر پابند ہوتے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ رنگ بدل نہیں سکتے۔ بلکہ زمانہ جو رنگ بدلتا رہتا ہے اسکی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ عام لوگوں کے ساتھ انہیں چنداں ربط ضبط نہیں ہوتا۔ غربا اور متوسطین کو ان تک بار نہیں ملتا۔ اس لئے بھی انہیں زمانہ کی حالت سے آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ انہیں قوم کے عیوب سے آگاہی ہوتی ہے کہ اُسکا تدارک کریں۔ نہ قوم کے مصائب کا رونا اُنکے کانوں تک پہنچتا ہے کہ وُہ قوم کے کسی کام آسکیں۔ وُہ خود دن رات عیش و عشرت میں غرق رہتے ہیں۔ اور چونکہ زمانہ کی ضروریاتِ زندگی ہم پہنچانے سے پہلے ہی عیش کے سامان بہت سے جمع کر لیئے تھے اس لئے اُمرا کو کبھی اپنی موجودہ حالت کو بدلنے یا ترقی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ترقی کا لفظ اُنکے لئے ایک بے معنے کلمہ ہوا کرتا ہے۔ کچھ تو یہ وجہ ہے کہ ہم اِن لوگوں کو عموماً قوم کی طرف سے بڑا سرد مہر پاتے ہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ عموماً امیروں کے آگے پیچھے لوٹنے والے لگے رہتے ہیں جو اُنکو حد مناسب سے زیادہ باہر ہونے ہی نہیں دیتے۔ غرض کچھ صورت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ جن لوگوں کو خود کما کر کھانا نہیں پڑتا وُہ عموماً دُنیا سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ انکی دُنیا انکے اپنے مکان و باغ ہوا کرتے ہیں۔ اور باقی دُنیا اور اہلِ دُنیا سے اُنکا تعلق کچھ یوں ہی سا ہوا کرتا ہے۔

غربا کی حالت دیکھئے تو دُنیا کے مصائب کی آماجگاہ یہی قوم ہے اگر بیمار ہیں تو دوا نہیں ملتی۔ تھکے ہیں تو آرام کی مہلت نہیں۔ بھوکے ہیں تو پیٹ بھر کھانے کو نہیں۔

گروہ بل کر بھی اس قدر نو تعلیم یافتہ اشخاص پیدا نہیں کر سکتے - نئی تعلیم سے جسقدر حصہ متوسطین کو ملا ہے اسقدر امرا و غربا کو نہیں ملا - گو متوسطین میں تعلیم یافتہ بہت سے موجود ہو گئے ہیں مگر ہندوستان نے تاحال ترقی نہیں کی - کیونکہ ترقی صرف تعلیم کا نام نہیں - بلکہ ترقی یہ ہے کہ (۱) موجودہ علوم کے جاننے والے پیدا کیے جائیں (۲) موجودہ علوم کو ترقی دی جائے اور نئی نئی باتیں دریافت کیجائیں اور (۳) موجودہ علوم سے عملی فائدہ اٹھایا جائے - اور انسانی ضروریات کے بہم پہنچانے میں اُن سے کام لیا جائے -

اسوقت تک اہل ہند نے ترقی کا سب سے پہلا درجہ طے کیا ہے اور یہی طے بھی ہونا چاہیے تھا - کیونکہ باقی دونوں درجوں کا طے کرنا اسی پر منحصر ہے - اور سہل ترین درجہ بھی یہی تھا کیونکہ یہ خاص متوسطین کا حصہ ہے اور وُہ پہلے ہی رنگ بدلنے کو مستعد تھے اس پر طرہ یہ کہ سرکار انگریزی نے بھی ہمارا ہاتھ بٹایا اور اس منزل کے طے کرنے میں ہماری مدد کی -

ترقی کا دُوسرا درجہ یہ ہے کہ علوم کو ترقی دیجاوے یہ مرفہ الحال لوگوں کا حصہ ہے مگر امرا تو کام کرنا جانتے ہی نہیں - اس لیے اس منزل کو ہم اُسوقت تک طے نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے متوسطین ایسے مالدار نہ ہو جائیں کہ انہیں کام کرنے کی حاجت نہ رہے اور علمی مشاغل و تجربات کے لیے انکے پاس کافی روپیہ بھی ہو - جب یہ حالت ہو جائے تو چونکہ متوسطین کو کام کرنے کی عادت اور ترقی کا چسکا ہو گا اس لیے وُہ فراغت میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہینگے اور نہیں تو علوم و فنون کی سرپرستی ہی مسلمان بادشاہوں کی طرح کیا کرینگے - اسوقت اہل ہند بھی دنیا کی اور قوموں کی ہمسری کا دعوے کر سکینگے - اور کیا عجب ہے کہ ان متوسط الحال دولتمندوں کے دیکھا دیکھی اور انکی صحبت کے اثر سے پونڈوں کے اسیر بھی کچھ ترقی کی طرف جھک پڑیں -

دُوسرے درجہ کے طے ہونے کی توقع تو نہیں اسیوقت ہو سکتی ہے - جب متوسط الحال مرفہ الحال ہو جائیں - اور متوسطین مرفہ الحال ہونگے - مگر اہل انگلینڈ کے سے مالدار نہ ہونگے

پرستی میں منہمک ہیں۔ تو لابد ہے کہ متوسطین انکی تقلید کریں۔ اور اگر تقلید نہ بھی کریں تو یہ تو انہیں کرنا ہی ہوگا کہ اُنکے عیش کے سامان بہم پہنچائیں کیونکہ جس چیز کی مانگ ہوگی دوکان میں وُہی رکھنا ہوگی۔ ایسا ہی غربا اگر محنتی مزاج اور متدین ہونگے تو متوسطین کو تجارت و صنعت کو بڑھانے میں سہولت ہوگی۔ اگر غربا کندہ ناتراش اور اکھڑ کام چور ہونگے تو متوسطین بھی مجبور ہمت ہار دینگے۔ ہاں تو یہ ممکن نہیں کہ متوسطین باقی دو قوموں کی حالت سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں امرا اور غربا دونوں کی ضروریات انہیں پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اور دونوں کی حالت سے انہیں بخوبی آگاہی رہتی ہے اگر یہ کوشش کریں تو امیر و غریب دونوں کی حالت سدھار سکتے ہیں۔ کیونکہ سب کے ہاں انہیں بار ملتا ہے اور ہر جگہ انکی شنوائی بھی ہوجاتی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ لوگ نہ تو افلاس میں ایسے گرے ہوتے ہیں کہ کسی کی مدد نہ کر سکیں اور نہ دولت میں اس قدر دبے ہوتے ہیں کہ اپنی حالت بدلنے سے ناچار ہوں۔ غرض یہ کہ کل قوم میں یہ ایک ایسا فرقہ ہے جو بسہولت زمانے کے ہم رنگ رہ سکتا ہے اور ایک دُوسرے کی اور اپنی مدد کر سکتا ہے۔ اسی کا نام ترقی ہے اور اسی پر قوم کی قوت موقوف ہے۔

آجکل ہندوستان میں چاروں طرف سے یہی صدا آرہی ہے کہ قوم غفلت میں ہے اور کچھ ترقی نہیں کرتی۔ یہ شور مچانے والے بھی متوسط الحال لوگ ہی ہیں۔ کیونکہ یہی فرقہ زیادہ اثر پذیر ہے اور زمانے کی ضرورتوں کو بخوبی پہچانتا اور جانتا ہے۔ باقی ہمارے ہاں کے راجے۔ نواب۔ رئیس جاگیردار تو تاحال اسی پرانی لکیر کو پیٹ رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے بڑھئی اور لوہار تاحال وُہی دقیانوسی فیشن کا اسباب تیار کرتے ہیں۔ ترقی کی صدا کا اثر بھی اگر کچھ پڑا ہے تو متوسطین پر ہی پڑا ہے۔ ترقی کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے۔ متوسطین میں جس قدر تعلیم یافتہ اشخاص آپ کو ملینگے۔ اُمرا و غربا دونوں

لوگوں سے محنت کا مادہ ہی مفقود ہوگیا۔ اور جو شخص زیادہ کاریگر تھا اسی پر امراکی بیگار زیادہ پڑتی تھی۔ اِس لئے لوگوں میں اچّھی چیز بنانے اور ہنر میں کمال پیدا کرنے کا شوق ہی اُٹھ گیا۔ مگر مجھے اِس رائے سے اتفاق نہیں۔ ممکن ہے کہ پچھلے زمانے میں یہی حال ہو۔ مگر ہندوستان کے بعض حصص پر کم و بیش دو سو سال سے انگریزی سلطنت کا سایہ ہے اور لوگوں کو اُجرت بھی ملتی ہے اور بیگار سے بھی وُہ محفوظ ہیں۔ مگر ذاتی مفاد نے تاحال اُنہیں محنت یا کمال کی طرف متوجّہ نہیں کیا۔ اِسوقت کون سی شخصی حکومت انہیں ترقی و محنت سے روکتی ہے ؟

بات اصل میں یہ ہے کہ ہندوستان کی آب وہوا ہی ایسی ہے کہ یہاں کے باشندے محنت سے جی چُراتے ہیں۔ یہاں کی گرمی کی شدّت اور حصُول مایحتاج میں سہولت ہی لوگوں کو کاہل بنا دیتی ہے۔ چونکہ یہاں کے لوگ فطرتًا کاہل ہوتے ہیں اِس لئے اُسکا علاج یہی ہے کہ ہم انہیں عادتًا محنتی بنائیں۔ ہم صنعتی مدارس قائم کریں جنہیں بچّوں کو محنت کرنے کی عادت ڈالی جائے اور ان میں اچّھی چیز بنانے کا شوق پیدا کیا جائے۔

ہمارے ہاں یہ عام شکایت ہے کہ ہمارے کاریگر اچّھا کام نہیں بناتے۔ چنانچہ لاہور کے اخبارات نے ایک دفعہ یہ شکایت کی تھی کہ جو لوہار و بڑھئی اسوقت ریلوے ورکشاپ میں کام کر رہے ہیں وُہ اہل یُوروپ کے ہم پلّہ مال تیار کرتے ہیں۔ مگر بڑی مُصیبت یہ ہے کہ یہی کاریگر جب بازار میں اپنی دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں تو ایسا بُرا مال بنانے لگتے ہیں کہ معمولی دوکاندار بھی ان سے اچّھا بنالیں۔ اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی دوکانوں میں سب درزی اور موچی ہمارے دیسی ہی ہوتے ہیں۔ مگر جیسا اچّھا مال اُن دوکانوں میں تیار ہوتا ہے وُہی کاریگر اپنی دوکان پر ویسا اچّھا مال تیّار نہیں کرتے۔ اِس لئے لوگ عام طور پر شکایت کرتے ہیں کہ دیسیوں میں اچّھی چیز بنانے کا

جب تک کہ ہم ترقی کا تیسرا درجہ طے نہ کرلیں۔ جب تک ہم صنعت وحرفت میں علوم سے کام نہ لیں۔ موجودہ صنائع کو یورپ کے ہم پلّہ نہ کردیں۔ ایسی صنعتیں جو اسوقت تک ہندوستان میں رائج نہیں انہیں رواج نہ دیں اور لوگوں کے لئے رزق کی نئی راہیں نہ کھلیں۔ جب تجارت میں ترقی ہو۔ اور وُہ دولت جو اس وقت ممالکِ غیر کو جارہی ہے وُہ ہمارے کارخانہ داروں کی جیبوں میں جانے لگے۔ اسوقت ہمارے ہاں بھی نئے نئے دولتمند ہونگے اور اسوقت علوم میں ہم ترقی کر سکینگے۔

اب ترقی کا جو درجہ ہمیں طے کرنا ہے وُہ تیسرا درجہ یعنے ترقی صنعت وحرفت وتجارت ہے۔ اور ہماری تمام کوششیں اسی کی طرف متوجّہ ہونی چاہئیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ صنعت وحرفت خاص حصّہ غربا کا ہے۔ اور یہ لوگ جلدی اپنا رنگ نہیں بدلتے۔ متوسطین لاکھ زور ماریں وُہ غربا سے مستغنی نہیں ہوسکتے۔ اور غربا ایسے لاتوں کے بھوت ہیں کہ وُہ باتوں سے نہیں مانتے۔ اِس چھوٹی اُمّت نے ترقی کی راہ میں وُہ روڑا اٹکایا ہے جسکا نکالنا کارے دارد۔ ہماری ترقی کی رفتار رُک گئی ہے اور جب تک یہ منزل طے نہ ہوجائے اسوقت تک اور مدارجِ ترقی کا خیال کرنا ہی بیکار و لاحاصل ہے۔ اِس لئے تمام بہی خواہانِ قوم کی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ وُہ اپنے ہاں کے اہل حرفہ کی حالت درست کریں۔

ہمارے اہل حرفہ کی عادات واخلاق ایسے خراب ہورہے ہیں کہ انہیں دیکھ دیکھ کر جی کڑھتا ہے۔ اور جس وقت اُنکا اجڈپن دیکھا جاتا ہے تو اپنی ترقی سے قطعی مایوسی ہوجاتی ہے۔ سب سے بڑا عیب ہمارے ہاں کے اہلِ صنعت میں یہ ہے کہ ان میں عمدہ چیز بنانے کا شوق نہیں۔ اُجرت میں کمی کردینگے۔ آدھا پیٹ کھانا کھائینگے مگر مال اچھا نہ بنائینگے۔ ہمارے اہل الرّائے تو اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پچھلے زمانہ کی شخصی حکومت میں لوگوں کو محنت کی اُجرت نہیں ملتی تھی۔ بلکہ اُن سے بیگار کے طور پر کام لیا جاتا تھا اسلئے

اور اس کی قیمت گھٹاتے ہیں جہانتک اُس چیز کے بنانے کی غرض فوت نہ ہو۔ لیکن اہل دہلی مال کو اس حد تک ہلکا کرتے ہیں اور قیمت کو اس قدر گھٹا دیتے ہیں کہ اس قیمت پر اس چیز کی صرف نقل اتر سکتی ہے چیز نہیں بن سکتی۔ دیکھئے کہ دہلی کی لال ٹینیں بازار میں ۱۲ بلکہ ۱۰ کو فروخت ہو رہی ہیں۔ مگر ذرا ان میں تیل ڈالو پھر دیکھو کتنی جگہ سے فوارہ چھٹتا ہے۔ اور آندھی جھکڑ میں تو کیا جلینگی وُہ تو یُوں بھی نہیں جلتیں۔ ادھر جلاؤ اُدھر شیشہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ ذرا ہلاؤ اور سب پُرزے گل ہے۔ پھر اسے کوئی لیکر کیا چلے۔ تو گویا اہل دہلی نے مال کی قیمت اور مال دونوں کو اسقدر گھٹایا کہ وُہ اپنی غرض پُوری کرنے کے لائق بھی نہ رہا۔ اس لئے لوگ مجبورًا پھر ولایت کا مال لینے لگے۔

ایک وجہ اچھا مال نہ بنانے کی ہمارے کاریگروں کی بے سرو سامانی ہے۔ کاریگر دن بھر میں جسقدر مال بناتا ہے وُہ چاہتا ہے کہ شام تک بک جائے تاکہ مَیں اپنے بچّوں کے لئے خور و نوش کا سامان کرسکوں۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ سستے مال کو خریدنے والے بھی سستے مل جاتے ہیں۔ اس لئے دوکاندار مجبورًا کم قیمت مال ہی بناتے ہیں۔ اُن بیچاروں میں اس قدر وسعت نہیں کہ دو چار دن مال کو دوکان میں رکھ کر خریدار کا انتظار کرسکیں۔ یہ شکائتیں بھی جب ہی رفع ہونگی۔ جب سوداگر لوگ کاریگروں کو نوکر رکھ کر اپنی زیر نگرانی اُن سے کام کرائیں۔ پھر تقسیم محنت کا اصُول بھی ان میں جاری ہو سکتا ہے۔ کاریگروں کو اپنی اُجرت بھی مل جائیگی اور کام بھی جلد اور اچھا ہونے لگے گا۔

ایک اَور شکائت ہمارے اہل حرفت کی عام طور پر کی جاتی ہے اور وُہ کسیقدر بجا بھی ہے۔ کہ یہ لوگ جس تنخواہ پر انگریزوں کی نوکری کر لیتے ہیں دیسیوں کے ہاں اس تنخواہ پر آنا نہیں چاہتے۔ اور آئے بھی تو جیسا اچھا کام وُہ انگریزوں کے ہاں کرتے ہیں۔ اسقدر جانفشانی سے ہمارے ہاں نہیں کرتے۔ اصلی شکائت یہ ہے کہ انگریزوں کا رُعب جسقدر ہوتا ہے ہمارا نہیں ہوتا۔ یہ تو ہوا ہی چاہے۔ انگریز حاکم وقت ٹھہرا۔ ان کا

شوق نہیں۔ اہل دہلی کی حالت دیکھئے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی وضع کا مال تیار کرنے میں یہ لوگ تمام اہل پنجاب پر فائق ہیں۔ اور تجارت کا ڈھب بھی انہیں خوب آتا ہے۔ مگر ہلکا مال بنانے کا عیب ان میں سب سے بڑھ کر ہے۔ قسم قسم کی لال ٹینیں اور ٹین کے بکس یہی دونوں چیزیں دہلی کی ساخت کی ہماری دوکانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں یورپ کے مال کی نقل پر بنائی گئی ہیں۔ مگر اہل یورپ نے آجتک اپنے مال کو ایسا سستا نہیں کیا جس قدر اہل دہلی نے کر دیا ہے۔ اور اسی طرح یورپ کا مال تا حال ویسا نکما بھی نہیں ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام امور پر غور کرنے سے خواہ مخواہ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ دیسیوں کو اچھی چیز بنانے کا شوق ہی نہیں۔ مگر شوق کیوں نہیں۔ ایک تو اس لئے کہ یہ لوگ محنت سے جی چراتے ہیں۔ اور بغیر محنت کے کوئی اچھی چیز تیار ہو نہیں سکتی۔ اسکا علاج تو یہی ہے کہ بچپن سے انکو محنت کا عادی بنایا جائے۔ دوسری وجہ اس بے رغبتی یا اچھا مال نہ بنانے کی یہ ہے کہ اہل دہلی ذرا یورپ کی تقلید بہت کرنے لگے ہیں۔ اور اسی سے لوٹیا ڈوبی ہے۔

اہل یورپ کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی نئی چیز بنا کر بھیجتے ہیں تو اس کی قیمت زیادہ رکھتے ہیں۔ پھر دن بدن اس کی قیمت گھٹتی جاتی ہے۔ اور مال بھی ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن وہ قیمت اس قدر کم نہیں کرتے کہ مال ایسا نکما بننے لگے کہ اپنے منشا کو بھی پورا نہ کر سکے۔ ولایت کی لال ٹین کو ہی دیکھو۔ ہنکس کے کارخانہ کی لال ٹین پانچ روپیہ آٹھ آنے سے اب تین روپیہ پر آ رہی ہے پہلے کی نسبت ٹین ہلکا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی جوڑ کھل جائے۔ یا آندھی جھکڑ میں کام نہ آئے۔ کیونکہ لال ٹین بنانے کا منشا تو یہی ہے کہ وہ آندھی کے کام کی ہو۔ اگر وہ اس غرض کو پورا نہ کر سکے تو پھر اس کا بنانا کیا اور اسی لئے وہ قیمت کم نہیں کر سکتے۔ اہل یورپ اسی حد تک مال کو ہلکا کرتے

دوسرے اُسے یہ خیال بھی کبھی نہیں آیا کہ جو کام اور جس طرح میں کر رہا ہوں اسکے خلاف بھی کسی طرح ہو سکتا ہے۔ یا لوگ کیا کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جب اُسنے ماں باپ نے کام سکھایا تو اُسکے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ جس طرح ہم کیا کرتے ہیں اسی طرح کئے جانا۔ خبردار اگر کبھی اس لکیر کے اِدھر یا اُدھر ہوا۔ تعلیم کے دنوں میں کبھی اِسے یہ موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وُہ اپنی سمجھ سے بھی کام لیتا۔ اور اس طرح پر اس میں جدت پیدا ہوتی۔ یہ سب تو تعلیم کے نقص ہیں جنہوں نے اُس کی جدت طبع کو مفقود کر دیا۔ دوسرا نقص کہ کاریگر ہمارے حسب فرمائش اسباب تیار نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وُہ بالکل جاہل ہیں۔ اُن میں یہ سمجھ ہی نہیں کہ کسی چیز کا خاکہ یا نمونہ تیار کریں۔ اگر وُہ مٹی یا کسی اَور چیز کا نمونہ تیار کرکے گاہک کو دکھا لیا کریں اور گاہک اس میں کمی بیشی کر دیا کرے تو پھر چیز بالضرور گاہک کے حسب پسند تیار ہو سکے۔ مگر کاریگر تو ہوتے ہیں محض جاہل ان میں خود اس قدر عقل نہیں۔ اور اگر آپ اُن کو سمجھائیں کہ پہلے ایک مٹی کا نمونہ بنا کر دکھاؤ تو وُہ ٹکے سا جواب دینگے اور کہدینگے کہ ہم آپ کی خاطر کمہار کا کام سیکھنے نہ جائینگے غرض یہ موٹے موٹے عیوب ہمارے اہل حرفہ کے ہیں جو اسوقت اُنکی ترقی کے مانع ہیں۔ انکے علاوہ اور بہت سے اخلاقی عیوب بھی ہیں۔ اگر یہ سب عیوب محض اہل حرفہ پر ہی موثر ہوتے تو ممکن تھا کہ ہم اِنسے اغماض کر جاتے مگر مشکل تو یہ ہے کہ یہی عیوب کل قوم کی ترقی میں مانع ہیں۔ جب تک ہم صنعت و حرفت میں ترقی نہ کریں اسوقت تک ہمارا تمول ترقی نہیں کر سکتا۔ اور بغیر تمول کے علوم ترقی نہیں کر سکتے۔

اب اگر ہم ترقی کرنا چاہیں۔ تو متوسطین کو اسطرف رجوع کرنا چاہیے۔ متوسطین ہی اہل حرفہ کیلئے مدارس جاری کریں۔ جہاں اہل حرفہ کو پڑھنا لکھنا بھی سکھایا جائے اور ہنر بھی سکھائے جائیں نہ صرف اہل حرفہ۔ بلکہ متوسطین کے بچے بھی ان مدارس میں جا کر صنعتیں سیکھیں تاکہ بعد میں یہ کارخانہ دار ہو سکیں اور اہل حرفہ سے کام لے سکیں۔ جب تک متوسطین خود اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہونگے اسوقت تک ہم ترقی کے خواب گو دیکھا کریں۔ مگر ترقی کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

(غلام نقشبند)

رعب تو راہ چلتے پر پڑتا ہے تو کاریگر پر بھی پڑا چاہیے۔ لیکن ہمارا رعب بھی کافی ہو سکتا ہے بشرطیکہ کاریگر کچھ مدت تک ہماری ملازمت کرلے۔ اگر اس عرصہ میں ہم اس سے نامناسب بے تکلفی شروع نہ کردیں۔ تو خواہ مخواہ اُس کے دل میں ہماری وقعت بیٹھ جائیگی اور ہمارا رعب بھی ہو جائیگا۔ اور وُہ جانفشانی سے کام کرنے لگا۔

مگر کام اچھا تیار ہونے کے لیے صرف رعب ہی کفایت نہیں کرتا۔ جو کام ہم بنوانا چاہتے ہیں اسکا علم ہمیں خود بھی ہونا چاہیے۔ اگر درزیوں کو نوکر رکھنا ہو تو ضروری ہے کہ ہم خود بہت اچھے درزی ہوں۔ اگر چماروں کو نوکر رکھنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم خود اچھے سے اچھا بوٹ بنانا جانتے ہوں۔ انگریزوں کی دوکانوں کی کامیابی کا یہی راز ہے۔ اگر ہم خود کام سے ناواقف ہوں تو درزی یا کاریگر کے دل میں ہماری وقعت کبھی نہ ہوگی۔ ظاہرا تو وُہ ہماری عزت کریگا۔ مگر جس طرح پڑھا لکھا غریب آدمی اَن پڑھ امیر کو جاہل سمجھتا ہے۔ اس طرح ہمارا کاریگر بھی ہمیں دل میں گاؤدی سمجھیگا اور اگر ہم اسکو کوئی مشورہ دینگے تو وُہ اس میں حجت نکالیگا اور کبھی اسپر کاربند نہیں ہوگا۔ کیونکہ وُہ تو ہماری باتوں کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت ہی نہیں دیتا۔

ایک اور بڑا عیب ہمارے کاریگروں میں یہ بھی ہے کہ وُہ جسقدر چیزیں بنانا جانتے ہیں وُہی بنائینگے۔ اور جس طریقہ سے بنانا اُنہوں نے سیکھا تھا اسی طرح پر بناتے جائینگے آپ لاکھ جتن کریں۔ انہیں بار بار سمجھائیں کہ یہ چیز اس طرح بھی بن سکتی ہے۔ مگر وُہ کبھی آپ کے کہنے کے موافق عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی نہ کریگا۔ اور اگر آپ کوئی چیز کسی خاص وضع کی بنوانا چاہیں۔ جس وضع کی اُس نے پہلے کبھی نہ بنائی ہو تو اوّل تو وُہ سرے سے انکار ہی کر دیگا۔ اور اگر کوئی بنا بھی دے تو کبھی آپکے حسب منشا نہ ہوگی۔ اس کی بھی کئی وجہیں ہیں۔ اوّل تو یہی کہ وُہ آپ کو بزعم خود اپنے علم سے محض نابلد سمجھتا ہے اس لئے آپ اسے لاکھ سمجھائیں۔ وُہ آپ کی بات کو خاطر تلے نہ لائیگا

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے جسکو علم — نہ حکمتِ عملی ہے ۔ نہ حکمتِ نظری

ذلیل سمجھے ہیں ہم حرفت و صناعت کو — ہماری شان کے لائق نہیں ہے پیشہ وری

اگرچہ قوتِ ایجاد سے رہے محروم — نکالتے ہیں نئی روز طرزِ گدیہ گری

بری ہے ننگ تمائت سے ذاتِ اہلِ کمال — مسیح کو نہیں پروائے رنجِ بے پدری

ملی ہے خوبیِ قسمت سے ہمتِ عالی — گداگری میں بھی ہے ہم کو زعمِ تاجوری

ادیب ہم بھی ہیں مرزا کہ آج علمِ ادب
نہیں ہے کچھ مگر افسانہائے دیو و پری

مرزا محمد ہادی

اتری ہوئی مہندی

اک روز تصور تھا مجھے قدرتِ حق کا — تکتا تھا میں ہر چیز کو با دیدۂ بینا

اُس قادرِ مطلق کے کرشمے تھے نظر میں — اُس خالقِ برحق کا تھا سودا مرے سر میں

ذرے میں نمایاں تھا اگر مہرِ درخشاں — قطرے میں سمندر کی طرح آبِ فراواں

اُڑتے ہوئے پتوں سے مجھے ہوتی تھی عبرت — چڑیوں کی صدا تھی روشِ پند و نصیحت

اب معرفتِ حق کی یہاں کسکو کمی تھی — جو چیز نظر میں تھی تصوف سے بھری تھی

گردن کو جھکائے ہوئے تھا سر بگریباں — ہر چیز میں سو رنگ تھے ہر رنگ میں عرفاں

ہر چیز کے ہونے سے نہ ہونا تھا مقدم — بس ایسے خیالات میں تھا فکر مجسم

ناگاہ نظر جا پڑی ۔ اک شکل نئی تھی — دیوار میں اُتری ہوئی مہندی تھی کسیکی

دُنیا کی وہ حسرت بھری تصویر تھی گویا — اک دفترِ عبرت اُسی مہندی میں نہاں تھا

شکایتِ زمانہ

مبارک اہلِ ہنر کو فراغِ نوحہ گری — کہ شمعِ بزمِ طرب ہے فروغِ بے ہنری

اگرچہ داخلِ طبعِ جہاں ہے کون و فساد — مگر زمانہ کی نیت فساد سے نہ بھری

مزاجِ دہر کو یہ ضد ہے چارہ جوئی سے — کہ دستِ سعیِ رفوگر ہے صرفِ جامہ دری

چمن میں اب کے یہ کیسی بہار آئی ہے — نہ کوئی پھول شگفتہ نہ کوئی شاخ ہری

چمن کی سیر مبارک فراغ بالوں کو — ہمیں قفس میں مزا دیگئی شکستہ پری

دعا سے ہاتھ اٹھاتے ہیں اے دلِ مایوس — کہ ناگوارِ طبیعت ہے ننگِ بے اثری

اگرچہ دہر نے کھائے ہزار ہا چکر — سرِ فلک سے نہ نکلی ہنوز خیرہ سری

زمانہ بسکہ نئی چال روز چلتا ہے — نہ بھول جائے کہیں اپنی چال کبکِ دری

ہم اپنے دل کی لگی پر جو روئے بھی تو کیا — بجھا سکے گی نہ یہ آگ آنسوؤں کی تری

نمودِ حشر ہے اے بختِ خفتہ ہو بیدار — غضب خدا کا ابھی تک نہ تیری نیند بھری

جگا کے تھک گئی عبرت بھی خوابِ غفلت سے — مگر نہ چونکے ہم اس پر بھی اُف رے بےخبری

دکھایا جہل نے تحقیق کا اثر الٹا — مقدماتِ بدیہی بھی ہو گئے نظری

محیط ہم پہ ہے یوں تیرگی جہالت کی — کہ ظلمتِ شبِ غم ہے سپیدۂ سحری

بشر [illegible] — جسے اٹھا نہیں سکتی ہے طاقتِ بشری

ہمیں گناہ پہ مجبور کرتی ہے عادت — اگرچہ فطرتِ انساں ہے معصیت سے بری

زمانے بھر سے برے ہو گئے ہمیں اے قوم — برا نہ مان جو کہتا ہو کوئی بات کھری

یہ کیا کہ علم میں ہم اور سب سے ہار گئے — جو ہیں شجاع کبھی ہوتے نہیں وہ ہری

اگرچہ جین میں ضرب المثل نہیں لیکن — حقیقتاً جو نظر کی تو ہم نہیں میں جری

حیرت سے مری سمت کو نرگس نگراں تھی
ہر وقت مرے وصف میں سوسن کی زباں تھی

اک پاؤں پہ ہر دم تھا کھڑا سامنے شمشاد
اک بندۂ ناچیز بنا سرو سا آزاد

سنبل سے چمن میں کبھی رہتی تھی میں ہمدوش
گہ شاخِ گل و لالہ سے ہوتی تھی ہم آغوش

مرتا تھا بلائیں مری لیتا تھا بنفشہ
قدموں میں مرے ہائے بچھا جاتا تھا سبزہ

پتوں پہ مرے قطرے جو شبنم کے پڑے تھے
ٹکڑوں پہ زمرد کے وُہ الماس جڑے تھے

سبزہ ہے حسینوں کے لئے کاہشِ جوبن
ہیں وجہ ترقی دلِ آویزیٔ گلشن

جاڑے ہیں مرے واسطے سُورج کی شعاعیں
برسات میں چھائی ہوئی گھنگھور گھٹائیں

وُہ چاندنی میں آبِ مصفّا کی روانی
بکھری ہُوئی رنگت وُہ مری اُٹھتی جوانی

ہلکا سا وُہ ابر اور وُہ برسات کا موسم
بکھرے ہُوئے تاروں کا سماں رات کا عالم

بجلی کی کڑک اور وُہ بادل کا گرجنا
وُہ ابر سے چھپ چھپ کے مہِ نو کا چمکنا

وُہ رات کے سناٹے میں جھونکوں سے ہوا کے
اُٹھتی تھی جو سر سجدۂ خالق میں جُھکا کے

نیچر نے عجب رنگ دیا تھا مجھے لوگو
دیکھا جسے آنکھوں نے نہ کانوں نے سُنا ہو

دل لیتی تھی اس طرح کہ باہر ہے بیاں سے
پھر جا کے نظر پھر نہیں سکتی تھی وہاں سے

ناگاہ نظر لگ گئی مجھ کو مری قسمت
اس چرخ نے اک بار بدل دی مری صُورت

مالی کے خدا جانے یہ کیا دل میں سمائی
جلّاد کی صُورت میں مجھے شکل دکھائی

اُلفت کی رہ و رسم وُہ سب دل سے بھلا دی
بیگانگیٔ خلق کی تصویر دکھا دی

رکھ ٹھیکری آنکھوں پہ وُہ یوں پھر گیا مجھ سے
گویا کہ کبھی کا وُہ شناسا بھی نہیں ہے

ایسی تو کوئی مجھ سے خطا بھی نہ ہوئی تھی
ہر طرح میں بے جرم تھی ہر طرح بری تھی

بے جرم و خطا مجھ پہ عجب ظلم ہوا ہے
کوئی نہ سہی دیکھنے والا تو خدا ہے

پتوں کو مرے سُونت لیا شاخوں سے آکر
یہ ایک نیا ظلم تھا اس جان کے اوپر

بربادی کی اُس نے جو بیاں کی ہو کہانی
سُن لے اُسے اے کاش کوئی میری زبانی

کہتی تھی کہ کس چاؤ سے لایا مجھے مالی
اِک چھوٹی سی ٹہنی مری گلشن میں لگا لی

وہ ناز اُٹھائے کہ بیاں مجھ سے وہ کیا ہوں
اولاد پہ جس طرح کہ ماں باپ فدا ہوں

محتاط تھا اسدرجہ مری نشو و نما میں
رہنے نہیں دیتا تھا کبھی گرم ہوا میں

لُو چلتی تھی جب تو اُسے رہتا تھا یہ کھٹکا
اُٹھتی ہوئی کونپل کہیں پھر مُر نہ ہو مولا

سردی میں کہیں برف اثر مجھ پہ نہ کر جائے
ایسا نہ ہو جاڑے میں کوئی شاخ ٹھٹھر جائے

برسات میں گل جائے نہ پودا کہیں میرا
پانی کبھی کیاری میں نہ رہتا تھا زیادہ

امساک جو بارش کا کبھی ہو گیا ناگاہ
کیا کیا اُسے تکلیف ہُوا کرتی تھی واللہ

پانی مجھے خود کھینچ کے دیتا تھا وہ دانا
منظور تھا ہر طرح اُسے میرا بڑھانا

بس اُس کی دُعا تھی یہی ہر لحظہ و ہر دم
سوکھا نہ نکل جائے کسی رنگ کا موسم

گھٹ جائے کہیں پانی کنوئیں کا بھی یا رب
محنت کہیں ضائع مری ہو جائے نہ یوں سب

ہر لحظہ غرض فکر یہی رہتی تھی اُس کو
پانی کے نہ ہونے سے مجھے کچھ نہ ضرر ہو

کُملایا ہوا آتا نظر گر کوئی پتا
بس غنچۂ دل اُس کا بھی پژمردہ تھا گویا

سینچی ہے کیاری کبھی شاخوں کو سنبھالا
القصّہ شب و روز اُسے کام یہی تھا

تھا دھیان اگر اُسکو تو بس دھیان تھا میرا
عاشق تھا وہ میرا کہ نگہبان تھا میرا

جوئندہ ہر چیز ہے پایندہ جہاں میں
ہاتھ آتے ہیں ڈھونڈے سے گہر آبِ رواں میں

ضائع کہیں ہوتی ہے مشقت بھی کسی کی
آخر اُسے بھی مل گیا محنت کا پھل اُس کی

بڑھتی چلی اکبار ہی گلشن میں وہ ڈالی
اِک تھوڑے ہی عرصے میں عجب شکل نکالی

پھیلی وہ یہانتک کہ ہر اِک قطعے کو گھیرا
بس میں ہی نظر آتی تھی جس سمت کو دیکھا

صُورت کو مری دیکھ جلی جاتی تھی نیلم
جوبن پہ برستا تھا کہ تھی حُسن مجسم

تھا جزر و مد ویسا کہ طلاطم ہوا برپا — بے چین ہے دل کانپتا ہے میرا کلیجا

تاباں ہے اسی بات پہ بس خاتمہ سن لو
اللہ بنا کر تو بگاڑے نہ کسیکو

احمد خان تاباں تلمیذ حضرت آغا شاعر دہلوی

حسن و عشق

عشق نے تنگ آکے آخر حسن سے اک دن کہا — دیکھ اے پیارے! نہیں اچھے ترے جور و جفا
گرم ہفت اقلیم میں بازار تیرا مجھ سے ہے — تیری عزت مجھ سے تیرا بول بالا مجھ سے ہے
میں نہ ہوں تو میری جاں تیری حقیقت کچھ نہیں — جب کوئی گاہک نہ ہو موتی کی قیمت کچھ نہیں
اس پہ میرے ساتھ تیری کج ادائی ہے غضب — یہ تغافل ہے ستم۔ بے اعتنائی ہے غضب
چھوڑ اس ٹیڑھی ڈگر کو۔ لے وفا کا راستہ — ورنہ پیارے اپنی ان باتوں کو تو پچھتائیگا

بے وفائی میں اگر تجھ سے کروں تیری صفت
خاک میں مل جائے تیری ساری قدر و منزلت

حسن نے جس وقت یہ تقریر برجستہ سنی — عشق پر ترچھی نظر کی ناز و نخوت سے بھری
بولا "اپنی اصل کی شاید نہیں تجھ کو خبر — صفحہ ہستی پہ تو ہے میرے دم سے جلوہ گر
میں اگر ہوتا نہ اے نادان۔ تو ہوتا کہاں — میں اگر معدوم ہو جاؤں تو تو ہو بے نشاں
آہ و اشک و غم ہوا و آب و دانہ ہے ترا — یہ میرے انعام ہیں ان پر گذارا ہے ترا

دل پہ تیرے بھول احساں فراموشی کا ڈالا پردہ ہے
تو جہاں میں میرا آوردہ نمک پروردہ ہے"

پھر انکو سکھا کر کیا بوروں میں مجھے بند
میری نہ سنی اُس نے میں کہتی رہی ہر چند

صورت سے مری اسکو یہ نفرت ہوئی پیدا
صد حیف کہ جا کر مجھے بازار میں بیچا

اب اک بتِ بے درد کے ہاتھ پڑ گئی پالے
اُس نے بھی بخارات عجب طرح نکالے

پیسا مجھے مٹی میں ملایا مرا جوبن
یہ سب سے زیادہ تھا مری جان کا دشمن

ہاں چین سے دنیا سے اسی نے مجھے کھویا
پہچانی بھی جاتی نہ تھی صورت مری اصلا

مشکیں مری باندھی گئیں ہاتھوں میں لگایا
اس پر بھی مجھے اس نے نئے رنگ سے پایا

وہ ہاتھ جو برباد کنِ نام و نشاں تھے
صدقے میں فقط میرے سرور دل و جاں تھے

اس حسنِ خداداد پہ وہ رنگ تھا میرا
جو لطف دکھاتا ہے سونے پہ سہاگا

وہ پیارے سے کفِ دست بنے رشکِ گلِ تر
وہ انگلیاں تھیں خون میں ڈوبے ہوئے نشتر

وہ ہاتھ کہاں اور کہاں لعل بدخشاں
پتھر سے جواہر میں ہے تفریق نمایاں

اس رنگ پہ کافر نے یہ کی قدر ہماری
دیوار پہ پھینکی گئی اُتری ہوئی مہندی

یہ اپنی ہوا جان چھڑکنے کا نتیجہ
ہاتھوں پہ بھی ظالم نے نہ چاہا مرا رہنا

چھوپا مجھے دیوار میں در گور کیا ہے
بے مہریوں نے دیکھئے کیا زور کیا ہے

امید رکھے کیا کوئی دنیا میں کسی سے
سچ تو یہ ہے نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے

اکدن وہ تھا مستغنی تھی میں دونو جہاں سے
اکدن یہ ہے اک ایک کا منہ تکتی ہوں ہر جا

وہ رنگ ہے اب ہائے نہ وہ شکل نہ صورت
اک آن میں کیا سے مری کیا ہو گئی حالت

اکدن وہ تھا میں بادۂ نخوت سے تھی سرشار
اور آج ہوں بیچارگی سے نقش بدیوار

اب موسمِ گل ہو بھی چمن میں تو کہاں ہو
برباد ہوئے آپ تو ہر سمت خزاں ہے

تھی سیج میں جو ڈوبی ہوئی مہندی کی یہ گفتار
در آئی رگِ جاں میں بشکلِ لبِ سوفار

جس تیزی و سرعت سے ہوا اُس میں تغیر
سوچے کوئی اس کو تو ہو تصویرِ تحیر

ہم سے پوچھا جو کسی نے تو یہی کہہ دینگے — یار لوگوں نے ہے کوٹھے پہ بٹھایا کالج*

کوئی سامان میسر نہیں جس کالج کو

دور سے اپنی تو ڈنڈوت ہے اُس کالج کو

محنت

اے مردِ جری! خنجر و صمصام ہے محنت — اَے عیش طلب! راحت و آرام ہے محنت

اے یار کے طالب! صنم و یار ہے محنت — اے عاشق دل گم شدہ! دلدار ہے محنت

اے اہلِ خدا! مقصدِ اسلام ہے محنت — اے مے کشو! ساقی و مے و جام ہے محنت

اے اہلِ ہوس! سیم و زر و مال ہے محنت — اے شاہِ جہاں! شوکت و اقبال ہے محنت

اے طالبِ تحصیلِ ہنر! کام ہے محنت — اے نام کے خواہاں! سببِ نام ہے محنت

درزی کو سوئی اہلِ شجاعت کو ہے تیغا — ہے کاریگروں کے لئے ہر وقت یہ اوزار

بیمار کے حق میں یہ مسیحا سے سوا ہے — اعجاز میں یہ عیسیٰ اعجاز نما ہے

کوئی بھی اُس انسان کو انساں نہ کہیگا — جسکو نہیں محنت کی کبھی نام کو پروا

سب بیش بہا چیزوں کی قیمت ہے یہ محنت — آغاز مصیبت ہے تو انجام ہے راحت

جو کام کیا کرتا ہے کم کرتا ہے عصیاں — بہکا نہیں سکتا کبھی ہرگز اُسے شیطاں

جس وقت چھنی سلطنتِ شاہ ہمایوں — اور چھن گیا عزّ و شرف و جاہِ ہمایوں

جب ہارا لڑائی پہ لڑائی میں وہ پیہم — منہہ موڑ لیا بھائیوں نے شاہ سے جس دم

* کالج کی جماعت بالاخانہ کے کمروں میں بیٹھتی ہیں اسکی طرف اشارہ ہے۔ محاورہ سے جو مزید لطافت پیدا ہو گئی ہے وہ ظاہر ہے۔

عقل نے نیرنگ یہ تُرکی بہ تُرکی جب سُنی | یہ کہا۔ اور ہم سے سچ پوچھو تو دل لگتی کہی
عشق کا ممکن ہے کیونکر حُسن سے ہونا جُدا | عکس ہے آئینۂ ہستی میں یہ تو حُسن کا
حُسن اِک سُورج ہے اور ہے عشق اس سُورج کا نُور | کس طرح ممکن ہے ہونا نُور کا سُورج سے دُور

عالم ہستی میں دونو لازم و ملزوم ہیں
ہیں تو دونو ہیں نہیں تو دونو معدوم ہیں

(نیرنگ)

اِسلامیہ کالج

لاہور کے اسلامیہ کالج کے سالانہ جلسے میں جو نظمیں پڑھی گئیں۔ اُن میں مرزا ارشد گورگانی کی ایک نظم بلحاظ سلاست زبان اور سادگی کے لاجواب تھی۔ اُسکا ایک بند جس میں اُنھوں نے کالج کے سازو سامان بڑھانے کی ترغیب ایک عجیب پیرایہ میں دی ہے۔ ہم نقل کرتے ہیں:۔

یہ جو اِسلامیہ ہے تم نے بنایا کالج | دل سے ہر ساکن پنجاب کو بھایا کالج
ہم کو اِک بات میں کچھ شک ہے کہ ہم شکی ہیں | سچ کہو ہے یہ تمہارا کہ پرایا کالج
بات اِک پُوچھتے ہیں تم سے دھرم سے کہدو | کیا سڑک پر سے پڑا آپ نے پایا کالج
جاتے ہو دیکھنے ہر سال جو تم کانفرنس | بھائیو! کیا یہ علیگڈھ سے اُڑایا کالج
اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اِسے۔ کھاؤ قسم | یا کہیں اَور سے مانگے کا منگایا۔ کالج
کسی نویستان مُسلمان کے جہلم میں مِلا | یا کسی بیاہ کے حصّے میں ہے آیا کالج
دھوکے بازی کے تمہاری ہُوئے ہم بھی قائل | کہ بنایا تو مکاں اور بتایا کالج
ہم بہت دن سے سُنا کرتے تھے شہرت اِسکی | دِل میں کہتے تھے کہ کیا ہوگا خدایا کالج
آج دیکھا تو یہ کالج بھی مُسلماں نکلا | جب بُرے حالوں میں ہم کو نظر آیا کالج

[illegible] دھب ہی بجر نے — کہ اُس شوخ کی چشم تر ہوگئی

(مجروح)

عشق نے حُسن کا پھیلایا یہ جال اچھا ہے — دل پھنسا لینے میں ظالم کو کمال اچھا ہے

ناز و انداز و ادا حُسن کے سب چیلے ہیں — اُس کی ہر آن بھلی جس کا جمال اچھا ہے

راحتِ یاس تو ملتی ہے اگر وصل نہیں — عشق کو کہئے بُرا کیوں جو مآل اچھا ہے

نہ جدائی - نہ تغافل نہ خفا ہو جانا — یار تجھ سے تو مجھے تیرا خیال اچھا ہے

دردِ پنہاں انہیں کس طرح دکھاوے اعجاز — مُنہ سے کہتے یہی بنتی ہے کہ حال اچھا ہے

(مولوی شاہ دین - بی - اے بیرسٹر ایٹ لا) — (مرزا اعجاز حسین بی - اے - وکیل)

آگے بھی مدتوں سے نہ تھی قدر و منزلت — پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

قسمت کی بات ہے کوئی قسمت کو کیا کرے — پھولوں کی مار مار یہ دامن رہا تہی

عمر اپنی ہو چکی ہے کوئی دم کی دیر ہے — یہ شمع تھوڑی تھوڑی ہی - پر بہت ہی

(مولوی الف دین - وکیل) — (مولانا فیض الحسن مرحوم)

وصل کی صُورت نہ نکلی آج تک میرے لئے — ایک بھی گردش نہ کی تو نے فلک میرے لئے

سامنے رکھ کر دلِ نالاں کو فرماتے ہیں وہ — ہاں ذرا او بلبلِ دل پھر چہک میرے لئے

ہاتھ جاتا ہے گریباں پر دمیں بے اختیار — ذرہ ذرہ وحشت ہے غنچے کی چٹک میرے لئے

چین دم بھر بھی نہیں آتا کسی کل کیا کروں — درد نے اچھی نکالی ہے چمک میرے لئے

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

محنت نے دلائی اُسے اُمّید دوبارا — محنت نے ہی چمکا دیا قسمت کا ستارا

اشخاص جو ہیں آج کے دن شہرۂ عالم — مزدور سے محنت نہیں کرتے تھے ذرا کم

محنت سے ہوا شاعروں کا نام جہاں میں — محنت سے ہوا جو کہ ہوا کام جہاں میں

سیّد امیر حیدر بخت (آگرہ)

کچکول

اثر یاس

ہے مجالِ سخن نہ تابِ سوال ۔ — سارے اعضا ہیں کام سے معزول

حال ۔ اِک دفترِ پریشانی ۔ — کام دیکھو تو سارے اول جلول

سعی بھی ہے تو محض ناقص ہے ۔ — فکر بھی ہے تو فکرِ نامعقول

کیا کہوں حال اور کیا پوچھوں ۔ — اس سے حاصل نہ اُس سے کچھ محصول

بے اثر ہوں جہاں میں یوں جیسے ۔ — ظالموں کی دُعائے نامقبول

(آزاد عظیم آبادی)

یہاں تو اور کسی چیز سے نہیں مطلب — ہمارا جام تو مقصد ہے مدّعا ساقی

نہیں ہوئے ہیں حریفانِ بادہ کش بدمست — تو اپنی مست نگاہیں اِنہیں دکھا ساقی

سوالِ بادہ کریں کیا کہ دیکھ کر تجھ کو — ہمارے ہوش ہی رہتے نہیں بجا ساقی

ضروریاں کسی مے کش کی رُوح ہے موجود — جو خود بخود ترا ساغر چھلک گیا ساقی

ہمارے دِل کو ہے اُس بزم مختصر کی طلب — کہ جس میں مطربِ رنگیں نوا ہو یا ساقی

(میر مہدی مجروح ۔ دہلوی)

[illegible]

جھلک [illegible] ہے عجب آب و تاب سے جوبن | [illegible] گل
وہ خندہ لب جو کبھی آگیا تو دیکھیں گے | چمن میں [illegible] ہوائے خندہ گل
خزاں کو آنے دے مت بھول موسم گل پر | رلائیگی تجھے بلبل ہوائے خندہ گل
[illegible] وہ ہنس کے خلق سے مل | یہ کہتی ہے تجھے غافل ادائے خندہ گل
[illegible] قہقہہ [illegible] کام اشک شبنم کا؟ | کوئی تو درد نہاں ہے قفائے خندہ گل
فنا [illegible] سے ہوں کان تو سنے تو بھی | صدائے نغمۂ رنگیں نوائے خندہ گل

(نیرنگ)

دل کی بستی عجیب بستی ہے | لوٹنے والے کو ترستی ہے
ہو قناعت جو زندگی کا اصول | تنگدستی فراخ دستی ہے
جنس دل ہے جہاں میں کمیاب | پھر بھی یہ شے غضب کی سستی ہے
تاب اظہار عشق نے لے لی | گفتگو کو زباں ترستی ہے
ذکر جام طہور وعظ کی وعظ | مے پرستی کی مے پرستی ہے
شعر بھی اک شراب ہے ای دل | ہوشیاری اسی کی مستی ہے
ہم فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوئے | نیستی اک طرح کی ہستی ہے
آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا؟ | ابر کی طرح سے برستی ہے
دیکھئے کیا سلوک ہو اقبال | جرم جرم بت پرستی ہے

(اقبال)